مجلۂ عثمانیہ

طلبۂ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیرین

نبی الحسن شمیم بی۔اے ، غلام دستگیر رشید بی۔اے

صرف ٹائٹل مطبع عہد آفریں میں چھپا

مجلس انتظامی

سال تعلیمی سنہ ۱۳۴۱ف

صدر

مولوی محمد عبد الرحمن خان صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ

نگرانکار حصہ اردو	نگرانکار حصہ انگریزی
مولوی عبد الحق صاحب پروفیسر اردو	مسٹر ای۔ ای اسپیٹ پروفیسر انگریزی

خازن اعزازی

مولوی حمید الرحمن صاحب پروفیسر طبیعیات

منتظم اعزازی و معتمد

محمد اسرار حسن ہاشمی صاحب

اراکین

محمد اسرار حسن ہاشمی صاحب نائب صدر انجمن اتحاد

غلام [illegible] صاحب رشید مدیر حصہ اردو — مہدی علی صدیقی صاحب مدیر حصہ انگریزی

مجلہ عثمانیہ

جلد چہارم شمارہ دوم و سوم بابتہ سنہ ۱۳۴۰ ف

مجلس نگرانی

ملنے کا پتہ

اسرار حسین ہاشمی منتظم اعزازی مجلہ عثمانیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اطلاع

۱۔ طلبۂ کلیۂ جامعہ عثمانیہ کا یہ سہ ماہی علمی رسالہ حسب ذیل مہینوں کے آخری ہفتوں میں شائع ہوا کریگا۔

امرداد (جون) آبان (ستمبر) اردی بہشت (مارچ)

سال تعلیمی اور مجلہ کا سال ایک ہوگا۔

۲۔ رسالہ انگریزی اور اردو دو حصوں پر مشتمل ہوگا۔ حصہ اردو کے لئے تقریباً ۸ جزو اور حصہ انگریزی کے لئے تقریباً ۴ جز مختص کئے جائیں گے۔ رسالہ کا سالانہ حجم کم از کم (۸۰۰) **صفحات** ہوگا۔

۳۔ مجلس نگرانی اشاعت کے متعلق رد و بدل کی مجاز ہوگی۔

مضامین کا انتخاب مجلس ادارت کریگی۔

۴۔ تمام مضامین نظم و نثر مدیر کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔

خریداری اور دیگر امور کے لئے اعزازی خازن مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں۔

۵۔ چندہ کی تمام رقمیں اعزازی خازن مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں۔

چندہ

۱۔ سرکار آصفیہ و برطانیہ سے	عہ ۵ سالانہ پیشگی	۵۔ طلبۂ کلیۂ جامعہ عثمانیہ سے	للعہ سالانہ پیشگی
۲۔ ارباب جامعہ، اصحاب اقتدار اور اداروں سے	۴ عہ ،،	۶۔ ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ ،،
۳۔ عام خریداروں سے	لے ،،	۷۔ بلاد یورپ کے طلباء قدیم سے	۱۰ ،، ،،
۴۔ طلباء قدیم، رہنمائی فارغ التحصیل اور مطالعہ خانوں سے	صہ ،،	۸۔ فی رسالہ	۱۲

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہوں گے، بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی۔

(۱) بذریعۂ رجسٹری (۱۲) کلدار - ۲ ا سکہ عثمانیہ (۲) بذریعۂ سرٹیفیکیٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کی وی پی کے اخراجات ۴ ا کلدار ۶ سکہ عثمانیہ (۳) بذریعۂ بک پوسٹ ۹ کلدار ۱۰ حالی

مجلہ عثمانیہ

فہرست مضامین شمارہ دوم و سوم جلد چہارم

نوٹ: (اس مضمون میں لفظ اشعاعی جا بجا اشاعی لکھا گیا ہے۔ براہ کرم ناظرین تصحیح فرمالیں)

شذرات

بعض ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے ہم مجلے کے دو نمبر اکھٹے پیش کر رہے ہیں اگرچہ ایک سہ ماہی رسالے کے لئے یہ امر غیر مستحسن ہے کہ دو نمبر اکٹھے شائع کرے لیکن ادارات کے انتظام میں تغیر و تبدل کی وجہ سے بعض اوقات مجبوری پیش آجاتی ہے۔

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ گزشتہ نمبر میں کتابت کی غلطیاں کثرت سے رہ گئیں۔ چھٹیوں میں وطن چلے جانے کے باعث میں نے پروف کی تصحیح منتظم صاحب مطبع کے سپرد کر دی تھی۔ اس کے علاوہ اشاعت میں بھی جلدی منظور تھی۔ نتیجہ آپ نے دیکھ لیا۔

اس نمبر میں بھی جیسا کہ چاہیے اہتمام نہ ہو سکا۔ امتحان پیش نظر ہے۔ فرصت کم ہے۔ میں تنہا ہوں امید کہ مختلف نقائص و کمزوریاں نظر انداز کر دی جائینگی۔

اس نمبر کا حجم بھی کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض موعودہ مضامین وقت پر وصول نہ ہو سکے انشاء اللہ

آئندہ اشاعت میں اس کی کمی کی تلافی کر دی جائے گی۔

میرے محترم شریک کار جناب مولوی نبی الحسن صاحب شمیم بی۔ اے تحصیلدار ہو گئے ہیں ہم ان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے وہ ایک حاکم عادل ہوں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مجلہ انکی قابل قدر اعانت سے محروم ہو چکا ہے۔ میں چھٹیوں کے بعد ایک طویل عرصہ تک واپس نہ آسکا لیکن شمیم صاحب نے تنہا سب کام کیا۔ اس اشاعت کے قریب قریب سارے مضامین انہیں کے فراہم کردہ ہیں امید ہے کہ شمیم صاحب کا علمی ربط "مجلہ" کے ساتھ آئندہ بھی حسب سابق باقی رہیگا۔

ہندوستان میں عظیم الشان انقلاب ہو رہا ہے۔ رہنمایان وطن وفاقی ہند کی تعمیر میں مصروف ہیں اس کی تکمیل پر مختلف شعبہ ہائے حیات میں حیرت انگیز انقلاب کی توقع ہے۔ تعمیری نقطۂ نظر سے تعلیمی انقلاب سب سے زیادہ اہم ہوگا، کیونکہ جیسی تعلیم ہوگی ویسی تعمیر"! ایک آزاد وفاقی ہندوستان کے تعلیمی انقلاب میں "ذریعہ تعلیم" کا مسئلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے ابھی سے اس مسئلہ پر مختلف خیالات کا اظہار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس سال بمبئی یونیورسٹی کی چار دیواری اور ناگپور یونیورسٹی کی فضا میں "جامعہ عثمانیہ کے علمی رہنمائی کی جھلک نظر آتی ہے

میں اس علم وفن کے اپنی زبان میں چل رہی ... آئی زبان گویا ایک بے زبان دہن میں

خدا کا بیحد احسان ہے کہ اس تعلیمی انقلاب کی اولیت کا سہرا ہماری جامعہ کے سر ہے۔ دوسرے ماہران تعلیم بھی اس کی اہمیت، ضرورت اور اس کے عملی امکان کو محسوس کرنے لگے ہیں!

ہندوستان اور مشرق خود دار اور بیدار ہو رہے ہیں وہ "قومی انا" کو فنا نہیں کر سکتے۔

گاندھی جی نے مسئلہ ذریعہ تعلیم پر" جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے۔" اب افراد قوم کو قومی رہنے کے لئے اس بات کی ضرورت کہ ان کو جملہ تعلیم

(بشمول اعلیٰ تعلیم) مادری زبان میں ملے، بے شبہ یہ ایک بدیہی قضیہ ہے کہ افراد قوم اس وقت تک عوام سے تعلق قائم نہیں کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ اپنی تعلیم اسی زبان کے ذریعے حاصل نہ کریں جسے عوام بھی سمجھتے ہوں۔ اس نقصان کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو قوم کو اس بات سے پہنچ رہا ہے کہ اس کے ہزاروں فرزند کئی کئی سال اس کوشش میں صرف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ایک اجنبی زبان اور اس کے محاورات سے واقفیت حاصل کریں، اور پھر وہ زبان ان کے لئے نہ صرف ان کی خانگی زندگی میں بیکار رہے بلکہ اس کے باعث انہیں اپنی مادری زبان اور اس کے ادبیات کو بھی نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ نوجوانوں پر اجنبی زبان کا بار سب سے زیادہ ہے۔ اس نے قوم کی ذلت آمیز طور سے توانائی کو چوس لیا ہے۔ طلبا کی زندگی کو کم کر دیا ہے۔ انہیں عوام سے الگ کر دیا ہے اور تعلیم کو غیر ضروری طور سے گراں بنا دیا ہے۔ اگر اس عمل پر پھر بھی اصرار ہے تو وہ یاسانی قوم کی روح کو تباہ کر دیگا۔ تعلیم یافتہ ہند جس قدر جلد اپنے آپ کو اس کے سمیت زدہ اثر سے آزاد کر لیگا اسی قدر اس کے لئے اور ملک کے لئے بہتر ہے" اس کے بعد جامعہ عثمانیہ عظمت اور اس کے مسلک کی اہمیت کا اندازہ کیجئے ؎

آتشے افروز از خاشاک خویش
شعلۂ تعمیر کن از خاک خویش

ضرورت ہے کہ نسوانی تعلیم اور تعلیم کے معاشی پہلو کی تکمیل و تعمیر میں جامعہ عثمانیہ ایسا مجتہدانہ مسلک اختیار کرے کہ ہندوستان بھر میں نمونہ کا کام دے اور ہر محل کے اقتضا کی بخوبی تکمیل ہو تاکہ ہماری تعلیمی حکمت اور اقتضاء فطرت ہم آہنگ ہوں۔ نظام تعلیم کے یہ دو پہلو ہمارے قومی عروج اور علمی ترقی میں بے انتہا اہمیت رکھتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اساتذۂ کرام اور برادران کلیہ ان طویل چھٹیوں میں مجلہ کی علمی اعانت کی طرف کافی توجہ فرمائیں گے۔ وباللہ التوفیق۔

فی الموت حیات

از حضرت امجد حیدرآبادی

پھیر لی جب عالم شک سے نگاہ
سامنے تھا جلوۂ بے اشتباہ

بجھ گئی جب مشعل نور نظر
ہو گیا پیش نظر رشک قمر

جب سماعت سمع سے قاصر ہوئی
اُس کی آواز خفی ظاہر ہوئی

جب شمیم شامہ رخصت ہوئی
بوئے وصل دوست سے راحت ہوئی

اُس کو پایا آپ جب میں کھو گیا
بات کی اس نے، میں جب چپ ہو گیا

جان دیکر، اُس کا دم بھرتا ہوں میں
ہو کے بے حس اس کو مس کرتا ہوں میں

فصل کا باعث ہی، وصل جان و تن
وصل کا باعث ہے فصل جان و تن

پہلے تھا خاک، اب ہوا ہوں واہ وا
غیر محدود اب ہوا ہوں واہ وا

راحت جان ہے دل بیتاب میں
بخت خفتہ میرا جاگا خواب میں

پائی قدموں میں جگہ جب سر دیا
اس اجل نے مجھکو اعلیٰ کر دیا

وہ نہ آنے والا مجھ سے آملا
جزو آخر اپنے کل سے جا ملا

ہندوستان کی انگریزی اور فرانسیسی ابتدائی کشمکش میں خاندانِ لوہری کا حصہ

تاریخ کے اوراق ساتویں صدی ہجری کے اس خون فشاں واقعہ کو کبھی نہیں بھلا سکتے جسکے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

خونِ فرزندانِ عم مصطفےٰ شد ریختہ
هم بران خاکے کہ سلطانان نہادندے جبین

اس کو بھلایا جا سکتا ہے کہ بالآخر خود ان خون بہانے والوں نے نبی عربی کے دین اسلام میں داخل ہونے کو اپنی نجات کا ذریعہ قرار دیا لیکن دجلہ کی موجوں میں اسلامی علمی میراث کو جس بے دردی سے بہا دیا گیا اس کو دنیائے اسلام کیونکر فراموش کرے کہ جو حقیقت میں اسلامی دنیا کے ہر قسم کے زوال کا اصلی سبب ہے۔ اس تاتاری علمی غارت گری نے اس علمی جمود اور ذہنی انحطاط کی رو اور تیز کر دی کہ جو زوال بغداد سے پیشتر ہی شروع ہوئی تھی۔

بہر حال اس واقعہ کے دو صدی بعد نویں صدی ہجری میں یہ نظر آتا ہے کہ اسلامی علمی حلقوں

میں ہر جگہ سنسانی ہے۔ ذہانت اور جودت کے اصلی جوہر سب ختم ہو چکے ہیں۔ علم صرف لفظی الجھنوں کا نام رہ گیا ہے۔ کتب قدما کی شرح و تفسیر پر کام کا مدار ہے۔ الجزری۔ حافظ ذہبی۔ ابن حجر عسقلانی السیوطی۔ الشعرانی وغیرہ سب اس دور کے آفتاب و ماہتاب ہیں لیکن یہ سب شرح و تفسیر و اقتباس کے محور پر گھومتے ہیں۔

اس سنسانی کے عالم میں دنیا کے ایک دوسرے گوشہ میں توہم اور تاریک خیالی کے بادل چھٹتے جاتے ہیں اور علم کے کرنیں اپنا نور پھیلانے لگتی ہیں۔ ابن رشد کے "کتابی شاگرد" کلبس کو صبر و استقلال کے انعام میں نئی دنیا ملتی ہے۔ پھر کچھ اور عرصہ کے بعد کالی کٹ میں واسکوڈی گاما کے جہاز نے اپنے لنگر کیا ڈالے سیاسیات عالم میں ایک بالکل نئے باب آغاز ہو گیا۔ یہ تمہید ہے شرق و مغرب کی جدید آویزش کی۔ علم مشرق سے رخصت ہو رہا تھا اور مغرب میں اس کی تلاش تھی۔ مشرق میں شیرازۂ سیاست بکھر چکا تھا لیکن مغرب کتاب سیاست کے اوراق پریشان کی شیرازہ بندی کرنے لگا تھا۔

قصہ مختصر جس وقت پرتگالی قوم نے ارض ھند پر قدم رکھا اسی وقت سے ہی مغربی سیاست کے تفوق کا آفتاب طلوع ہو گیا۔ اس وقت دنیائے اسلام میں سیاسی افراتفری حد سے گزر چکی تھی۔ ہندوستان کو لیجئے خاص دکن میں بہمنی عظمت و مرتبت کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ پرتگالیوں کی آمد سے پیشتر ہی محمود گاوان کو جام شہادت پلایا جا چکا تھا۔ بہمنی سلطنت کے پانچ ٹکڑے ہو جانے کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ شمالی ہندوستان میں لودھی سلطنت کے آثار زوال شروع ہو چکے تھے۔ ہند و دکن میں اتحاد و تعاون کا رشتہ مفقود تھا۔ ہندوستان سے باہر آل چنگیز و ہلاکو بھی آپ باہمی منازعت میں گرفتار تھی۔ اندلس سے مسلمان نکالے جا رہے تھے۔ مغربی جہازوں کے ہندوستان آنے کے راستہ میں اب مصر بھی کمزور ہو کر اس قابل نہیں رہا تھا کہ ان کو روکے کوئی شبہ نہیں کہ اسی زمانہ میں ترکان آل عثمان نے کلیسا سنیٹ صوفیا پر اذاں دی تھی اور

پرتگالیوں کی آمد ہند کے ۲۸ سال بعد جلیل الشان مغلیہ شہنشاہیت نے بھی اپنا آوازہ بلند کیا لیکن خدا کی قدرت کہ آگے چلکر یہی دونوں مغرب کی اس جد وجہد تفوق کے آماج گاہ بن گئے۔

دنیاے اسلام میں حقیقتِ علم کو جس طرح بھلایا جارہا تھا اور اعلیٰ علمی حلقوں کی افسردگی کی وجہ ایثار اور بے غرضی کو جس طرح گھن لگ گیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دوصدیوں کی مغربی کشمکش کے بعد وائنا کی دیواروں کے نیچے ترکان آل عثمان نے اپنی ہار مان لی۔ اور ادھر ہندوستان میں دوصدیوں سے بھی کم میں خلد مکان عالمگیرؒ کی آنکھیں بند ہوتے ہی مغلیہ سطوت وجبروت کی بنیادیں بھی ہل گئیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ "زمانہ کی ہوا فرنگستان کے جہازوں کے موافق تھی" ان جہازوں نے ہندوستان کے سواحل پر تجارت کے ساتھ فرنگستانی حکومت بھی قائم کردی۔ ایشیائی اور فرنگستانی خصائص کا اس زمانہ میں جو فرق تھا اس کو تحفۃ المجاہدین میں شیخ زین الدین ملیباری نے اس طرح بیان کیا ہے:-

"مسلمان بادشاہ باہم نااتفاقی کی بلا میں مبتلا تھے اور ایک دوسرے سے بدگمان۔ بادشاہ کو اپنی ذات کے خلاف سازش کا خوف ہر وقت گھیرے رہتا۔ اس کے برخلاف اہلِ پرتگال چالباز اور چالاک ہیں۔ اپنے معاملات کی مصلحتوں سے پورے پورے واقف۔ وقتِ ضرورت اپنے دشمنوں سے عاجزی کرنے لگتے ہیں اور جب ضرورت نکل جاتی ہے تو پھر ہر ممکن طریقہ سے ان پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ سب کے سب نہایت متفق۔ اپنے افسروں کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ باوجودیکہ وہ اپنے بادشاہوں سے بہت دور ہیں باہم ان میں بہت کم اختلاف ہوتا ہے اور یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ ان میں سے کسی نے اپنے افسر کو خود حکومت حاصل کرنے کی غرض سے مار ڈالا ہو۔ اس لئے باوجود ان کی قلت کے ملیبار کے راجہ ان کے مطیع

ہو گئے۔[۱]

پرتگالیوں کے بعد اہلِ ہالنڈ پھر فرانسیسوں اور انگریزوں نے بھی سواحل ہندوستان پر تجارتی قسمت آزمائی شروع کردی۔ سورت میں انگریزی تجارتی کوٹھی کھل گئی اور تقریباً ۱۶۳۹ء میں راجہ چندرگیری سے انگریز تجار نے زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر کے شہر مدراس کی بنیاد نہیں بلکہ اپنی حکمرانی کی بنا ڈالی۔

تاریخ ہند میں غالباً پہلی مرتبہ دکن کی سرزمین ہندوستان کے حکمرانوں کی تبدیلی کا تماشا گاہ بنتی ہے۔ شاہ خلد مکان عالمگیر کے پیوند زمین ہوتے ہی نئی قوتوں کو پھر پوری قوت سے ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن حضرت آصف جاہ کی فرزانہ حکمت عملی کی وجہ سے حضرت موصوف کی زندگی تک ان قوتوں کو بار آور ہونے کا موقع میسر نہیں ہوا۔

غرض ۱۱۵۶ھ کا زمانہ ہے کرناٹک میں شورش و فساد کا دور دورہ ہے نواب علی دوست خان صوبہ دار کرناٹک کے فرزند نواب صفدر علی خان جو اب صوبہ دار کرناٹک تھے خود اپنے بہنوئی غلام مرتضیٰ خان جاگیردار ویلور کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ حضرت آصف جاہ دفع فساد کے لئے روانہ ہوتے ہیں اور جب شورش رفع ہوگئی تو بالآخر ۱۱۵۷ھ میں نواب انورالدین خان صوبہ دار کرناٹک مقرر کئے جاتے ہیں انہوں نے ارکاٹ میں اقامت اختیار کی اور اپنے فرزندوں کو مختلف اضلاع کا انتظام سپرد کیا۔

اب یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگریزی اور فرانسیسی رقابت تجارت کے حدود سے گزر چکی تھی ملک گیری کا جذبہ اب ان میں شباب پر تھا۔ دونوں نے کوشش کی کہ نواب انورالدین خان پر ان کا افسون کارگر ہوجائے۔ اس افسون گری میں دونوں نے کرناٹک کی فارسی تاریخوں کے

---

[۱] "عہد سلف" مؤلفہ مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم بتغیر الفاظ ۱۲

بیان کے مطابق جو جو پھونک مارے وہ پڑھنے اور سننے کے قابل ہیں۔

سرسید اپنی ایک تقریر میں بیان کرتے ہیں کہ :-

" وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی ایسا زمانہ تھا جب کہ بے چاری انڈیا بیوہ ہوچکی تھی اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی × × ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قایم کی۔ ہندوستان میں انگلش حکومت قایم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے کوئی نہیں کہ سکتا کہ ان دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا ہے "

اُن پر از حقیقت الفاظ کا اصلی مصداق جس جگہ نظر آتا ہے وہ ساحل کارومنڈل اور خطۂ کرناٹک ہے۔ خاندانِ انوری ہی ہے جس نے سب سے پہلے انگلستانی حکومت کا خیر مقدم کیا اور اس کا ساتھی بن کر اس کو قدم بڑھانے کی جرأت دلائی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس میں ابھی صرف تاجرانہ زندگی بسر کر رہی تھی کہ فرینچ مدبر ڈوپلے نے اس کو مدراس سے بیدخل اور خانماں برباد کر دیا۔ محض کمپنی کی دردبھری التجاؤں پر نواب انورالدین خان شہید نے فرانسیسوں کا مقابلہ کیا اور یکے بعد دیگرے اپنے دو فرزندوں نواب محمد محفوظ خاں بہادر اور نواب محمد علی خاں والاجاہ بہادر کو کمپنی کی تائید کے لئے روانہ کیا۔ نواب انورالدین خان کی شہادت کے بعد فرانسیسوں نے انگریزی کمپنی اور اس کے اثر کا نام و نشان مٹا دینا چاہا اس وقت جو کوشش کلایو نے کمپنی کی حفاظت کے لئے کی اُس کو نواب والاجاہ نے ہی قوت بخشی۔ ارکاٹ کے مشہور حملہ میں کلایو کے دوشس بدوش محمد مدینہ علیخان کمانڈر افواج والاجاہی بھی دادِ جواں مردی اور کمالِ تدبر دیتے رہا تھا۔ جب کونٹ لالی نے دوبارہ مدراس کا محاصرہ کیا تو اس نازک وقت میں خود نواب والاجاہ نے فوج کی کمانڈ کی۔ رسد اور رمال بے دریغ مہیا کئے گئے وندوش کے تاریخی معرکہ میں اور بھی

پانڈی چری کو فتح کر کے فرانسیسی امنگوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے میں بھی نواب والاجاہ نے ہی فوج کی قیادت کی ۔ میجر لارنس اور سر ایر کوٹ والاجاہی احکام ہی کی تعمیل قدم قدم پر کرتے ہوئے بالآخر پانڈی چری کے قلعہ پر علم والاجاہی نصب کر دیتے ہیں ۔ بنگالہ میں بھی کلایو کے ساتھ نواب والاجاہ کی نئی تربیت یافتہ فوج ہی نظر آرہی تھی ۔ ان سارے مقامات پر انگریز اور نواب والاجاہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک رہے ہیں ۔ اس سے قطع نظر سلطنت آصفیہ کے ساتھ مشہور آفاق تاریخی دوستی کی ابتداء کے وقت سفراء برطانیہ کے پشت پناہ نواب والاجاہ ہی تھے ۔ ان تاریخی واقعات ہی کی بنا پر برطانیہ کے کنگ اور کرناٹک کے صوبہ دار میں بالراست تعلق پیدا ہوا جس کی نظیر ہندوستان کے کسی اور حکمران خاندان میں موجود نہیں ہے"[1]

کوئی شبہ نہیں کہ یہ واقعات موجودہ دور کے تاریخ دانوں کے معلومات سے بہت مختلف ہیں لیکن یہ کوئی افسانہ نہیں ہے ۔ تاریخی حقائق ہیں ۔ "حدیث دیگراں" نے اس "سر دلبراں" کو ایک راز سربستہ بنا ڈالا ہے ۔ محرمان راز کے بیانات سے اس راز کو افشا کرنا اس تحریر کا مدعا ہے ۔

چونکہ اس تحریر کا منشا تنقید اور مشرقی و مغربی مورخوں کے بیانات کا باہمی مقابلہ اور موازنہ نہیں ہے ۔ محض فارسی تاریخوں اور فارسی نوشتوں کے مواد سے اس زمانہ کی تاریخ کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنا ہے اس لئے عنوان زیر تحریر کے متعلق مغربی مورخوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تذکرہ بے محل ہے ۔ علاوہ بریں یہ سب بیانات اسکولوں اور کالجوں میں ہم نے سینکڑوں بار پڑھے اور سنے ہیں ۔ اس لئے بھی ان کا اس موقع پر تذکرہ تحصیل حاصل ہے ۔

انگریزی اور خاندان انوری کے ابتدائی تعلقات کے متعلق نواب والاجاہ نے

---

[1] بحذف و اضافہ از مضمون مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم مطبوعہ در شمس الاخبار مدراس مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۰۳ء

اپنی ایک یادداشت میں تحریر کرتے ہیں کہ :-

"زمانیکہ والد این جانب خدمت فوجداری کھمایت ...... وبعضے خدمت بندر سورت داشتند بپاس این معنی کہ حاجی محمد انور جدامجد من از حضور بادشاہ عالمگیر مکرر میر حاج شدہ از بندر رندکو، بہ سواری جہاز روانہ مکہ معظمہ گردیدہ در رابطہ با قوم انگریز بہم رسانیدہ بودند۔ بایں قوم دوستی پیدا کردند۔ ہرگاہ حکومت سرکارات ..... بہ والد بہم رسید در مچھلی بندر فرنگیان انگریز و فرانسیس کہ آن وقت کوٹھی داشتند والد این جانب را بطریق ضیافت طلبیدند و فرانسیس می گفتند کہ خود زیادہ تر نیاز خواہم داد لاکن پذیرانہ کردہ۔ والد من نظر برہمان رابطہ دیرین اول دعوت انگریزان قبول فرمودند نزد انگریزان رفتند و اخلاص این قوم مضمر داشتند"

۱۱۵۷ھ میں جب نواب انور الدین خان کرناٹک آئے تو اس وقت مدراس میں انگریزی اثر اور رسوخ کافی طور سے محسوس ہو رہا تھا انگریزی کمپنی نے اب ضروری خیال کیا کہ نواب انورالدین خان سے راہ و رسم پیدا کرے۔ صاحب "قصر والاجاہی" کا بیان ہے کہ :-

"چون نواب سراج الدولہ بہادر (نواب انورالدین خان) در ۱۱۵۷ھ صوبہ دار ارکاٹ گردید کوس استقلال در چار سوی عالم نواخت .... وسائر جاگیرداران و زمینداران غاشیہ اطاعت بردوش کشیدہ راہ اخلاص پیمودند و تاجران قوم فرنگ از مقیمان سرزمین کرناٹک بہ ارسال سوغات عجائب کائنات اظہار معاونت و موافقت نمودند علی الخصوص نائبان کمپنی یعنی اہل حکومت بندر چیناپٹن و دیونام پٹن سررشتۂ رسوخ و وثوق مستحکم کردہ بوساطت محمد محفوظ خان بہادر ...... دسپت رائے دیوان خاص قصبہ میلاپور وغیرہ مواضع بہ قبض و تصرف خود آوردند"

نواب انور الدین خان کو کرناٹک میں ابھی دم لینا بھی میسر نہ ہوا تھا کہ انگلستان اور فرانس میں مخاصمت شروع ہوگئی۔ ڈوپلے نے اس وقت ہندوستان میں فرانسیسی تفوق کی خاطر سعی و کوشش کے لئے کمر ہمت باندھ لی تھی۔ ۱۱۵۸ھ میں ڈوپلے نے موسیو لبردین کے ساتھ مدراس (چناپٹن) پر حملہ کردیا اور مدراس پر اُس کا قبضہ بھی ہوگیا۔ پھر بعد ازاں دیونام پٹن پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کی گئی۔ انگریزی حکام دربار انوری کی جانب رحم و کرم کے لئے رجوع کرتے ہیں۔

صاحب "توزک والاجاہی" کا بیان ہے کہ نواب انور الدین خان نے اس فرانسیسی حملہ کو معلوم کرکے کہا کہ ممالکِ محروسہ حضور میں اس طرح کی جنگ و جدل کسی طرح جائز نہیں قرار دی جاسکتی۔ فرنگستان میں اگر جنگ ہو رہی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مملکت دکن کو یہ دونوں اقوام میدانِ جدال بنائیں۔ پھر اپنے بڑے فرزند محمد محفوظ خان بہادر کی زیر سرکردگی مدراس (چناپٹن) پر مہم روانہ کی کہ اس کو واپس لیکر انگریزی تجار کے حوالہ کردیا جائے محمد محفوظ خان بہادر میدان معرکہ میں سے ناکام واپس ہوتے ہیں۔

مغربی مورخوں نے درست لکھا ہے کہ تاریخ ہندوستان میں یہ پہلا موقع ہے کہ مغربی باقاعدگی کے سامنے مشرقی بے قاعدگی شکست کھاجاتی ہے۔ جدید مغربی قواعد و طریقۂ جنگ اور نیز جدید ترین مغربی آلاتِ حرب کا ہندوستانی فوجوں کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوتا ہے۔ بہر حال اس پسپائی نے ثابت کردیا کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے گو اس کا احساس کسی کو نہ تھا۔

اب نواب انور الدین خان نے خود حملہ کرنا چاہا لیکن پھر انہوں نے اپنے ایک دوسرے فرزند محمد علی خاں بہادر نواب والاجاہ کو اس مہم پر مامور کیا۔ اس موقع پر نواب والاجاہ اور اور ڈوپلے کی جو خط و کتابت ہوئی اس کا تذکرہ کرکے صاحب "توزک والاجاہی" اور صاحب "تحفۃ الاخبار" نے دونوں کے ایک ایک خط کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ ڈوپلے رقم طراز ہے کہ:-

"دو پر ظاہر است کہ فی مابین انگریز و فرانسیس مدام جنگ وجدل می باشد و باز ہوا نفقت ہم بہ میان می آید آن مشفق را لازم است کہ نفع ونقصان ہر دو فرقہ مساوی دارند و باعانت یکطرفہ نہ پردازند بلکہ محاربہ ہر دو طرف تماشا کنند برادر بزرگ گرامی از مقابلہ من مضرت یافتہ خفیف گردید۔ بیک حملہ مردانہ قلعہ چناپٹن بدست آوردم۔ می ترسم کہ از قضیہ وہنگامۂ طرفین مبادا مضرتے بآن مشفق برسد لہذا لازم وضرور است کہ خیال آمدن این طرف نہ کنند وگرنہ برق توپ اندازی من بے اختیار است وشعلہ باروت خانہ وبنادیق من از نالۂ منطفی نمی شود۔ زیادہ چہ برطراز د۔"

اس خط سے صاف صاف نظر آتا ہے کہ جرات اور بے باکی کیسے ترقی کر رہی ہے۔ اس کا جواب بھی ملاحظہ ہو[۱]:—

"خط مرسلہ کہ مطلبش بے معنی وگزاف لایعنی بود رسید از خیالات لاف زنی ایشان تحیر گردانید۔ جناب مالک الملک حقیقی سکہ حکومت این ملک بدست من دادہ وتیغ بے دریغ مارا بنا برقتل وتلف متمردان وگردن کشان قوت وبرش بخشیدہ۔ درین صورت لازم وضرور شدہ کہ بہ حمایت متوسلان وفرمان برداران خود بکوشم وتا مقدور جہت اعانت مطیعان و دوستان خود بکوشم۔ نمی توانم دید کہ کسے بطرف وفاداران من نظر کند وپسند نمی توانم کرد کہ احدے بہ مخلصان من بدچشمی سبقت نماید۔ توقع از تہار مطلق دارم کہ در عوض مخالفتے کہ با دوستان من بوقوع آمد نام فرقہ فرانسیس درین ملک باقی نہ ماند و دست درازی کہ بہ قلعہ چناپٹن کردہ اند در بدلہ آن بنیاد بندر پھولچری (پانڈی چری) از زمین بردارم تحریر دستظ من

۱۔ دونوں خطوط "تحفۃ الاخبار" سے نقل کئے گئے ہیں۔

بے خلاف است و تقریر من تیغ بے غلاف۔ زیادہ چشم غفلت۔۔۔ یاد گے

آئندہ چلکر نظر آئے گا کہ اس خط کا ایک ایک لفظ کس طرح ایک ایک واقعہ ہوگیا۔ قصہ مختصر نواب والاجاہ کے حملہ کی فرانسیسی تاب نہ لا سکے۔ دیونام پٹن سے فرانسیسی بھاگ کھڑے۔ نواب والاجاہ نے تعاقب کیا اور خود پھولچری کا قصد کیا۔ راستہ میں ہی ڈوپلے کا فرستادہ وکیل حاضر ہوا۔ صلح کا پیغام پیش کیا اور معذرت طلب کی۔[1]

نواب والاجاہ نے تین شرائط قرار دیئے۔ اول یہ کہ قلعہ چناپٹن انگریزوں کے حوالہ کردیا جائے۔ دوسرے یہ کہ آئندہ ایسی شرارت نہ کی جائے۔ تیسرے تاوان لشکر کشی ادا کیا جائے۔ بالآخر پہلی دو شرطوں پر صلح ہو گئی۔[1]

اس ساری روداد کے متعلق نواب والاجاہ نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ :۔

"وقتیکہ موسی لبردین قلعہ چناپٹن را محاصرہ کرد والد این جانب را حسب درخواست گونر ماس مع فوج کثیر بہ کمک قلعہ چناپٹن روانہ فرمودند۔ تا کنجی رسیدہ بودیم کہ قلعہ چناپٹن بتصرف فرانسیس رفت و در صدد انتزاع قلعہ دیونام پٹن شد۔ وگونر جان ہمن از جناب والا بہ قبولیت زر مصروفہ فوج از ابتدا ایکہ بہ کمک چناپٹن آمد گردیدہ مستدعی کمک دیونام پٹن شدند و وکیل خود فرستاند۔ والد از فرانسیس بسیار ناخوش شدہ بہ موسی دوبلیس نصائح بسیار درباب باز حوالہ کردن چناپٹن و عدم مزاحمت از دیونام پٹن قلمی نمودند۔ چوں مسموع نہ کرد یک فوج بنا بر محاصرہ چناپٹن مامور داشتہ این جانب را با فوج شائستہ حسب الطلب گونر جان ہمن

---

[1] تحفۃ الاخبار و توزک والاجاہی۔

متاع لکوک رافرانسیس لوٹ .... بہ کمک دیونام پٹن روانہ کردند
کرد۔ این جانب راموسی دوبلیس معہ معتمدان خود نوشتہ فرستاد کہ قلعہ دیونام پٹن گرفتہ
معہ اموال ومتاع انجا بہ صاحب می سپارم وسوای ان مبلغ نقدی دہم وبہ والد صاحب
نذر ونیاز بسیار می رسانم وباعانت مدامی کہ از انگریز ہیچ نخواہد شد می پردازم و
ملک وقلعہ تنجاور تسخیر کردہ حوالہ می سازم از کمک آنجا دست بردارید۔ این جانب
لابہ گری اورا اصلا بخاطر نیاوردہ ہمین جواب دادیم کہ اخلاص .... او میان
منحصر بہ زر نیست .... وقتیکہ فوج فرانسیس بر دیونام پٹن رسید بہ فضل الہی
از قرار واقع تنبیہ وبسیارے را از ان گروہ اسیر کردہ وتوپ ہا غنیمت نمودہ زدہ
زدہ تا پھولچری رسانیدیم وچہار ماہ تا رسیدن جہازات ولایت با فوج اُلوف
از سوار وپیادہ ہا وتوپ خانہ وغیرہ سامان بسیار بہ کمک دیونام پٹن پرداختم تا انیکہ
موافق اقرار گورنر جان ہن برائے گرفتن زر مصروف .... والد حکم دادہ بودند و
گورنر مذکور نیز می گفتند کہ بالفعل زر نداریم بعد رسیدن جہازات ولایت خواہم داد
لاکن این جانب بدریافت تنگی اخراجات انجا حصول بحث وائمی قوم انگریز کو نیی
زیادہ برگرفتن زر اخراجات دانستیم"

اس یادداشت میں آگے چلکر لکھا ہے کہ :-

"بہ ہمیں سبب ہائے دوستی از انگریز موسی ذوبلیس ازردہ شد درطلب داشتن
چندا و اعانت ہدایت محی الدین خان ساعی گردید"

یہ ہے برطانوی تفوق کی ابتدا کی پہلی منزل صاحب "توزک والا جاہی" و "قصر والا جاہی"
کا بیان ہے کہ اس سلوک پر اہل انگلستان نے بے حد شکر گزاری ظاہر کی۔ شاہان انگلستان سے
بھی سلسلہ نامہ وپیام شروع ہوا۔ اور وعدہ کیا گیا کہ سلطنت انگلستان اس سلوک کے عوض اس امر کا لحاظ

رکھیگی کہ ریاست کرناٹک خاندان انوری میں نسلاً بعد نسلٍ قایم رہے۔

اب ۱۱۶۱ھ کا زمانہ ہے۔ حضرت آصف جاہ طاب ثراہ نے جان عزیز جان آفرین کے سپرد کیا کہ ان سارے فتنوں نے سر اٹھایا جو حضور کے وجود با جود کی وجہ سے دبے ہوئے تھے۔ سرزمین دکن میں قیامت کا نمونہ نظر آنے لگا۔ جنگ و جدل۔ دغا و فریب کے شرمناک اور دردناک مناظر دکھائی دینے لگے۔ سارے دکن میں باہمی نزاعوں کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ قحط الرجال کی جو شکایت شاہ خلد مکان اورنگ زیب کو تھی وہ اب عالمگیر ہوگئی۔ پس پردہ جو طوفان اٹھ رہا تھا اس کا احساس کسی کو نہ تھا۔ خود سری کا تخیل ہرکس و ناکس کو پکار رہا تھا باہم گر جھگڑنے والے مدعیان حکومت کو اقوام مغرب سے مدد لینے کا خیال پیدا ہوا۔ ان مدد لینے والوں نے خیال نہ کیا کہ غیر ملکی کرایہ کی فوج مدد دیتے دیتے جب یہ دیکھے گی کہ اب اس کی قوت بادشاہ گری کر سکتی ہے تو فوراً وہ موقع کو اپنے موافق بنالیتے ہیں کچھ بھی پس و پیش نہ کرے گی جیسے کہ عباسی دور خلافت میں غلامان ترک نے مثال قایم کی تھی۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت بقیۃ السلف مشرقی ارباب دانش و بینش حالات کی نزاکت سے سہمے جارہے تھے لیکن ان کے ہاتھ اسقدر قوی نہیں تھے کہ آنے والے طوفان کو روک دیتے۔

اس موقع پر نہ تو حافظ ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ اور نہ نواب حسین دوست خان چندا صاحب اور نہ فرانسیسی چالاکیوں کا مفصل تذکرہ مقصود ہے صرف مناسبت مقام کی بنا پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ نواب انور الدین خان نے حضور ناصر جنگ کو والی دکن تسلیم کرلیا اور کوشش کی کہ نواب مظفر جنگ اپنے دعوے سے باز آجائیں۔ نواب انور الدین خان نے اپنے پاک اور نیک مقاصد میں کامیابی بھی تقریباً حاصل کرلی نواب مظفر جنگ اپنی نازیبا حرکت سے باز آہی رہے تھے کہ فرانسیسی ڈپلومیسی بازی لے گئی۔ اور بقول صاحب تحفۃ الاخبار خود نواب مظفر جنگ کی اطلاع کے بغیر لشکر انوری پر بے خبری میں دھاوا بول دیا گیا۔ اس تہلکہ میں دکن کے لئے حضرت

آصف جاہ کے انتقال کے بعد دوسری مصیبت یہ آئی کہ نواب انورالدین خان بھی شہید کردیئے گئے۔ (۱۱۶۲ھ)

"توزک والاجاہی" اور "تحفۃ الاخبار" کے بیان سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ نواب انورالدین خان نے ہرگز مدافعت نہیں کی۔ قدیم مشرقی جذبہ نمک حلالی اور وفاشعاری ان کو روک رہا تھا تا آنکہ جان دے دی اور آج اسی حیدرآباد کے نواح میں ان کا مزار بہ زبان حال ہر فرزند حیدرآباد کو جان نثاری اور ثابت قدمی کا فراموش شدہ سبق یاد دلا رہا ہے۔

نواب والاجاہ نے ایک یادداشت میں انگریزی کمپنی کو جو مدد دی گئی تھی اس کو یاد کرکے اپنے والد ماجد کی شہادت کے متعلق یہ تحریر کیا ہے کہ:-

> "بہ ہمین سبب ہائے دوستی از انگریز موسی دوبلیس از ردہ شدہ در طلب داشتن چندا و اعانت ہدایت محی الدین خان پرداخت چنانچہ والد ماجد مناع آمدہ خان مذکور و چندا بعزم آنہا روانہ شدند۔ درین ضمن موسی دوبلیس فوج خود فرستادہ ارکاٹ را ضبط کرد۔ اموال سرکار کہ در انجا آوردہ .... بہ تصرف خود آوردہ فوج بہ کمک آنہا فرستاد۔ آن وقت اومارل ماسکوین با فوج مضاعف از فرانسیس در چیناپٹن بود نداگر بہ کمک دوست قدیم خود یعنی والد می پرداختند شہادت والد بوقوع نمی آمد و اموال ہمراہی والد کہ در لشکر نقد و جنس تخمیناً اسباب کرور روپیہ بود .... بتصرف مخالفان نمی رفت و کار مخالفان قوت نمی گرفت"

بہرحال نواب انورالدین خان کی شہادت سے فرانسیسی حکمت عملی کو بظاہر فتح حاصل ہوئی ارکاٹ میں داخل ہوکر نواب مظفر جنگ نے انتظام اپنے ہاتھ میں لیا لیکن ابھی پس پردہ دوسرے تماشوں کی تیاری جاری تھی۔ مختصر یہ کہ نواب والاجاہ نے جو اس وقت ارکاٹ سے بہت دور ترچناپلی میں

مقیم تھے۔ نواب مظفر جنگ کی حکومت تسلیم نہیں کی۔ اور حضور ناصر جنگ کو حالات سے مطلع کیا وہاں سے ارشاد ہوا کہ:۔

"از دریافت واقعہ شہادت نواب انورالدین خان شہامت جنگ خاطر ملال پزیر گردید۔ انشاءاللہ المستعان این جانب راعنقریب بنا بر تنبیہ و تادیب مفسدین آن دیار رسیدہ دانند۔ نظر بر مشیت الٰہی صابر بودہ بہ نسق و نظم تعلقات آنجا مشغول باشند"[1]

دوسری جانب ڈوپلے کے اشاروں سے جو نقشہ تیار ہو رہا تھا وہ صاحب "تحفۃ الاخبار" کے الفاظ میں یوں ہے:۔

"ہدایت محی الدین خان فی الجملہ از بند و بست بعضے کارہا فراغت یافتہ باراد تسخیر تھنجاور عرف تنجاپلی کہ در قبض و تصرف نواب والاجاہ بود بسوے پھولچری روانہ گردید۔ موسی دیلکس ...... آنجا راستقبال ہدایت محی الدین خان کردہ بہ تعظیم و تکریم بہ پھولچری بردہ لوازم ضیافت شائستہ بعمل آورد و محفل نشاط پردازی و شراب خواری بائین ہمین منتظم گردانید۔ پس ہدایت محی الدین خان و حسین دوست خان و موسی دیلکس در انجمن بادہ نوشی بایکدیگر بنا بر تسخیر تھنجاور کنگاش نمودند۔ موسی دیلکس ظاہر کرد نقش خیال تفتیح تھنجاور از لوح خاطر حک باید ساخت کہ نواب والاجاہ امیر تدبیر...... است........ بلکہ مناسب ...... آن است کہ بالفعل فکر بہم رسانیدن نقد و زر باید کرد بعد ازاں اختیار باقی است ...... تجویز چنین مقرر شد کہ حالا بر راجہ تنجاور تاخت آوردہ چیزے مال

---

[1] تحفۃ الاخبار سے نقل کی گئی ہے۔ توزک والاجاہی میں بھی موجود ہے۔

وزر پیدا کنیم "

اس تجویز کے مطابق تنجاور پر حملہ کیا گیا۔ راجہ نے نواب والا جاہ سے مدد مانگی قبل اس کے کہ فوج والا جاہی آئے راجہ نے کچھ دے دلا کر دشمن کو واپس کیا۔

بہرحال حضور ناصر جنگ بہادر نے حسب بیان تحفۃ الاخبار شوال ۱۱۶۲ھ میں اورنگ آباد سے جانب کرناٹک عزیمت فرمائی۔ قبل اس کے کہ حضور کرناٹک میں آئیں۔ نواب والا جاہ نے حکام مدراس کو حسب وعدہ مدد کے لئے یاد دہی کی۔ اس کے متعلق نواب والا جاہ نے بیان کیا ہے کہ :۔

"بعد شہید شدن والد این جانب بہ اولر مذکور (ماسکوین) وگورنر فلایراز ترچناپلی درباب کمک خود نوشتم ایشاں درخواست کرد کہ اگر تعلقہ میلاپور و ترندپور بہ کوپنی بدھم کمک دائمی خواہم کرد ایں جانب سند تعلقات مذکور فرستادیم چنانچہ او شاں اول ..... بعد مستر کوپ را بہ کمک این جانب بہ ترچناپلی فرستادند چنانچہ موافق گفتہ آنہا ایں جانب زر برائے خرچ فوج می رسانیدیم "

نقلِ سند یہ ہے :۔

"مرقوم شہر ذی قعدہ ۱۱۶۲ھ آنکہ درین ولا بندر میلاپور تعلقہ کرناٹک پایان گھاٹ صوبہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد بشرطِ رفاقت و فدویت کہ ہر گاہ برائے کارہائے سرکار طلب داشتہ شود با جمعیت و سرانجام خود ہا بحضور رسیدہ شرائط رفاقت بجا آرند سپرد انگریزان چناپٹن و دیونام پٹن حسب الضمن مقرر گشتہ۔ باید کہ بخاطر جمع در فدویت و اطاعت سرکار حاضر و سرگرم باشد "

اس زمانہ میں گورنر مدراس جو عرائض روانہ کرتے تھے اس کا ایک نمونہ یہ ہے :۔

" نقل تہدید نامہ کہ بنام فرانیس پھلچری صادر شدہ بود زکیفیت آن نیز دریافتہ۔

اگر فرانسیس مذکور مطابق مضامین ارشاد مکرمت بنیاد آن بعمل نیارد یقین است که بہ سزائے کردار خود می رسد۔ قوم مذکور اصل آنہا بد است۔ ہر جا کہ ہستند مردم آزار و بغیر فساد کار دیگر ندارد۔"

(خط گورنر فلایر مرقومہ ۱۱ محرم ۱۱۶۳ھ)

غرض "تحفۃ الاخبار" کا بیان ہے کہ حضور ناصر جنگ کا لشکر کرناٹک میں آیا اور فتنہ و فساد کی جڑ کاٹ دینے کے لئے ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ فرانسیسی فوج اپنے عہد و پیمان بھول گئی اور نواب مظفر جنگ تنہا چھوڑ دیئے گئے۔ چندا صاحب بھاگ کھڑے ہوئے۔ بالآخر نواب مظفر جنگ گرفتار ہو کر حضور ناصر جنگ کی پیش گاہ میں حاضر کئے گئے۔ ان کی جان بخشی ہوئی اور نواب والاجاہ کو ربیع الثانی ۱۱۶۳ھ میں صوبہ داری کرناٹک سے سرفراز کیا گیا۔ دربار دہلی سے جو فرمان شرف نفاذ پایا تھا وہ اُن کو عطا فرمایا گیا۔ اس موقع پر اس فرمان کے اس فقرہ کی نقل جس میں فرائض صوبہ داری گنائے گئے ہیں قابل تذکرہ ہے:۔

" باید کہ در تنظیم و تنسیق امور صوبہ مفوضہ و تالیف و استمالت مالگزاران و تنبیہ و تادیب مفسدان و اخراج و ارجاع اہل طغیان سعی و کوشش موفورہ بعمل آرد و در حسن معاضدت بندہ ہائے درگاہ و رفاہیت رعایا و برایا و منع مسکرات و منہیات و دفع منکرات و قطع ادعیات و فصل معاملات بر وفق شریعت غرا و عدالت عالم آرا مساعی جمیلہ بکار برد کہ تا ساکنان آن حدود با دل امین و خاطر مطمئن بہ کسب پیشہ خود ہا مشغول باشند و بر ضعفا حیف و میل نرود و بدعت احداث نشود و درین باب تاکید مزید شناسد" [۱]

---

[۱] توزک والاجاہی۔

حضور ناصر جنگ بہادر چاہتے تھے کہ فرانسیسی اثر و رسوخ کا قلع و قمع فرمادیں۔ چنانچہ اس غرض سے آپ کا ارادہ تھا کہ پھولچری پر حملہ آور ہوں لیکن ہمت بہادر خان حاکم کڑپہ اور عبد النبی خان حاکم کرنول راجہ رام داس سے مل جل کر حضور موصوف کو اس ارادہ سے باز رکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ فرانسیسی فوج کو اشارہ کرکے فوج آصفی پر شب خون کرایا گیا۔ بہرحال حضور ناصر جنگ بہادر نے نواب والاجاہ کو فرانسیسی علاقہ کے قلعہ تروادی کی تسخیر پر مامور فرمادیا۔ نواب والاجاہ انگریزی فوج بھی ساتھ لے گئے۔ قلعہ سر ہوجانے میں دو ایک دن اور درکار تھے کہ ڈوپلے کو فوراً احساس ہوگیا کہ اگر یہ قلعہ ہاتھ سے نکل جائے تو پھر پھول چری کی خیر نہیں۔ فرانسیسی چالاکیاں پھر کام کرنے لگیں چنانچہ پیشگاہ حضور ناصر جنگ میں عرض کرنے والوں نے عرض کیا کہ :-

نواب والاجاہ جماعت انگریز را بہ وعدہ جاگیر پونملی رفیق خود ساختہ است از اتفاق سازی حسین دوست خان و ہدایت محی الدین خان با فرقہ فرانسیس این قدر فتنہ ہا در ملک برپا گردید اگر قوم انگریز ہم دخیل شود معلوم نیست کہ چہا خواہد شد۔[1]

اس بنا پر حضور ناصر جنگ بہادر نے نواب والاجاہ کے نام احکام جاری فرمادیئے کہ انگریزی فوج سے مدد نہ لی جائے اور نیز ساتھ ہی عبد النبی خان حاکم کرنول اور ہمت بہادر خان حاکم کڑپہ کو دیونام پٹن اور چناپٹن کی تسخیر پر مامور فرمادیا۔ نواب والاجاہ ان احکام سے متفکر ہوکر ترو ادی سے ارکاٹ چلے آئے اور راجہ رام داس کو کچھ دے دلاکر اس امر پر راضی کیا کہ حضور ناصر جنگ بہادر کی پیشگاہ میں انگریزوں کے لئے سفارش کی جائے۔ راجہ رام داس نے سفارش کی اور وہ منظور بھی ہوئی۔ انگریز عہدہ دار کو خلعت اور اسپ سے سرفراز کیا گیا۔ ترو ادی پر نواب والاجاہ نے پھر حملہ کیا لیکن قبل اس کے کہ اس پر قبضہ ہو فرانسیسی سازشوں کی وجہ حکم ہوا کہ مہم واپس آجائے

---

[1] تحفۃ الاخبار۔

اس معرکہ میں نواب والاجاہ بھی توپ کے گولے سے زخمی ہوئے۔ قصہ مختصر فرانسیسی سازشیں برابر کام کرتی رہیں تا آنکہ ۱۷ محرم ۱۱۶۴ھ کو میدان جنجی میں حضور ناصر جنگ ہمت بہادر خاں سے یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

"ما و شما در مسلک دین داری ہستیم لازم رفاقت آنست کہ بر کافران مخالف دین کوشش بہ عمل آریم۔"

لیکن اس مخلصانہ التماس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہمت بہادر خان کی بندوق نے حضور ناصر جنگ کو اپنا نشانہ بنایا اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اب فوراً نواب مظفر جنگ کی حکمرانی کا اعلان ہو گیا۔[1]

اس ساری بیان کردہ روئیداد کے متعلق خود نواب والاجاہ کی ایک یادداشت اس قابل ہے کہ اس کو یہاں نقل کیا جائے۔

"ہرگاہ نواب ناصر جنگ در ۱۱۶۳ھ بہ تدارک والد شہید بعزم تنبیہ ہدایت محی الدین خان و چندا وارد ملک کرناٹک شدند و این جانب از ترچناپلی نزد نواب مذکور با فوج انگریزی رسیدیم و ایشان با این جانب گفتند کہ کار..... بندوبست ملک کرناٹک نمایند من ہم معین خواہم ماند نظر بہ ہنگامہ مخالف دین باب از انگریزان استصلاح نمودیم چنانچہ گورنر فلایر و گورنر لارنس و مسٹر ورسکٹ مسٹر کوپ و مسٹر ڈالٹن در باب اختیار کار کرناٹک بمبالغہ و نمودن امداد و دائمی قلمی نمودند۔ لہٰذا صوبہ داری کرناٹک قبول کردیم و ہرچند بارہا در باب کمک نواب ناصر جنگ بہ گورنر و دیونام پٹن نوشتیم و بہ مبالغہ گفتیم برائے

---

[1] - تحفۃ الاخبار ۱۲

کار سہل یعنی در خورست تعلقہ پون لی بجا گیر خود ہرگز کمک قبول نہ کردند و بلکہ قدرے

مردم کہ با مستر کوپ برائے کمک من فرستادہ بودند باز طلبیدند و رسو اوترو ادی

نزدیکے دیونام پٹن لشکر من با تمامی اثاثہ من کہ ہمراہ بود مرتبہ چہارم از دست

مخالف بغارت رفت و خسارت بسیارے رو داد و زخم گولہ بپائے من

رسید و آخرش مخالف نواب ناصر جنگ را بہ دغا کشتہ ہدایت محی الدین خان

را آنکہ بادشاہ صوبہ داری دکن مقرر نہ فرمودہ بودند در پھولچری طلب داشتہ

صوبہ دار دکن مقرر کردہ تمامی افیال و توپ خانہ وغیرہ بسرانجام نواب مذکور

بہ ہدایت محی الدین خان دادہ نقد و جواہر بسیارے از آنہا گرفتہ با فوج کمکی خود

روانہ دکن کرد۔ اگر فوج کوپنی کمک والدمن می کرد اگر ہمراہی من نمی رفت مخالف را

این قدر قوت درین ملک بہم نمی رسید و این معنی بعمل نمی آمد“۔

الغرض نواب والاجاہ یکہ و تنہا ترچناپلی چلے آئے۔ اب ان کے اور انگریزی تعلقات کی داستان کا پھر ایک نیا باب آغاز ہوا۔

نواب مظفر جنگ نے پھولچری میں پہنچ کر نواب حسین دوست خان چندا صاحب کو نظامت ارکاٹ پر مامور کیا اور ساتھ ہی نواب والاجاہ کو بھی حسبِ مشورہ ڈوپلے ”مکاتب موافقت با عہد و ضمانت نامہ ہائے موسی و بلکس و جانوجی مرھٹہ“ روانہ کئے[1]۔ نواب والاجاہ نے نواب مظفر جنگ کو جواب دیا کہ:۔

”فی الواقع اطاعتِ ناظم کرناٹک با والی دکھن لازم و لابداست اما نظر بہ این کہ قبض و تصرف ایشاں بر حکومت دکن از تغلب و بدراہی است۔ ملک کرناٹک

---

[1] تحفۃ الاخبار۔

ارثاً از حکم شاہی تعلق بہ من دارد غیر از صدور احکام ظلّ سبحانی نظامت شما و اطاعت
من از جملہ محالات است۔ باوجود این تقرر، ریاست ارکاٹ بہ حسین دوست خان
و دادن جاگیر بسیار تعلقات بہ فرانسیسیان از عجائب و غرائب و بالیقین منشاء
تعرض و قباحات گوناگون است۔"

الغرض پھولچری سے نواب مظفر جنگ عازم حیدرآباد ہوئے اور نواب حسین دوست خان عازم ارکاٹ۔
ارکاٹ پہنچ کر انہوں نے جمادی الاول ۱۱۶۴ھ میں ترچناپلی کا ارادہ کیا اور ملک میں دور تک تاخت
کر کے اس کے اکثر حصہ پر قبضہ کر لیا۔ نواب والاجاہ مریض اور فریش تھے۔ اچھے ہو کر انہوں نے معاملات
اپنے ہاتھ میں لئے اور امداد کے لئے جو خط گورنر چناپٹن (مدراس) کے نام روانہ کیا اور جو پیغام دیا اس
کو صاحب تحفۃ الاخبار نے نقل کیا ہے۔ گو اس کے اکثر مضامین اوپر بیان کردہ یادداشتوں میں درج
ہو چکے ہیں۔ بریں ہم اس کا اس موقع پر نقل کرنا بے محل نہیں ہے:۔

"مخالفت جماعت فرانسیس با من وجہے و سببے نداشت من در زمان ماضی با اعانت
کمپنی انگریز پرداختہ بندر دیونام پٹن از قبض و تصرف فرانسیس نگاہ داشتم و چناپٹن
از دستش رہانیدہ۔ بقوم انگریز دہانیدم ازین سبب فرانسیس با مخالفان من اتفاق
کردہ۔ و والدم از ہماں فتنہ و فساد شربت شہادت نوشیدہ۔ وقتیکہ نواب ناصر جنگ
شہید میر درحسب تجویز بعضے نمک حرامان فرقہ انگریز را بنابر تسخیر قلعہ ترو ادی ہمراہ
من تعین کردہ روانہ فرمود و ہمت بہادر خان و عبدالنبی خان .... را جہت
استیصال جملہ بنادر و اخراج تمامی تجار اہل فرنگ مامور نمودہ من بموجب وصیت
پدر خود با اعانت قوم انگریز پرداختہ قایم کردم و با انصراف مبلغ نمایاں بندوبست
قیام انگریزاں بعمل آوردم باوجود قبل ازیں وقت ضرورت والدمن از طرف کمپنی
انگریز مدد و اعانت بہ ظہور نیامد اکنون وقت اعانت من است باید کہ درین وقت

با من کمک دوستانہ بعمل آرند۔ اخراجاتِ فوج ولوازم آن بر ذمہ من است۔"

تحفۃ الاخبار میں لکھا ہے کہ "گورنر .... جمعیتِ قلیل روانہ نمود" دوسری طرف نواب حسین دوست خان ترچناپلی پر قبضہ کرنے کی غرض سے فرانسیسی فوج ساتھ لیکر چل کھڑے۔ اس زمانہ میں نواب والاجاہ کے خطوط کے جواب میں گورنر سانڈرس نے ربیع الاول ۱۱۶۴ھ کو لکھا کہ:—

"ما ...... از سرکار جاگیر یافتیم کہ در کارہاے سرکار معاونت بعمل آریم لہذا در ہمہ وقت بہ حتی المقدور مراتب اعانت بعمل خواہم آورد"[1]

۲۱ رمضان ۱۱۶۴ھ کو گورنر چناپٹن بہ اجلاس کونسل نے حسبِ ذیل تحریر روانہ کی:—

"بر آن صاحب منیر روشن خواہد بود کہ کمترین در ہمہ اوقات لوازم اخلاص مندی در کار آن صاحب بہ تقدیم رسانیدہ۔ فی الحقیقۃ فتح صاحب فتح خود می داند و شکست را ہم بدستور می داند۔ یقین تصور فرمایند کہ حتی المقدور در استحکام کارہائے قصور نخواہد کرد۔ بعد شہید شدن نواب ناصر جنگ آن صاحب بخریت بمکان ترچناپلی رسیدہ اند ازین معنی بسیار خوش وقت شدیم مجرد رسیدن خط اول .... خوبی ہاے آن صاحب و ہم بنا بر اظہار وفاداری انگریزاں .... سولداران بمعہ سامان جنگ بسرکردگی مسٹر کوپ برائے کمک آن صاحب روانہ ساختیم"[2]

اس اثنا میں دربار دھلی سے نواب والاجاہ کے نام فرمان نافذ ہوا۔ نواب غازی الدین خان

---

[1] از رسالہ نقول فقرات گورنران وغیرہ۔ ۱۲

[2] " " " " " " ۱۲

نے بھی عنایت نامہ روانہ فرمایا۔[1] اس کے متعلق نواب والاجاہ نے ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ :۔

"از دوستان من بعضے ہا می گویند کہ فرمان التمغا، کرناٹک باواسطہ خود ہا این جانب ورود فرمودہ۔ مہربان من دل این جانب از دوستی قوم انگریز مملو و کمک و اخلاص ہائے لاتبدیل من با این فریق از بس وضوح احتیاج تشریح ندارد۔ برائے آگہی می نویسم کہ قبل از اقتدار انگریزان درین ملک فرمان التمغا، احمد شاہ بادشاہ معظم زیب تحریر پذیرفتہ ۲۷ ربیع الاول ۱۱۶۴ھ بہ نام این جانب نظر بر عمدگی خاندان من و حقوق قدیمہ و تدبیر صائب من بہ استصواب نواب مہابت جنگ صوبہ دار مستقل بنگالہ و نواب وزیر الممالک و مرھٹہ ورود یافت۔ این جانب نقل خط گورنر سانڈرس بنام ریچرڈ بوچیر اسکویر گورنر بمبئی مرقوم نوزدہم ستمبر ۱۷۵۲ء مطابق بست و نہم ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ کہ از سابق پیش خود دارم دران مرقوم است کہ ما یان بہ کمک فلانے یعنی این جانب کہ فرمان برحق برائے صوبہ داری کرناٹک مایان گھاٹ و بالا گھاٹ دارند مامور گردیدیم۔ این خط گورنر مذکور بعد ہجدہ ماہ از ماہ ورود فرمان است و پیش عقلا نیکو اظہر کہ واسطہ دیگرے درین کار نبودہ۔"

خیر بالآخر ترچنا پلی کا محاصرہ ہو گیا۔ رمضان ۱۱۶۴ھ سے ذی قعدہ تک مقابلہ اور محاصرہ جاری رہا۔ آخر نواب والاجاہ نے قرار دیا کہ ارکاٹ پر حملہ ہونا چاہیئے کہ وہاں فی الوقت سامان مدافعت کچھ بھی نہیں ہے۔ محمد مدینہ علی خان اور کلایو جو ترچناپلی میں تھے۔ اس مہم

---

[1] تحفۃ الاخبار ۱۲

پر مامور کیئے گئے۔[1]

"لارڈ کلیف و مدینہ علی خاں از راہ سرحد ..... تنجاوز بدیونام مٹن و
چناپٹن رفتہ فوج لائق گرفتہ سمت ارکاٹ راہی گردیدہ"[1]

دونوں نے قلعہ ارکاٹ پر علم والا جاہی نصب کر دیا۔[2] یہ دیکھکر نواب حسین دوست خان نے ترچناپلی کے کیمپ سے اپنے فرزند کو اس جانب روانہ کیا۔ انھوں نے ارکاٹ پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ عرصے تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ معرکہ کا رن پڑا۔ عین وقت پر برسر موقع دو ہزار مرہٹوں کی فوج یونس خان کی سرکردگی میں والاجاہی فوج کی امداد کے لئے ارکاٹ پہنچ گئی۔ نواب حسین دوست خان کی فوج ہار مان گئی۔[1]

اب نواب حسین دوست خان نے اپنی ساری توجہ ترچناپلی کے محاصرہ کو سخت تر بنانے میں صرف کر دی۔ نواب والاجاہ کے پاس اب نندراج زمیندار میسور اور مرار راو ناظم گوتی دونوں حسب الحکم نواب غازی الدین خان فیروز جنگ مدد کے لئے پہنچ گئے۔[1] میسور کی فوج میں حیدر علیخان بھی شریک تھے۔[2] طرفہ ماجرا ہے کہ آگے چلکر یہی حیدر علیخان نواب میسور بن کر نواب والاجاہ کے خلاف میدان میں آئے ہیں۔

نواب والاجاہ نے گورنر چناپٹن اور محمد مدینہ علی خان کو بھی ترچناپلی کی امداد کے لئے لکھا۔ اب پھر کلایو معہ میجر لارنس ترچناپلی میں حاضر ہوئے۔ آخر کار نواب حسین دوست خان نے راہ فرار اختیار کی او سریرنگ (دوابہ کاویری) میں جاکر پناہ ڈھونڈی۔ والاجاہی فوج نے جس میں کلایو اور میجر لارنس کے ساتھ انگریزی فوج بھی تھی۔ نواب حسین دوست خان کا محاصرہ کرلیا انجام کار نواب حسین دوست خان نے فرانسیسی ہمراہوں کے مشورے سے ماناجی راجہ تنجاور کے پاس

---

[1] تحفۃ الاخبار۔ توزک والاجاہی وقصہ والاجاہی۔ [2] تحفۃ الاخبار [3] توزک والاجاہی ۔

پناہ طلب کی، پناہ کیا ملی شعبان ۱۱۶۵ھ میں ہاں انکا سر تن سے جدا کر کے نواب والا جاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا[۱]۔ یوں انگریزی اثر و اقتدار کے ایک زبردست مخالف کا کام تمام ہوا۔ اُدھر نواب مظفر جنگ عازم دکن ہوے۔ راستہ میں پھر خود ہمت بہادر خان کے ہاتھوں نواب موصوف کے قتل کا سامان کیا اور فرانسیسی اثر سے نواب صلابت جنگ وارث مسند آصفی قرار دیے گئے۔

اس موقع پر آزاد بلگرامی کے بعض الفاظ کی نقل خالی از دلچسپی نہیں ۔

"مخفی نماند کہ تا این وقت نصاریٰ فرانسیس و انگریز در بنادر بودند و پا از حدِ خود بیرون نمی گزرشتند۔ ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ آنہا را رفیق خود کردہ جری ساخت ۔ شہادت نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ہم با اعانت فرانسیس واقع شد و بعد ازیں نصاریٰ سخت غرور و جرات بہم رسانیدند و جرات ہائے فرانسیس دیدہ نصاریٰ انگریز ہم بحرکت آمدند پس بنائے تسلط نصاریٰ ابتداً طرح کردہ ہدایت محی الدین خان است کہ بعد شہادت نواب نظام الدولہ چیرہ شدند و لذت ملک گیری دریافتند"[۲]

اس تمام سرگزشت کے متعلق نواب والاجاہ نے ایک یاد داشت میں تحریر کیا ہے کہ :۔

"ہرگاہ نواب ناصر جنگ بدغا کشتہ شدند این جانب ہم ہگی اثاثہ خود مرتبہ نجم بغارت دادہ خود را بہ ترچناپلی رسانیدیم۔ چون انگریز فوج فرستادہ خود از کمک من باز طلبیدند و بہ امداد نواب ناصر جنگ نہ پرداختند نظر بر این معنی مقرر کردیم کہ باکسے جنگ نہ کردہ مع اموال باقیماندہ خود کہ سرمایہ عمر من و اطفال

۱۔ تحفۃ الاخبار۔

۲۔ ماثر الامرا صفحہ ۸۵۲ جلد دوم و صفحہ ۲۴ جلد اول۔

من است در مرکا نے نشستہ بہ فراغت گزرا وقات نمایم۔ بعدہٗ گونرسا ندرس
مع وینکٹا چلم....... کمک کردن خود۔ و این کہ سند تعلقہ پون ملی بہ جاگیر
انگریز فرستادہ شود از چہار صد فرنگی کمک دائمی خواہند کرد نوشتہ وگفتہ فرستادہ
و معامتر کوپ را با فوج روانہ کردند۔ با آن کہ موسی دوبلیس وزن او و موسی لا
ترغیب و پیغام بسیار بسیار نمودند و انواع اقرار ہا نوشتند و قرار نامجات بہ مہر
نواب صلابت جنگ و چندا بہ تطمیع تمام تر فرستادند....... لاکن این جانب اصلا
بآن طرف نگاہ نہ کردہ موافق پیغام گونر مذکور تنبیہ مخالفان قبول نمودیم و سند
تعلقہ پون ملی را فرستادیم و اوشان ہم با زمستر .... را بہ کمک روانہ کردند
چنانچہ تا کشتہ شدن چندا آنچہ این جانب در بساط خود داشتیم آن ہمگی را مصروف
پرداختیم و گونر مسطور ہم بہ کمک من پرداختند"

قصہ مختصر فرانسیسی اور والا جاہی فوج کی کشمکش جاری رہتی ہے انگریزی فوجیں کلایو کے ساتھ
والا جاہی فوجوں کے دوش بدوش کام کرتی رہتی ہیں۔ کرناٹک میں فرانسیسی اثر اور نفوذ دن بدن
کم ہوتا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی دکن اور کرناٹک میں اصلی اقتدار حاصل کرنے کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ
فرانسیسی مدبر اُٹھا نہیں رکھتے۔ ہند و دکن میں سیاسی افسرا تفری ایک دن بدن زیادہ تر ہوتی
جاتی ہے۔ نواب صلابت جنگ کے مقابلہ میں نواب غازی الدین خان فیروز جنگ پروانہ شاہی
لیکر اورنگ آباد آتے ہیں اور یہاں بقول مورخین کرناٹک زہر دیکر مار ڈالے جاتے ہیں۔ ادھر
دہلی میں احمد شاہ مکحول کردیئے جاتے ہیں۔ بادشاہ گردی ہوتی ہے۔ مرہٹی قوت زور پکڑتی
ہے۔ دکن میں فرانسیسی اثر برابر ترقی کرتا رہتا ہے۔

اس ساری ہمہ ہمی کے ساتھ نواب حسین دوست خان کے قتل نے حالات میں کوئی فرق
پیدا نہیں کیا۔ فرانسیسی اشاروں سے نندراج زمیندار میسور نے قلعہ ترچنا پلی کا مطالبہ کیا۔ مرار راؤ

نے بھی اس کی تائید کی۔ فرانسیسی فوج بھی اس کی حمایت کیلئے آموجود ہوئی۔ شہر ترچناپلی پھر محصور ہو گیا۔
نواب عبدالوہاب خان اور نواب نجیب اللہ خان برادران نواب والاجاہ بڑے بھائی کے خلاف
ہتیار سنبھال کر میدان میں آئے اس محاصرہ کو اٹھانے کے لئے پھر انگریزی فوجوں کو بلایا گیا۔ میجر
لارنس پھر حاضر ہوئے۔ والاجاہی فوجوں نے فتح حاصل کی لیکن باوجود اس کے فرانسیسی سازشیں برابر
جاری رہیں۔ آخر کار نواب والاجاہ اور فرنچ گورنمنٹ میں جو صلح ہوئی ہے اس کو صاحب تحفۃ الاخبار
نے یوں بیان کیا ہے :-

"ہر گاہ کہ بادشاہ فرانسیس اخبار فتوحات نواب والاجاہ و ہزیمت متواترہ و خسارۂ
متوافرہ قوم خود شنید با بادشاہ انگریز مستدعی صلح و آشتی گردید و بنا بر بندوبست
موافقت بقوم خود نگاشتہ موسی گودی نامی سردار را با تحف و ہدایہ پیش نواب
والاجاہ ارسال نمود چوں موسی مذکور بندر پھولچری رسیدہ جہتہ آمدن خود بہ حضور
نواب ظفر انتساب و آوردن ہدایا ملتجی گردید اگرچہ نواب معلی القاب در اول
راضی نہ شد ولیکن بعد از سفارش پردازی اہل انگریز مسترضی گشتند و بنا بر آمدن
موسی مشار الیہ اجازت داد پس موسی مسطور بہ حضور پرنور باریاب گردیدہ تحف و
ہدایای مرسلہ بادشاہ خود گذرانید و نواب والاجاہ بہ موسی گودی فرمود ہر چند
عزم مصالحت ما با قوم و غایبشہ شما نہ بود و نمی خواستیم با شما مراتب مرعات جاری
گردد ولیکن بپاس خاطر بادشاہ انگریز کہ محب صادق الوداد و شفیق بالتحقیق من
است و بذریعہ سفارش جنرل لارنس قبول نمودیم باید کہ شما در زمان مستقبل مدام
مطیع و منقاد ما باشند و از شاہ راہ اتحاد و یک رنگی منحرف نشوند و رضا علی خان
پسر حسین دوست خان را در پھولچری پناہ ندادہ اخراج نمایند و مبلغ کہ جہتہ لشکر
کشی وغیرہ مصروف گردیدہ مع زر تعہد معمولی داخل خزانہ کنند و یا نندراج و

مزار را او ہیچ علاقہ ندارند و با دوستان ما دوست و مخالفان ما مخالف باشند۔

موسی گودی ہمہ شروط صدر را قبول کرد مگر بنا بر ادائی مبالغ مصروفہ لشکرکشی بوسیلہ سفارش سرداران انگریز معافی خواست۔ نواب والا جاہ صلحنامہ بادشاہ فرانسیس قبول کردہ اسیران فرانسیس را آزاد فرمود و موسی گودی را بعنایت اسپ و خلعت مسرور نمودہ بہ پھولچری روانہ گردانید۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ڈوپلے کی معزولی اور دی لیری کی ماموری عمل میں آتی ہے۔ ایب ممالک کرناٹک میں صورت امن و امان دکھائی دیتی ہے۔ "تحفۃ الاخبار" میں بیان کیا ہے کہ نواب والا جاہ دیونام پٹن اور پھولچری میں آتے اور انعامات تقسیم کرتے ہیں۔ انگریزی اور والا جاہی تعلقات روز بروز مضبوط ہوتے جاتے ہیں۔

ڈوپلے کی روانگی کے ساتھ فرانسیسی قوت میں ضعف آ گیا۔ اس کے جانشین اس حوصلہ اور ظرف کے نہیں تھے۔ باہمی مخالفت ان کی ناکامی کا سبب ہوگئی اسکے بعد فرانسیسوں نے جو آخری کوشش کی وہ بالکلیۃ ناکام ہوگی۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں پیش ہے۔

بہرحال ابھی جب کہ بسے کو نواب صلابت جنگ کے دربار میں دخل حاصل تھا کونٹ لالی فرانس سے آیا اور پھر قلعہ دیونام پٹن پر فرانسیسی حملہ ہو گیا قلعہ فتح بھی کر لیا گیا اور اس کے بعد قلعہ چناپٹن کی تسخیر کے ارادہ سے فرانسیسی فوجیں روانہ ہوئیں۔ بسے نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے اور دکن کا لشکر لیکر کونٹ لالی سے مل جائے۔ نواب والا جاہ نے گورنر مدراس جارج پکیٹ کے مشورے سے دی لیری کو لکھا کہ :-

فی مابین ما و شما عہد و پیمان بدین نوع گردیدہ کہ با دشمنان ما دشمن و با دوستان ما دوست باشد و ما بہ طرف مرضی بادشاہ دہلی ہستم۔ نواب صلابت جنگ برخلاف مرضی بادشاہ موصوف برادر خود غازی الدین خان بہادر را مسموم ساختہ کشتہ و

وبادشاہ رانا خوش و مکدر گردانید لہذا علاقہ داری شما مردم بہ نواب صلابت جنگ خلاف عہد وپیماں متصور است۔ باید کہ علاقہ خودرا از او منقطع کنند وموسی بوسی را بہ پھولچری طلب نمایند[1]

دی لیری نے جواب میں لکھا کہ :۔

موسی بوسی از ما علاقہ ندارد بالفعل فقط بذات خود ملازم آن نواح است دریں صورت مناسب نمی نماید کہ نوکر دکھن موافق حکم گورنر پھولچری عمل کنند[1]

اس بنا پر نواب والاجاہ نے نواب صلابت جنگ کو تحریر فرمایا کہ :۔

"از روی خط موسی لیری موضوح گردید کہ موسی بوسی مع تابعداران خود نوکر دکھن شدہ وبہ مرتبہ رشد واعتبار رسیدہ ۔ قومے راکہ مکردہ مزاج بادشاہ باشد بہ رفاقت گرفتن وفرقہ راکہ قاتل برادر بزرگ باشد بہ نوکری واشتن خلاف آئین مروت ودولت است بلکہ لازم ومناسب آن است کہ ازیں قوم بے وفا احتراز فرما خواہند بود[1]

صاحب "تحفۃ الاخبار" کا کہنا ہے کہ اس کا کوئی جواب نہیں آیا اور پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ :۔

"بلکہ برعکس آن حسب تجویز ہر دو شیر جعبتہ استیصال کوٹھی انگریز از بنگالہ بہ نواب سراج الدولہ ناظم وقت بنگالہ نگارش نمود سراج الدولہ تأمل اندیشی نکردہ بہ حیلہ قضیہ یک نفر گجراتی کہ بہ کوٹھی انگریز پناہ گرفتہ بود ۔ کوٹھی انگریز از بنگالہ خارج گردانید چون درآن اوقات اہل انگریز اقتدار فوج زیادہ نہ داشتند

---

[1] ۔ تحفۃ الاخبار۔

جارج بگیٹ گورنر چناپٹن بنا بر کمک افواج مطلوبہ از نواب والا جاہ متدعی گردید
نواب مستطاب بامداد و اعانت افواج پرداختہ۔ پس جارج بگیٹ مع جمعیت علاقہ
خود مصحوب مسٹر کلیوس المخاطب بلارد کلیف از سواری جہازات بہ سمت بنگالہ روانہ
گردانید۔ نواب والا جاہ تا انجام آن مہم و قیام کوٹھی انگریز در بنگالہ ہر گونہ مدد و عمل
آورد و مدام در فکر انصرام آن کار می بود بلکہ ازین تفکر و تشویش آرام و آسائش
خود ترک کردہ بود۔ چنانچہ بہ سبب این مہم ضروری توابعان و متعلقان را از
نتھر نگر طلب داشتہ در فرنگی کونڈہ سکونت ورزید" (۱۱۷۱ھ)

صاحب "قصر والاجاہی" نے اس واقعہ کی شہادت ایک دوسرے واقعہ کے ضمن میں اس طرح دی
ہے کہ:-

"ہمگی فوج بندگان عالی متعینہ قلاع و مقامات کرناٹک سوای فوج مایحتاج
قلعہ نتھر نگر ہمراہ مسٹر کلیوس بسواری جہازات برائے مہم کلکتہ روانہ شدہ بود"

بہر نوع اب جبکہ ۱۱۷۱ھ کا زمانہ ہے دکن کی سیاسی حالت کا نقشہ یہ ہے کہ نواب صلابت جنگ
کی وجہ دربار آصفی میں فرانسیسی اثر بدستور باقی ہے جسے طرح طرح سے ہرج و مرج امور دربار
آصفی کا سبب بنا رہتا ہے۔ نواب حیدر جنگ فرانسیسی اثر سے قوت حاصل کرکے طرح طرح سے
فتنہ پردازی کرتے ہیں۔ بالآخر ان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ نواب نظام علیخان بہادر دربار کو فرانسیسی
مفاسد سے پاک کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ انجام کار بسے کو سکاکول میں مقیم ہو جانا پڑتا ہے۔ نواب
نجیب اللہ خان برادر نواب والا جاہ اپنے ایک دوسرے عزیز نواب محمد کمال کی بغاوت فرو
کرکے خود فرانسیسی جانب میلان دکھاتے ہیں۔ سارے پالیگاران و زمینداران کرناٹک نئی فرانسیسی
قوت سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اس اثنا میں انگریزی اور فرانسیسی جنگ ہفت سالہ کا سلسلہ
شروع ہوتا ہے۔ لامحالہ ان کے ہندوستانی مقبوضات میں بھی اس کا اثر رونما ہوتا ہے۔ ادھر

میسور میں نواب حیدر علی خاں کا راج شروع ہوتا ہے۔ مرار راؤ نواب حیدر علی خان کے پیشکار ہو جاتے ہیں۔ نواب رضا علی خاں فرزند نواب حسین دوست خان خون پدر کے دعوی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ قصہ مختصر بقول صاحب "تحفۃ الاخبار" "جمیع متمردان و مفسدان ملک کرناٹک از ہر چہار طرف سر کشیدہ و نواب صلابت جنگ جہتہ تائید فرانسیس تواکید جا بجا نوشتہ" بُسے سیکاکول میں بس تو جاتا ہے لیکن لشکر گراں بھی اس کے ساتھ ہے۔ قلعہ مدراس میں فوج کی قلت ہے۔ غرض یہ کہ "درآن اوقات طرفہ نیرنگی زمانہ و عجب بیداری چشم فتنہ بود کہ آئینہ تدبیر بوست، ہیچ اہل بصیرت نمی آورد و صورت خوبی و فلاح مشاہدہ کردہ نمی شد و از ہر طرف نائرۂ فتنہ و فساد مشتعل بود۔"

یہ حالت تھی جب کہ کونٹ لالی نے دیونام پٹن پر حملہ کیا تھا اور چینا پٹن پر حملہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ نواب رضا علی خاں کو کٹ پتلی بنانے کے لئے اس نے ان کو اپنے ساتھ کر لیا۔ لالی کا قبضہ جب دیونام پٹن پر ہو گیا تو اس مقام کے انگریز حکام نے چینا پٹن سے مدد منگوائی۔ اس کے بعد کا حال "تحفۃ الاخبار" میں یوں ظاہر کیا گیا ہے:-

"گورنر پیکٹ بدریافت مضمون خط از سبب قلت جمعیت و در پیش بودن مہم بنگالہ درجواب نولیسی متفکر و متحیر گشتہ مع جنرل لارنس و دیگر سرداران جہتہ تدبیر این کار مشکل پیش نواب والاجاہ فرا آمد و خط حارس دیونام پٹن گزرانید و گفت کہ قبل ازین قلعہ دیونام پٹن از انصرام امداد و اعانت خود بدولت از دست فرانسیس محفوظ و مامون ماند۔ حالا ہم ہمین توقع است کہ آن جناب اعانت فرمایند۔ نواب والاجاہ جواب فرمودہ پیش ازین از رئیس دکن اعانت معقول بہ ما شدہ بود اکنون کہ تمام فوج کرناٹک بہ انصرام مہم بنگالہ روانہ گردیدہ قوم فرانسیس در حقیقت رئیس دکن شدہ صلابت جنگ کہ فقط برائے نام و بزرگی است بہ تائید فرانسیس

می کوشد درین صورت من بنابر مددگاری شما مردم بدل حافہرام محض جہتہ اتمام
مہم بنگالہ دریں جا سکونت دارم ۔ درین وقت تدبیر کردن ضرور است ۔ کار جنگ
ومجادلہ نیست ۔"

نواب والاجاہ نے ترچناپلی اور چناپٹن کے قلعوں کو مضبوط کرنے کی رائے دی اور اس کی وجہ یہ قرار دی کہ :۔

"تاآن زمان کہ فوج ما از بنگالہ مراجعت کند و مارا قوت تامہ حاصل گردد یقین
می دانم کہ موسی بوسی با فوج دکھن وحیدر علی خان از طرف میسور آمدہ باموسیٰ لالی
شریک خواہند شد و نجیب اللہ خان برادرم و غلام مرتضیٰ خان وغیرہ وقلعہ داران
وزمینداران بہ موافقت فرانسیس جدوجہد می نمایند پس درین حالت بر آفت این
ہردو قلعہ بدست ما بہ مانند غنیمت باید دانست ۔"

ادھر[1] یہ گفت وشنید جاری تھی اُدھر لالی نے بعد فتح دیوتام پٹن مزید زر کی خاطر تنجاور پر حملہ کیا ۔ نواب والاجاہ نے چناپٹن سے امداد کے لئے سید مخدوم علی خاں کو روانہ کیا اور کچھ انگریزی فوج بھی روانہ کی ۔ لالی کو سخت شکست اٹھانی پڑی اور اس نے پھول چری کی جانب راہ فرار اختیار کی اب لالی نے دور و نزدیک جو فرانسیسی مقبوضات تھے وہاں سے فوج جمع کرنی شروع کی ۔ علاوہ برآن بسی بھی ۸ ہزار کی فوج کے ساتھ آکر شامل ہوگیا ۔ نجیب اللہ خان بھی اپنی جمعیت کے ساتھ نیلور سے پھول چری آئے ۔ غلام مرتضیٰ خان قلعہ دار ویلور نے رسد فراہم کی اور فوج بھی روانہ کی دوسرے قلعہ داروں وزمینداروں اور نیز حیدر علی خان اور مرار راؤ نے بھی تائید واعانت کے مراتب ادا کئے ۔

---

[1] ۔ یہاں سے تا آخر مضمون تحفۃ الاخبار سے ماخوذ ہے ۔

اس عظیم الشان تیاری کے بعد لالی نے فرانسیسی اقتدار و قوت کی نمائش شروع کردی؟ اس خیال میں تھا کہ اب ہندوستان جنت نشان میں فرانسیسی بختیاری اور کامرانی کی بنیادیں ہمیشہ کے لئے مضبوط ہو جائیں گی۔ تقدیر نے اس خواب کی جو تعبیر تیار کر رکھی تھی اس سے متوقعہ اور متحصلہ نتائج کا فرق ایک اور مرتبہ دنیا پر ظاہر ہو گیا۔

غرض لالی نے دھاوا بول دیا۔ ارکاٹ تک ملک پر قبضہ کرکے رضا علی خان کو حکومت دے دی۔ یہ دیکھکر محمد نجیب اللہ خان کہ خود امید وار تھے نیلور کو واپس لوٹ آئے۔ چاروں طرف سے قلعہ چناپٹن کو محصور کرنے کے لئے لالی نے فوج آگے بڑھائی۔ نواب والاجاہ بھی قلعہ میں چلے آئے۔ اور آخر کار قلعہ چناپٹن محصور ہو گیا۔ غضنفر علی خان۔ محمد ابرار خان اور جنرل لارنس انگریزی اور والاجاہی فوج کو لیکر قلعہ سے باہر آئے میدان جدال و قتال گرم ہوا۔ دست بدست لڑائی تک نوبت پہنچ گئی۔ فرانسیسی فوج ہار مان گئی۔ انگریزی فوج سے دو سو افراد اس معرکہ میں جان بحق ہوئے اور ۵۰ جوان مجروح۔ والاجاہی فوج کے تین سو افراد کام آئے نواب والاجاہ نے ساری انگریزی فوج کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ اس مہم میں قدم قدم پر نواب والاجاہ کی رائے پر انگریز حکام عمل کرتے تھے۔ گویا وہی کمانڈر ان چیف تھے۔

پہلے روز کی شکست کے بعد فرانسیسی فوج نے اپنی پوری قوت سے کام لینا شروع کیا محمد اسحاق خان فرزند نواب والاجاہ نے بھی مقابلہ میں اپنی جان دے دی۔ نواب والاجاہ اس غرض سے کہ ترچناپلی جاکر مزید تائید و اعانت کر سکیں اپنی ساری فوج قلعہ چناپٹن میں چھوڑ کر بذریعہ جہاز ناگ پٹن کو روانہ ہوئے اور وہاں سے ترچناپلی پہنچ گئے۔

ترچناپلی پہنچ کر ۵ سو فرنگی متعینہ قلعہ ترچناپلی۔ چار ہزار سوار خاص سید مخدوم علی خان کی زیر سرکردگی۔ (۷) ہزار مردم بار برخیلی سید ناصر علی خان توپین وغیرہ و نیز سامان جنس یہ ماتحتی امین بیگ خان۔ پیادہ ہائے کرناٹکی ۱۶ ہزار کی تعداد میں محمد بیگ خان کی زیر سرکردگی اور یہ

سارے لشکر کو محمد یوسف خان کمندان کے تفویض کر کے حکم ہوا کہ چتور سے عبدالوہاب خاں کو لیکر چناپٹن کی جانب کوچ ہو۔

چناپٹن میں یہ سارا لشکر آیا اور مقابلہ کے صف آرا ہوا۔ فرنگی کنڈہ میں میدان رزم گرم ہوا۔ قلعہ سے انگریزی فوج نے بھی نکل کر الگ ہلّہ کیا۔ غضنفر علی خان اور محمد ابرار خان زخمی ہوئے۔ بالآخر فرانسیسی فوج شکست کھا گئی۔ خستہ و شکستہ پریشان ہوگئی۔

اب لالی نے ہمراہیوں سے یہ کہہ کر کہ:۔

"من از حضور بادشاہ بوعدہ تقسیم و تسخیر ممالک ہندوستان دار شدم"

صورت حال کے متعلق مشورت طلب کی۔ قرار پایا کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔ چنانچہ فرانسیسی فوج کنجی کے طرف روانہ ہوگئی اور پھر وہاں تاب مقاومت نہ دیکھکر ارکاٹ کے جانب راہ فرار اختیار کی۔

اب بسے ادھونی میں نواب بصالت جنگ کی خدمت میں حاضر ہوا ان پر بسے کا افسون کارگر بھی ہوگیا۔ جوں ہی اس کی خبر نواب والاجاہ کو ہوئی انہوں نے

"نامۂ متضمن عدم اعانت فرقہ فرانسیس و شیوہ بے وفائی و نمک حرامی و سراب نمائی انہا و دغا کردن بالنواب ناصر جنگ شہید بہ طور دلچسپ و پسندیدہ بنام بسالت جنگ تحریر نمود"

خط دیکھکر نواب موصوف جو ادھونی سے نکل چکے تھے واپس ہوگئے لیکن بسے کی چالبازیاں ذوالفقار جنگ کے ساتھ چھ سات ہزار کی فوج کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔

اب اس داستان کا آخری باب تحریر ہوتا ہے اور وندواش کا فیصلہ کن معرکہ درپیش ہوتا ہے۔ محمد ابرار خان اور رارشد بیگ کی جانبازی نے قلعہ سر کر لیا اس پر ارکاٹ سے لالی روانہ ہوا۔ نواب عبدالوہاب خان کرنل کوٹ کو ہمراہ لیکر مقابلہ پر آئے محمد یوسف خان

نے کرنل کورٹ کے دوش بدوش داد جوان مردی دی۔ ذوالفقار جنگ مارے گئے۔ لیے گرفتار ہوگیا۔ لالی نے پہلے جینجی اور پھر پھولچری کی جانب راہ فرار اختیار کی۔ فرانسیسی بوالہوسی ختم ہوگئی۔ نواب عبدالوہاب خان نے نامۂ فتح نواب والاجاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ گورنر بکیٹ کو بھی اطلاع دی گئی۔

اس کے بعد اطراف ترچنا پلی میں چند اور بھی معرکے ہوئے۔ ہر جگہ فرانسیسی فوج کے قدم اکھڑتے ہی رہے۔

اب آخر وہ وقت آگیا کہ ہندوستان میں فرانسیسی اولوالعزمی پر خط باطل کھینچ جائے چنانچہ نواب والاجاہ خود پھولچری کی تسخیر کے لئے ۱۱۷۳ھ میں ترچنا پلی سے روانہ ہوئے راستہ میں انگریزی فوج کی مدد کے بغیر وردا چل اور کارے کال کا قلعہ فتح کئے۔ اسی طرح راستہ میں انتظام کرتے ہوئے چناپٹن میں آئے اور وہاں پھولچری کی فتح کے لئے انتظام کرکے ارکاٹ چلے آئے۔ کرنل کوٹ حسب الحکم نواب والاجاہ پھولچری روانہ ہوا۔ نواب حیدر علی خان کے پاس سے قدرے کمک فرانسیسی فوجوں کو حاصل ہوگئی۔ بالآخر خود نواب والاجاہ روانہ ہوئے نواب حیدر علی خان کے سردار مخدوم نایک نے فرار ہو جانا بہتر خیال کیا۔ ایک ماہ تک پھولچری کا محاصرہ جاری رہا۔ خود نواب والاجاہ فوج خاصہ کے ساتھ لڑائی میں برابر حصہ لیتے رہے۔ غضنفر علی خان اور محمد یوسف خان نے جو پامردی دکھائی اسکی کی بدولت شہر پھولچری پر علم والاجاہی نصب ہوگیا لالی ایک باغ میں پناہ گیر تھا اس کا محاصرہ کرایا گیا۔ لالی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن ابھی اطراف قلعہ پھولچری میں مدافعت کر ہی رہا تھا کہ خبر آئی کہ نواب محمد محفوظ خان نے پھر بغاوت کردی اور نواب حیدر علی خان اور نواب نظام علیخان کو ہموار کر رہے ہیں۔ میدان جنگ سے محمد یوسف خان کو ان کی تنبیہ کے لئے روانہ کیا گیا۔ لالی لڑتے لڑتے آخر قلعہ بند ہوگیا۔

اب نواب والاجاہ نے معافی عام کا اعلان کر دیا تھا کہ نواب رضا علی خان سے بھی جاگیر اور اعزاز و اکرام کا وعدہ ہوا۔ والدۂ رضا علی خان آئیں اور با اعزاز تمام چنا پٹن روانہ کی گئیں اور معقول وظیفہ مقرر کیا گیا۔ نواب رضا علی خاں کہیں چلتے بنے اور پھر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

قصہ مختصر لالی کے پاس سے پیغام صلح آیا اور قتل عام سے اماں چاہی گئی۔ صاحب تحفۃ الاخبار کا کہنا ہے کہ نواب والاجاہ کو صلح پسند نہ تھی لیکن کرنل کوٹ کی سفارش پر صلح منظور کی۔ وکلائے فرانسیسی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکم ہوا کہ قلعہ ترمیم نہ کریں۔ توپ و بندوق سر کریں اور ہر فرد سرکاری لشکر میں آکر قوت یکروزہ خریدے۔ اس کے بعد والاجاہی فوج نے قلعہ کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور وکلائے فرانسیس رخصت ہوئے۔ اب گورنر چنا پٹن بھی حاضر ہوئے۔ نہم جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ کو نواب صاحب نے قلعہ میں قدم رکھے۔ کلید ہائے قلعہ پیش کئے گئے۔ سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ لالی اور دی لیری قید کر لئے گئے اور علم والاجاہی قلعہ پھولچری پر بھی کھڑا دیا گیا۔ حویلی ڈو پلے پر پہنچ کر نواب صاحب نے اذاں دی اور دربار منعقد کر کے سب سے نذر لی۔ لالی اور دی لیری فرانس روانہ کر دیئے گئے قلعہ پھولچری منہدم کر دیا گیا نواب والاجاہ نے گورنر پجیٹ اور کرنل کوٹ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ :-

"قبل ازیں در زمانۂ ماضی حسب الامر والد شہید حفاظت قلعہ دیونام پٹن و استخلاص قلعہ چنا پٹن از دست فرانسیس بہ ظہور آوردم اکنوں بتدارک تسخیر قلعہ چنا پٹن قلعہ پھولچری بدست آوردم۔ این قلعہ بدوستان من اہل کمپنی برائے فوائد تجارت و ستائش بسرداران لشکر بہ جلدی محنت و مشقت بخشیدم چشم دارم کہ ہمیں سر رشتۂ اعانت فی ما بین شما مردم دا دا ولاد علی الدوام منتظم و مستحکم باشد ہر کہ ازین طریق انحراف ورزد از سلسلہ خود نہ باشد"

شاہ عالم کی خدمت میں ایک ہزار ایک سو اشرفی کی نذر بذریعہ کلایو گزرانی گئی۔ دربار ہند سے "امیر الہند والا جاہ" کا خطاب مرحمت ہوا۔

۱۱۶۲ھ سے ۱۱۷۰ھ تک یا فرانسیسی تمناؤں کو بر نہ آنے دینے کی کوشش کے زمانے میں ارباب کمپنی انگریز نے جس قسم کے مواعید کئے اس کے لئے چند مراسلات کے اقتباسات کی نقل پیش کی جاتی ہے[1]:—

(۱) مسٹر سانڈرسن گورنر مدراس نے ۲۴ر شعبان ۱۱۶۵ھ مطابق ۲۷ر جون ۱۷۵۴ء کو لکھا کہ:—

"درخاطر مبارک آن صاحب ثابت باشد کہ نیازمند شہ یک امور سرکار است بغیر از استرضائے آن صاحب ہیچ کار بہ عمل نہ خواہد آورد"

(۲) مسٹر پیکیٹ گورنر مدراس نے ۱۳ر ذی قعدہ ۱۱۶۹ھ مطابق ۵ر اگست ۱۷۵۹ء کو لکھا کہ:—

"انگریزاں ہمیشہ بہ خبرداری پرداختہ و خواہند پرداخت کہ استحکام حکومت سامی را بر پایہ قائمے تا بحدیکہ تواند محکم سازند"

(۳) مسٹر پیکیٹ گورنر مدراس نے ۱۱ر ذی حجہ ۱۱۷۲ھ مطابق ۵ر اگست ۱۷۵۹ء کو لکھا کہ:—

"آرزو و خوشی این جانب این است کہ آن صاحب بوجہ احسن بر مسند تحکم و تجمل و تفاخر بدستور عمل والد خود قائم شدہ ملک پایاں گھاٹ را تمام و کمال متصرف باشند و اہل کوہنی بہ قسمیکہ در سایہ حکام پیشین پیشہ تجارت با فنیت جاری

---

[1] از رسالہ نقول فقرات گورنران وغیرہ۔

می داشتند در سایہ عاطفت آن صاحب ہم اجرا دارند"۔

(۴) نقل فقرہائے خط گورنر پیکٹ وکونسل۔ ہشتم ذی قعدہ ۱۱۷۰ھ مطابق ۲۳ جون ۱۷۵۶ء۔

"مرقوم بود کہ اہل کوپنی بہ متاجران سرکار .... قلعہ دارن و پالیگاران رونباید داد در جواب آن این است کہ این امر را بخوشی دل قبول دارم و بہ ہیچ وجہ بالعکس منفعت سرکار کسے را رونہ خواہم داد بہ حمایت نخواہیم پرداخت مرقوم بود کہ بنام سرداران انگریز کہ در قلاع ہستند تاکیدات ابلاغ باید کہ درکارہائے ملک و قضایائے سکنہ مداخلت نہ کنند۔ در جواب آن این کہ این امر بخوشی دل قبول دارم و بموجب ایماے آن صاحب تاکیدات ابلاغ خواہد یافت۔ مرقوم بود کہ موافق درخواست نائب سرکار از اہل کوپنی مراتب معاونت متاجران بظہور رسد و در کوپنی بہ تعلقداران سرکار کارے تقرر نہ گردد۔ در جواب آن این است کہ اہل کوپنی بہ حسب اقتضائے کار موافق گفتہ نائب سرکار مدد و معاونت بہ عمل خواہند آورد و تعلقداران سرکار را در کوپنی کا نخواہد داد۔ مرقوم بود کہ آئندہ سوال وجواب با نواب صلابت جنگ بہادر و نظام علی خان بہادر و دیگر اعیان بہ تجویزان صاحب بہ عمل آیند در جواب این کہ بہ فضل الٰہی تی مابین آن صاحب و اہل کوپنی ہیچ جدائی متصور نیست تمامی امورات ملک سوال جواب با نواب صلابت جنگ و نظام علی خان بہادر وغیرہ .... بصلاح آن صاحب بہ عمل خواہد آمد کہ صلاح سامی را بر صلاح دیگران مقدم می دانند"۔

(۵) نقل خط گورنر پیکیٹ و کونسل بنام نواب بیگم شانزدہم ذی قعدہ ۱۱۷۳ھ مطابق غرۂ جولائی ۱۷۶۰ء۔

"اہلِ کوپنی کارہائے سرکار را موافق دل خواہ نواب صاحب بخوشی تمام قبول نمودند رونق امورات و متابعت بندگان نواب صاحب از دل و جان بخوشی می خواہند۔ اہلِ کوپنی را در کارہائے ملکی اصلا دخل نیست و نخواہند کرد و بہ عنایت ایزدی ریاست تمام کرناٹک بنام نواب صاحب و اولاد ایشان مستحکم و مضبوط تا قیام کوٹھی انگریز در ملک ہند و دکن و بنگالہ صورت قیام خواہد داشت اہلِ کوپنی در متابعت و امداد کارہائے کرناٹک ساعی و سرگرم ہستند و دوست سرکار دوست و دشمنان سرکار را دشمن تصور نمودہ اند و می نمایند و تمامی اہل کونسل اقرار نامہ این معنی نوشتہ دادہ اند"

اس طرح ان مواعید و مواثق کے بھروسہ پر ادھر فرانسیسوں کا قصہ یوں پاک ہوا تو ادھر کمندان محمد یوسف خان نے نواب محمد محفوظ خاں کو گرفتار کرلیا اور ان کو حاضر دربار والاجاہی کیا۔ نواب والاجاہ نے اپنے فرزند عمدۃ الامرا بہادر کو استقبال کے لیے روانہ کیا اور خود بھی کچھ دور جاکر بھائی کو لے آئے اور اپنا سر اُن کے قدموں پر رکھدیا کچھ عرصہ کے بعد نواب نجیب اللہ خان بھی دبا دیئے گئے۔ نواب غلام مرتضیٰ خان قلعدار ویلور بھی ختم ہوگئے۔ اس اثناء میں کمندان محمد یوسف خان نے بھی سر اٹھایا لیکن اب ان کا سر بھی تن سے جدا کیا گیا۔

جب اس طرح انریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو کرناٹک میں اپنا کوئی مدمقابل نظر نہ آیا تو ۱۱۷۵ھ میں جاگیر کے لئے درخواست پیش کی۔ "قصر والاجاہی" میں یہ درخواست

نقل کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ :۔

" در جلدوی جان فشانی وخون ریزی انگریزان کہ در جدال وقتال مخالفان این ملک بہ وقوع آمد اقتضائے ہمت وقدر شناسی والاآن است کہ چند قصبات متعلقہ ملک محروسہ سرکار بنام ارباب کمپنی اخلاص شعار کہ در ہر امر ممد ومعاون این دولتِ خداداد اند بطریق جاگیر تقرر یابد تا ہر آیند این معنی باعث ازدیاد اتحاد دوستان وموجب نام آوری ملازمان وشکر گزاری منصفان تواند شد "

چنانچہ جاگیر میں چار لاکھ ہون سالانہ کے ۱۵ تعلقے دیے گئے ان تعلقات میں چنگل پیٹ بھی شامل تھا۔ جاگیر ملنے پر جو اقرار کیا گیا وہ بھی " نصر والا جاہی " میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ :۔

" اقرار نامہ اہل کونسل بہ نواب صاحب عمدۃ الملک سراج الدولہ انور الدین خان بہادر منصور جنگ وبہ فرزندان ایشان ما اہل کونسل چنا پٹن نوشتہ می دہیم کہ ہمہ در اعانت کارہائے نواب صاحب شریک بودہ دشمنِ ایشان را دشمن ودوست ایشان را دوست خود دانیم وجمعیت ہزار فرنگی مع آتوا وا سباب آن بہ کمک نواب صاحب متعین داشتہ باشیم وہر کہ بہ مخالفت نواب صاحب واولاد ایشان در ملک کرناٹک ہنگامہ آرا شود اورا بہ تنبیہ قرار واقعی ازین ملک اخراج نمایم وزر قرض کمپنی وخرچ فوج کمکی متعینہ حال وآئندہ از محالاتیکہ در جاگیر کمپنی مقرر شدہ وصول کردہ بگیریم واز نواب صاحب واولاد ایشان گاہے درخواست آن نکنیم وتا زمانیکہ کمپنی انگریز قایم است ممد ومعاون بودہ دربارۂ قیام ریاست نواب صاحب واولاد احفاد ایشان

بجمیع وجوہ سعی بلیغ بکار بردیم و بہ ہمین اقرار نامہ بہ دستخط و مہر اہل کمپنی از
ولایت طلبیدہ می دہیم - این برائے آن نوشتہ شد کہ آئندہ کونسلیان
بندر چیناپٹن وغیرہ موافق مرقومہ کمک نواب صاحب و اولاد نواب صاحب
نمودہ باشند"

اقرار نامہ بمہر اہل کمپنی ولایت سے آیا اُس کو بھی "قصر دالا جاہی" میں بیان کیا گیا ہے
اس کا مطلب یہ تھا کہ :-

"از آنجا کہ از مدت مدید و عہد بعید فی ما بین آن خدایگان و ما یانکہ اہل
کوپنی ایم محبت و اتحاد معنوی متحقق است - درین ولا بواسطہ مستر بیکیٹ
بہادر گورنر معزول بندر چیناپٹن اسنا و تعلقات جاگیر مقررہ در نواح بندر
چیناپٹن بما خیر سگالان رسید و این مرحمت بے پایان و ہم قبول کردن آن
خدایگان اخراجات محاصرہ قلعہ چیناپٹن و پھولچری بہ ذمہ خود موجب
نشاط متوافر و شکر گزاری متکاثر گردید سپاس این موہبت کبری از حد تقریر افزون
و از دائرہ تحریر بیرون است فی الجملہ در مقابلہ این ہمہ مراتب قدر شناسی
و قدر دانی شکریکہ بر ذمہ ما ہواخواہان صمیمی و مخلصان قدیمی واجب بشود
غیر از استحکام مراتب اعانت دامی بان خدایگان نتوانند بود پیوستہ از روی
آن داریم کہ حتی المقدور در قیام ریاست آن خدایگان کہ بطنا بعد بطن و نسلاً
بعد نسلاً قایم و باقی باشد مدد و معاون باشیم از سبب حسن عاطفت و رافت آن
خدایگان و خلوص و دوستی و اخلاص گورنر بیکیٹ فوایدے کہ با اہل کمپنی دان
خدایگان رسید اظہر من الشمس است .... غرض حق سبحانہ تعالی
نواب صاحب خدایگان را با جمعیت و حکومت دائمی بر سر خلائق سلامت

دارد۔ بر اقرار و اعتراف خود بتاریخ غرہ ماہ جون سنہ ۱۷۶۴ء مطابق سی ام ذی قعدہ سنہ ۱۱۷۷ھ مُہر کلان خود را برین کاغذ ثبت کردیم“

اس داستان کا ایک حِصّہ یہاں ختم ہوجاتا ہے۔ آئندہ زمانہ میں عظمت انگلستان ہندوستان میں جس طرح مسلم ہوئی وہ اس داستان کا دوسرا باب ہے۔ کلایو کی بے مثال ہمت۔ عزم صادق فرزانگی اور تدبیر نے برطانیہ کی آئندہ برتری اور سرافرازی کے سامان مہیا کردیئے۔ مابعدارباب تدبر نے برطانوی سطوت کو کمال پر پہونچا دیا۔ اس سربلندی میں قدرت نے دوسرے ہندی ارباب ہمت کے ساتھ آل بوکرک پرتگالی اور ڈوپلے فرانسیسی کا نام لکھدیا تھا۔ فقط

محمد غوث

"ماخذ" کے متعلق مختصر نوٹ

(الف) "تحفۃ الاخبار" مؤلفۂ منشی غلام حسین خان ۱۲۳۴ھ م ۱۸۱۹ء میں یہ کتاب تالیف ہوئی ہے۔ مولف میر منشی دار الانشاء کمپنی تھے۔ پیش نظر جو نسخہ ہے وہ محمد بہاؤ الدین نے ۱۲۴۶ھ میں لکھا ہے۔ اور شرف الدولہ مرحوم (مدراس) کے کتب خانہ سے ہے۔

(ب) "قصر والا جاہی" مولفۂ مولوی محمد حسین۔ یہ میر منشی دربار والا جاہی تھے اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر واقعہ کے ساتھ وہ ساری اہم مراسلت بھی درج ہے جو سرکار والا جاہی اور ملازمان کمپنی میں ہوتی تھی۔

اس کتاب کا جو نسخہ پیش نظر ہے وہ کتب خانہ مولوی احمد علی مرحوم (مدراس) کا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ نسخہ مکمل نہیں ہے۔ ناقص الآخر ہے۔ ایک دوسرا نسخہ شہاب الدین صاحب (الکٹرو پلیٹنگ شاپ حیدر آباد دکن) کے پاس ہے۔ مولف ان کے دادا ہوتے ہیں۔ یہ نسخہ بھی اسی قدر ہے جس قدر کہ مولوی احمد علی مرحوم کے کتب خانہ کا نسخہ

کاتب کا نام درج نہیں ہے ۔ مولف کے حالات تذکرۂ گلزار اعظم مولفۂ نواب غلام محمد غوث خان مرحوم میں درج ہیں ۔

(ج) ۔ "توزک والا جاہی" مولفۂ برہان خان ہانڈی المتخلص بہ برہان کتاب ۱۱۹۵ھ میں تالیف ہوئی ہے اور حسب الحکم نواب والا جاہ بہادر لکھی گئی ہے مولف کے حالات تذکرۂ گلزار اعظم مولفۂ نواب غلام محمد غوث مرحوم میں درج ہیں ۔ کتاب کے دو۲ حصے تھے ۔ دوسرا حصہ مرتب نہ ہوا ۔ موجودہ حصہ فرانسیسی جنگوں کے حالات پر مشتمل ہے ۔ یہ کتاب پہلی دو کتابوں کے مانند نایاب نہیں ہے ۔ اس کا ایک بہترین نسخہ کتب خانہ عام اہل اسلام مدراس میں موجود ہے ۔ فی الوقت جو نسخہ پیش نظر ہے وہ مولوی حاجی عبد الرحمن صاحب منتظم مدرسہ محمدی رائی پیٹ مدراس کے کتب خانہ کا ہے اور ۱۲۸۸ھ میں لکھا گیا ہے ۔

(د) "رسالہ نقول فقرات خطوط گورنران و خطوط بادشاہ و کوپنی انگریز" یہ رسالہ دفتر والا جاہی میں تیار ہوا ہے ۔ ہشت ورقی چار جزو پر مشتمل ہے ۔ کاتب کا نام درج نہیں ہے ۔

پیش نظر نسخہ مولوی حاجی عبد الرحمن صاحب منتظم مدرسہ محمدی مدراس کے کتب خانہ سے ہے ۔

ان کتابوں کے علاوہ دفتر والا جاہی کے ان کاغذات سے بھی مدد لی گئی ہے جو مولوی حاجی عبد الرحمن صاحب کے پاس موجود ہیں یہ کاغذات اصلی دفتر والا جاہی سے متعلق ہیں مولوی صاحب کے والد شرف الدولہ بہادر بیتین یافتہ آخری نواب کرناٹک نواب غلام محمد غوث خان کے دربار میں ذمہ دارانہ خدمات پر مامور رہتے نیز مولوی صاحب کے دادا مولوی عبد الوہاب مدار الامراء بہادر نواب صاحب موصوف کے دیوان تھے ۔

مولوی عبدالوہاب مدار الامرا کے والد ماجد مولوی محمد غوث شرف الملک نواب عظیم الدولہ بہادر اولین پیشین یافتہ نواب کے دیوان تھے۔ علاوہ ازیں مولوی صاحب کے اور بھی اعزہ و اقارب و دیگر بزرگ کرناٹک و دکن میں ممتاز خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اس طرح مولوی صاحب موصوف کے پاس کچھ دفتر والاجاہی باقی رہ گیا ہے۔ مقالہ میں نواب والاجاہ کی جن یادداشتوں کا ذکر ہے وہ اسی دفتر سے حاصل کی گئیں ہیں۔ ان سب کے علاوہ محرّر کے دادا مولوی صفی الدین مرحوم اور والد مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کی یادداشتوں نے خضرِ راہ کا کام دیا ہے۔ محمد فاروق صاحب طالب علم بی۔ اے، نے توزک والاجاہی کے مطالعہ کے بعد ایک اقتباس کیا ہے وہ بھی پیش نظر رہا ہے۔ فقط۔

غزل

عالیجناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

اور کیا مجھ کو زبان سے کام لینا چاہئے
جس پہ دم نکلے اُسی کا نام لینا چاہیے

ہر قدم پر اس گلی میں صورتِ نقشِ قدم
بیٹھتے اُٹھتے ذرا آرام لینا چاہیے

میری نالے کا عوض میری فغاں کا انتقام
تجھکو مجھسے چرخِ نیلی فام لینا چاہیے

عشق نے اچھا دیا ہے یہ سبق ایثار کا
غیر کا بھی اپنے سر الزام لینا چاہیے

ناامیدی آرزوی وصل میں اچھی نہیں
کام ہمت سے دلِ ناکام لینا چاہیے

آپ پر قرباں ہی میری متاعِ زندگی
آپ سے اس چیز کے کیا دام لینا چاہیے

چھوٹ کر کُنجِ قفس سے سوچتا ہوں بار بار
ہی کہاں راحت کہاں آرام لینا چاہیے

پہلے دینا چاہئے لا کر جوابِ خطِ شوق
بعد کو ای نامہ بر انعام لینا چاہیے

جس میں نقشہ کیف کا اپنے نظر آئے عزیزؔ
مل سکے تو مول ایسا جام لینا چاہیے

شعر و شاعری

(ترجمہ از ہڈسن) سید شاہ محمد بی۔ اے (عثمانیہ)

شاعری کیا ہے؟ ۔ شاعری کیا ہے؟ اگر ہم سے اس کا فوری جواب طلب کیا جائے تو ہمارے لئے سینٹ آگسٹائن کی طرح یہ کہہ کر ٹال دینا غالبًا بہتر ہوگا ۔ " اگر سوال نہ کیا جائے تو مجھے بہت کچھ معلوم ہے لیکن تم پوچھتے ہو تو مجھے کچھ بھی نہیں معلوم " شعر کی خصوصیات کا ہمیں طبعًا احساس ہے لیکن اس کو صحیح زبان میں ادا کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے اور نہ میرے خیال میں مختلف زبانوں میں اہلِ تنقید نے اس کی جو متعدد تعریفیں کی ہیں اُن کا گہرا مطالعہ قاری کے لئے عملاً مفید ہو سکتا ہے ۔ مثال کے طور پر ہم بعض کا اندراج کرتے ہیں ۔

جانسن کہتا ہے کہ شعر " انشائے منظوم " ہے ۔ " اُس فن میں عقل و تخیل کے باہمی ارتباط کے ذریعہ صداقت کے ساتھ مسرت کو وابستہ کیا جاتا ہے " اور اس کی روح رواں قوتِ ایجاد " ہے ۔ ہل سوال کرتا ہے : " شاعری کیا ہے سوائے ان خیالات و الفاظ کے جن میں جوش بیساختہ طور پر متشکل ہوتا ہے ؟ " ۔ میکالے کے نزدیک ہماری

مراد اس فن سے ہے جس میں الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیا جاتا ہے کہ تخئیل سے داد
لیں۔ اور جس میں حسن کار   وہی کام الفاظ سے لیتا ہے جیسے نقاش
رنگوں کے ذریعہ کرتا ہے۔ کارلائل   کے فرمان کے مطابق ہم شاعری کو "سریلا
خیال" سمجھ سکتے ہیں۔ شیلی   کہتا ہے کہ اسے "تخیل کا عمومی اظہار" سمجھنا چاہیئے
ہیزلٹ   کے خیال میں وہ تخیل و جذبات کی زبان ہے۔ لی ہنٹ
کا بیان ہے کہ وہ "صداقت۔ حسن اور طاقت کے جذبہ کا اظہار ہے جس میں محسوسات کو
تخیل و تصور کے ذریعہ واضح کیا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔" کالرج   کے نقطۂ نظر
سے شاعری سائنس کے متضاد ہے اور اسکی غایت صداقت نہیں بلکہ مسرت ہوتی ہے۔
ورڈسورتھ   کے الفاظ میں وہ "تمام علم کی سائنس اور پاکیزہ
روح" ہے۔ میاتھیو آرنلڈ   کے خیال میں وہ "انسان کی مکمل ترین
زبان سے کچھ کم نہیں اور اسی میں وہ اظہار صداقت کے تقریبًا قابل ہو جاتا ہے۔" "شعر
زندگی کی تعبیر ہے مگر صرف ان حالتوں میں جو ایسی تعبیر کے لئے شاعرانہ صداقت و شاعرانہ حسن کے
کلیات کے تحت مقرر ہوں۔" ایڈگر ایلن پو   کے نزدیک وہ "حسن کی سریلی
تخلیق" ہے۔ ڈائل   کے خیال کے مطابق شاعری میں "موجودات و مشہودات
سے ہماری بے اطمینانی" کا اظہار ہوتا ہے۔ رسکن   کہتا ہے کہ اس میں "تخیل
کی مدد سے شریفانہ جوش کے لئے شریفانہ اسباب" فراہم کئے جاتے ہیں۔ پروفیسر کورٹ ہوپ
کا بیان ہے کہ یہ "منظوم زبان میں خیال اور احساس کے بجا اظہار
کے ذریعہ مسرت پیدا کرنے کا فن ہے۔" واٹس ڈنٹن   کے خیال میں
وہ "جوشیلی و سریلی زبان میں انسانی ذہنیت کے عمومی اور حسن کارانہ اظہار" کا ذریعہ
ہے۔

تعریفات کی یہ فہرست کئی صفحات تک بڑھائی جا سکتی ہے لیکن مندرجہ مثالیں ان مشکلات کی وضاحت کے لئے کافی ہیں جو ہر اس کوشش کے ساتھ دامنگیر ہو جاتی ہیں جو شعر کی تغیر پذیر زندگی کو منطقی ضابطہ کے فولادی رقوم میں مقید کرنے کے لئے کی جائے۔ تعریفات بالا اس سوال کے حل کرنے میں جداگانہ یا مجموعی طور پر کہاں تک ہماری ممد ہوتی ہیں اس کا فیصلہ خود قاری کر سکتا ہے۔ درحقیقت وہ سب ایمائی ہیں۔ لیکن ان پر تنقیدی نظر ڈالنے اور ان کا ایک دوسرے سے تقابل و توازن کرنے سے ہم کو چند مضطربانہ واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اپنی تقریظ کے لحاظ سے وہ سب پریشان کن ہیں کیونکہ مبحث کو مختلف نقاط نظر سے دیکھا گیا ہے۔ سچ پوچھو تو ان میں سے بعض پر "تعریف" کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ "شاعری" کی تعریف کرنے کے بجائے اس چیز کی تعریف کرتے ہیں جو عام طور پر "شاعرانہ" ہو۔ برخلاف اس کے ان میں سے دیگر نہایت محدود اور تنگ ہیں کیونکہ درحقیقت وہ شاعری کے کسی پہلو یا کسی نوع کے متعلق صحیح ہو سکتی ہیں جس سے غالباً صاحب قول کو ذاتی طور پر دلچسپی تھی۔ علاوہ بریں یہ تمام تعریفات اپنے بیان میں اصولی ہیں اور خواہ اُن کی فلسفیانہ قدر و دلچسپی کچھ بھی ہو وہ ہمیں ایک ایسے قطعہ پر چھوڑتی ہیں۔ جو حقیقی دنیا سے بہت دور ہے جہاں ہم مطالعۂ شعر و سخن کے وقت خود کو پاتے ہیں۔

شاعری کے چند خصوصیات

لیکن جمالیاتی نظریہ سے ہمیں واسطہ نہیں. متعلمین شعر و سخن کی حیثیت سے ہمارے لئے بہتر ہے کہ ابتداءً ضوابط اور تعریفات سے اور شعریت کے تصوری مقاصد سے جو ان کے تحت بالعموم کارفرما ہوتے ہیں زیادہ سروکار نہ رکھیں۔ تاہم شعر کی عام خصوصیات سے تھوڑی واقفیت ضروری ہے۔

اگر ادب ترجمانیٔ حیات کا نام ہے تو اس ترجمانیٔ حیات کی جسے ہم شاعرانہ کہتے ہیں کیا خصوصیات ہیں؟ اگر ہم لفظ "شاعرانہ" کے عام معنوں کو پیش نظر رکھیں تو اس سوال کا تشفی بخش جواب مل جائے گا۔ شاعرانہ سے ہماری مراد "جذباتی وتخیلی" ہے اور اسی مفہوم میں ہم اسے عام بول چال میں کسی شخص۔ کتاب۔ تصویر یا خیال کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پس حیات کی شاعرانہ ترجمانی سے مراد اس کے واقعات تجربات اور مسائل کی ایسی خاکہ کشی ہے جس میں جذباتی اور تخیلی عناصر غالب ہوں یعنی شاعری کا ایک مابہ الامتیاز یہ ہے کہ زندگی کے جن واقعات سے اس میں بحث ہوتی ہے وہ ہمارے احساسات وجذبات سے متعلق ہوتے ہیں اور وہ قوت تخیل کے ذریعہ نہ صرف موجودہ حقیقتوں کو تصوری بناکر پیش کرتی ہے بلکہ معدوم کو عدم سے وجود میں لاتی ہے یا بقول شیکسپیر "خیال عنقا کو مقام ومکان دیتی اور اس کا نام مشخص کرتی ہے" یہی وجہ ہے کہ مندرجۂ تعریفات میں شاعری کے جذباتی وتخیلی صفات پر زور دیا گیا۔ تخیل واحساس کے ذریعہ ترجمانی حیات کی حیثیت سے شاعری کا پورا مفہوم اس وقت واضح ہوگا جبکہ ہم آگے چلکر سائنس وشاعری کے روابط پر بحث کریں گے اور شاعرانہ صداقت کی خصوصیت سے واقف ہوں گے۔ فی الحال ہم ایک دوسرے پہلو پر غور کریں گے۔

شاعری حسن کاری کی ایک صنف کی حیثیت سے

جب ہم کہتے ہیں کہ شاعری میں تخیل واحساس کا غلبہ رہتا ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ حیات کی شاعرانہ خاکہ کشی کے وہ عمومی اور مستقل خصوصیات ہیں لیکن ہم ہرگز نہیں سمجھتے کہ محض ان کا وجود شعر کی بناوٹ کے لئے کافی ہے۔ بلاشبہ وہ اس کے اجزائے لاینفک ہیں، لیکن صرف یہی اس کے لوازمات نہیں کیونکہ اُن کا

وجود اس تحریر میں بھی ہو سکتا ہے۔ جسے ہم بالاتفاق "شاعرانہ نثر" کہتے ہیں اور جو نثر کے زمرہ سے محض اس وجہ سے خارج نہیں کی جا سکتی کہ اس میں یہ شاعرانہ اوصاف پائے جاتے ہیں اس مسئلہ میں عوام کا خیال ہمارے نزدیک بالکل صحیح ہے۔ بہت سے اشعار ایسے ہو سکتے ہیں جو خالصاً "نثری" ہوں اور بہت سی "نثر" ایسی ہے جو متمائز طور پر "شاعرانہ" ہوتی ہے تاہم شعر و نثر کے درمیان ایک ما بہ الامتیاز موجود ہے اس سے مراد یہ ہے کہ شاعری بحیثیت النوع حسن کاری کی ایک صنف ہے۔ اور وہ اس وقت وجود میں آتی ہے جبکہ تخیل و احساس کے شاعرانہ خصوصیات بیان کے ایک خاص قالب میں متشکل ہوں۔ چنانچہ شاعرانہ قالب منتقل طور پر کے دار زبان یا نظم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ہمارے پاس بلا جسم و قالب شاعری کے قلب و روح ہوتے ہیں محض وہی ہو تو اس کی لاش۔ اپنی زندہ ہستی کے لئے شعر میں ان دونوں اجزا کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اپنے جامع و کامل مفہوم میں شعر ان دونوں کے ارتباط کا نام ہے۔

شعر و نظم

اب ہم ایک معرکۃ الآرا مسئلہ کو لیتے ہیں کیونکہ اہل تنقید کی ایک جماعت ہمیشہ اس بات کی منکر رہی کہ شاعری کا صورت سے کوئی تعلق ہے۔ چنانچہ سر فلپ سڈنی تسلیم کرتا ہے کہ "شعرا کی بڑی تعداد نے اپنی شاعرانہ تخلیق کو تحریر کا وہ بھاری جامہ پہنایا جسے نظم کہا جاتا ہے" اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ نظم کی حیثیت محض "لباس" سے زیادہ نہیں۔ وہ ایک زیور ہے لیکن شاعری کا کوئی لوازمہ نہیں کیونکہ بہت سے برگزیدہ شعرا گزرے ہیں جنھوں نے کبھی نظم نگاری نہیں کی اور آج کل ایسے نظم نگاروں کی کثرت ہے جو کبھی شاعر کہلانے کے مستحق نہیں" غالباً بیکن نے بھی اسی خیال کو پیش نظر رکھکر یہ لکھا کہ "بناوٹ و تصنع جو اس کے نزدیک شاعری کا مخصوص وظیفہ ہے" نظم کی طرح نثر میں بھی" ہو سکتا ہے۔ اسی طرح

کالرج پُر زور الفاظ میں کہتا ہے کہ " اعلیٰ قسم کی شاعری نظم کے بغیر ہوسکتی ہے " اور اپنے دعویٰ کے ثبوت کے طور پر افلاطون اور جرمی ٹیلر کی تحریرات کو پیش کرتا ہے ۔ یہاں یہہ بات قابل یاد داشت ہے کہ ان تمام اقوال میں خیال اور طرز کے شاعرانہ خصوصیات کو اہمیت دی گئی اور شاعری کا حسن کاری کے صنف کے طور پر لحاظ نہیں رکھا گیا لیکن مخالف جماعت نے بھی غلطی کی اور ان کی جانب سے یہ جواب دیا گیا کہ دیگر خصوصیات سے قطع نظر باقاعدہ طور پر لَے دار زبان (نظم) شعر کا لوازمہ ہے ۔ چنانچہ لی ہنٹ لکھتا ہے :۔
" بعض لوگوں کا یہ اعتراض ہے کہ شاعری کے لئے نظم کی ضرورت نہیں اور نثر بھی اس کی عمدہ حامل ہوسکتی ہے .... میرے نزدیک یہ ایک فاش غلطی ہے ۔ راگ یا نظمیہ ہیجان کے لئے قابلیت یا عدم قابلیت شاعرانہ مضمون اور ناثرانہ مضمون میں فرق پیدا کردیتی ہے شاعری کے لئے نظم کا قالب نہایت ضروری ہے اور اس کے استدلال میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعرانہ اسپرٹ کی جامعیت اس کی طلب گار ہوتی ہے اور اس کے جوش ۔ حسن و طاقت کا دائرہ اس کے بغیر نامکمل رہتا ہے " اس بیان میں " قالب " پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا کیونکہ مصنف نے اس واقعہ سے چشم پوشی کی ہے کہ شاعری کی حقیقی اسپرٹ نظم کے آلہ کے بغیر اکثر جگہ عمدہ طور پر ادا کی گئی ہے ۔ ہمارے نزدیک زیر بحث اختلاف " شاعرانہ " اور " ناثرانہ " مضمون پر نہیں بلکہ ان " صورتوں " پر جن میں غالباً اول الذکر ادا ہوسکے ۔ چنانچہ اگر اسے نثر میں ادا کیا جائے تو بیشتر شاعرانہ ہوسکتا ہے ۔ لیکن صرف اس وقت جبکہ نظم میں ادا ہو وہ شعر کا اصلی جامہ پہنتا ہے ۔ اگر شاعری کو اپنے مواد
اور روح کے لحاظ سے سائنس کے متضاد و متقابل قرار دیا جائے
(جس پر ورڈسورتھ نے اور کالرج نے بجا طور پر زور دیا) تو اسے نثر سے بھی اپنی صورت کے لحاظ سے ممتاز ہونا چاہئے جو باقاعدہ لَے دار اور مسجع زبان پر مشتمل ہوتی ہے ۔

ہمارے خیال کو اہم تائید ایک باوقار نقاد سے حاصل ہوتی ہے۔ جسے اپنے عام اصولوں کے لحاظ سے غالباً ہمارا مخالف ہونا چاہیئے تھا۔ کارلائل کے خیال میں شاعر شاہد و عارف کے مترادف تھا اور ہم اس کی کئی تحریرات کو نثری شاعری کی شاندار مثالوں کے طور پر پیش کرسکتے ہیں۔ تاہم وہ صاف الفاظ میں لکھتا ہے۔ "شاعری کا قدیم اور عامیانہ امتیاز کہ وہ نظمیہ اور سُریلی ہوتی ہے۔ میرے نزدیک خاص وقعت رکھتا ہے" اسی طرح میا تھیو آرنلڈ اپنے اس نظریہ کے باوجود کہ شاعری ترجمانیٔ حیات ہے۔ "نظمیہ تخیلی پیداوار اور نثری تخیلی پیداوار کے بنیادی فرق" پر زور دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "لَے اور وزن" شاعری کی جامعیت و کمال کا ایک حصہ ہیں"۔

لَے کی غائت

شعری لَے کی غائت پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن مضمون اتنا وسیع اور نفسیاتی مسائل کی وجہ سے اتنا پیچیدہ ہے کہ یہاں تفصیلی بحث ممکن نہیں۔ سرسری طور پر چند باتوں کا ذکر کردیا جاتا ہے۔

اولاً اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ لَے دار اور سریلی صورت اور شاعرانہ مواد و تخیل میں محض اتفاقی رشتہ ہے تو نظم کی باقاعدہ بحر اور اس کا اتار چڑھاؤ شاعری کے اہم مددگار کا کام کرتے ہیں کیونکہ اس سے جمالیاتی مسرت میں بڑا اضافہ ہوتا ہے جس کی بخشائش شاعری کا ایک اہم وظیفہ ہے۔ یہ بات اتنی معروف ہے کہ اس پر اتنا اشارہ کافی ہے۔ جو لوگ شاعری سے حقیقی انس رکھتے ہیں تسلیم کریں گے کہ شاعری کے عطا کردہ تسکین میں شاعرانہ زبان کی معین اور باقاعدہ موسیقی کا ایک خاص حصہ ہے۔ درحقیقت اسی حیرت انگیز آلہ کے استعمال سے شعر اور مسجع نثر میں امتیاز پیدا ہوجاتا ہے اور آرنلڈ کے اتباع میں ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نظم "اس کے کمال کا ایک حصہ" ہے۔

نظم شاعرانہ احساس کے اظہار کا قدرتی اسلوب ہے

دوسری بات یہ ہے کہ نظم کو شاعری کے کمال کا ایک حصہ" اہم تر نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہیئے۔ وہ محض معین و مددگار نہیں بلکہ یہی وہ "صورت" ہے جسے شاعرانہ طبیعت بیساختہ طور پر اپنے ڈھلنے کے لئے تلاش کرتی ہے۔ اس طرح وہ شاعری کو ایک قدرتی اور موزوں ترین آلۂ اظہار فراہم کرکے مکمل کردیتی ہے۔ سل نے خوب کہا" از آدم تا ایندم تمام گہرے اور عمیق احساس خود کو لئے دار زبان میں ظاہر کرنے پر مائل ہوی اور احساس جس قدر عمیق ہوئے اسی قدر ممتاز اور موثق ہوگی۔ یہی نفسیات صداقت ہے جو شاعرانہ احساس اور نظمیہ زبان کے ہمہ گیر تعلق کی تہ میں کار فرما ہے۔ یہ اتفاقی رشتہ نہیں بلکہ علت ہے۔

ہیگل کا بیان ہے کہ کسی ادبی مضمون میں لے کا استعمال ہمیں ایک ایسی اعلیٰ دنیا میں پہنچاتا ہے جو نثری اور روزمرہ زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ہمارے فلسفی کے پیش نظر صرف وہ اثر تھا جو قاری پر نظم کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن اس کا ریار کث نہایت وسیع ہے اور اس کی شہادت ہم کو ایک جرمن شاعر کے بیان سے ملتی ہے جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نظم کے بجائے نثر کو استعمال کیا جائے تو خود شاعر پر کیا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ شلر نے ایکرتبہ گوئٹے کو لکھا: "میں اس سے پہلے صریحًا ناواقف تھا کہ شعر میں مواد اور صورت بہم کر کتنے وابستہ ہوتے ہیں لیکن جب سے میں نے اپنی نثر کو شعریہ لئے دار زبان میں منتقل کرنا شروع کیا ہے۔ میرے پاس مختلف اختیارات ہیں یہاں میں ان بہت سی حرکات کو استعمال نہیں کرسکتا جو نثر میں بالکل بجا نظر آتی تھیں اور جو تفہیم عامہ کے لئے جن کی موزوں ارگن نثر معلوم

ہوتی ہے) ضروری تھے۔ لیکن نظم تخیل کے اشارے کی طالب ہوتی ہے اور اسطرح مجھے اپنی طبیعت کو مجبوراً اپنی بہت سی محرکات ... شاعرانہ بنانا پڑا" اس بیان کی دلچسپی اس بنا پر ہے کہ اس میں شاعرانہ مواد اور نظمیہ صورت کے رابطہ کو غیر معمولی زاویۂ نگاہ سے دیکھا گیا عام طور پر ہمارا خیال ہے کہ شاعرانہ احساس اپنے اظہار کے لئے نظمیہ صورت اختیار کرتا ہے لیکن شِلّر کہتا ہے کہ شاعرانہ اسلوب کا بھی شاعرانہ اسپرٹ کے اکساؤ پر اثر پڑتا ہے اور وہ ہم کو ان دونوں کے گہرے تعلق کی طرف مائل کرتا ہے۔

ہم اعتراف کرتے ہیں کہ نظم کو اکثر مرتبہ خالص ناثرانہ خیال کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا۔ لیکن اس طرح نہیں ہونا چاہیے۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ بعض اوقات اعلیٰ جذباتی کیف اور تخیلی وجدان نثر میں ادا کیا گیا لیکن نثر اس کا موزوں ترین اور قدرتی قالب نہیں۔ نثر و نظم کے مناصب حقیقتاً متمائز ہیں اور ان کا امتیاز اتفاقی اور متنازعہ فیہ نہیں بدیہی ہے چنانچہ تمام حقیقی اشعار میں مواد اور صورت کا وہ اتحاد جس کا شِلّر نے ذکر کیا ہے اتنا منظم و مکمل ہے کہ ہم اس کے لازم و ملزوم ہونے کے ایقان پر مجبور رہیں۔

اب ہم اس مسئلہ پر دوسرے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں جو قاری کے لئے اہم ہے۔ وزن موسیقی کی طرح بہ حیثیت خود احساسات سے گہری اپیل کرتی ہے۔ الفاظ با قاعدہ لئے دار انداز میں دینا گویا ان کو کسی پوشیدہ فسوں کے ذریعہ ایک نئی اور زود رس جوشیلی قوت عطا کرنا ہے اور ان کو ایک خاص ایمائیت سے مملو کرنا ہے جس کے بحالت موجودہ وہ حامل نہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ متعلم کو چاہیئے کہ اس سوال کا حل کسی ماہر نفسیات کے سپرد کرے۔ اس کے نزدیک یہ ایک امر واقعہ ہے جو بڑی دلچسپی و اہمیت رکھتا ہے۔ اس کو غالباً یہ معلوم ہے کہ کسی اجنبی زبان کی نظمیں اس کے سامنے پڑھی جائیں تو اکثر اس کو اکسائنگی کبھی اس پر جنگی جوش اور کبھی غم آگیں رقت طاری ہو گی۔

اس سے وہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ وزن خیال کے جوشیلا بنانے کا موثر آلہ ہے اور وہ نظمیہ صورتیں جن میں شاعر قدرتی طور پر اور زیادہ موزونی کے ساتھ اپنے احساس کو ڈھالتا ہے قاری کے احساس ہمدردانہ ہیجان کے لئے سب سے زیادہ موثر ہوں گی ۔ جیمز مانٹگمری نے خوب لکھا :-

شاعرانہ طاقت ایک حد تک لے کے لطیف تغیرات پر منحصر ہے ۔ اس کا ثبوت اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ ملٹن اور شیکسپیر کی بہترین نظموں کو لیکر ممکنہ طور پر بلا تبدیلیٔ الفاظ نثر میں رکھا جائے ۔ یہ کوشش ایسی ہوگی جیسے قطرات شبنم کو یکجا جمع کیا جائے جو گھاس پات پر توموتی و گوہر کے مانند نظر آتے ہیں لیکن یکجا ہوکر پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں ۔ ماہیت اور عناصر وہی رہتے ہیں ۔ لیکن لطافت تابا کی اور حسن غائب ہو جاتے ہیں ۔

پس واضح ہو گیا ہو گا کہ نظم شاعری کی محض معاون یا اس کا رسمی زیور نہیں بلکہ شاعرانہ اسپرٹ کی زندہ پیداوار ہے اور عقل سلیم کا تقاضہ ہے کہ بہ حیثیت ایک فن لطیف کے اسے شاعری کی امتیازی اور بنیادی خصوصیت قرار دے ۔

(باقی آئندہ)

مزدور

(از نبی الحسن شمیم)

تیری ممنون ہی دنیا کی یہ ہل چل ساری | تیرا احسان ہی کہ نہریں ہیں عمل کی جاری
تیرے قربان کہ جب یا ملِ تدبیر ہوا | خانہ کعبہ تیرے ہاتھ سے تعمیر ہوا
تجھکو دیتی ہیں دعا مسلم و کافر دونوں | تیرے ممنون رہی مسجد و مندر دونوں
تجھسے معمور رہوی تہذیب کے سب گہوارے | تیری کاوش کا نتیجہ ہیں تمدن سارے
اپنی فطرت میں تکبر ہے یہ مجبوری ہے | ورنہ جو کرتے ہیں انسان وہ مزدوری ہے
تو نے فطرت کے ذخیروں پہ کیا ہی قبضہ | تیرے ہاتھوں ترقی کا اثر ہے پیدا
جوش ایثار کے راہوں میں دکھایا تو نے | اپنے مقصد کے لئے خون بہایا تو نے
موت سے خوف نہ اندیشہ ہے بربادی کا | اللہ اللہ یہ احسان ہے آزادی کا
اس غریبی پہ بھی تیرا ہے اثر لوگوں پر | آج بھی تیری حکومت ہے کئی ملکوں پر

تو نے دنیا میں کیا کام بہت کچھ لیکن | آریاورت میں بیدار تو ہوگا کس دن
فکر فردا نہیں عزت کا تجھے پاس نہیں | اپنی حالت کا یہاں کچھ تجھے احساس نہیں
ایسی محنت پہ بھی افلاس سے رشتہ جوڑے | تیری تقدیر میں لکھا ہے کہ پتھر پھوڑے

خود فراموش نہ بن، بندۂ زر[1] گھبرا کر
وقت آیا ہی تو کچھ جوش عمل پیدا کر

---

[1] اے گرفتار سرمایہ دار

آغاز شباب

از

جناب سید اکبر وفا قانی صاحب بی اے عثمانیہ

جس طرح سرما میں ہوا مرود گدرایا ہوا
جس طرح گرما میں ہو آموں کا بن چھایا ہوا

جس طرح نارنج ہوں باغوں میں شعلہ پیرہن
جس طرح ہو سیب سرخ و سبز اور نازک بدن

ہے یوں ہی ای جان جان تیری ادا ئیں بہار
کیوں جوانی پھر نہ ہو تیرے لڑکپن پر نثار

وہ صباحت میں ملاحت کی نمو جادو بھری
جوں شفق کے رنگ پر چادر ہو ہلکے ابر کی

آنکھ میں معصوم ہرنی کی ادا سوئی ہوئی
جس طرح ہو یاسمن شبنم سے منہ دھوئی ہوئی

پتلیاں تیری سیاہی میں جواب طور ہیں
کیا غضب ہے اس قدر ظلمت میں بھی پر نور ہیں

تیری نظروں سے شعاع بیگناہی جلوہ گر
جس کے نظارہ نے روشن کر دیے داغ جگر

رس بھری آواز تیری نغمۂ داؤد ہے
جس کے زیر و بم میں میرے دل کی ہست و بود ہے

قہقہ کی گونج تیری قلقل مینا میں ہے
ربابِ رنی کی صدا اس طور سے سینا میں ہے

ماہ کی تنویر ہی تالاب کے رخ پر حسین
رقص کرنوں کا فرازِ کوہ پر ہے دل نشین

صبح کی شبنم ایاغ گل ہیں مئے آشام ہے
گلستانِ آسمان ہر روز صبح و شام ہے

تیرے نظارہ میں لیکن محو ہو جاتا ہوں میں
حسن کے معصوم منظر میں خدا پاتا ہوں میں

تقدسِ گناہ

(۱)

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

وہ خوبصورت تھی۔ یہ اُس کا گناہ نہ تھا۔

ایک مصور کوئی شاہکار تیار کرتا ہے اور اُس میں اپنی روح کا عکس پاتا ہے تو اُس شاہکار کو سنبھالتا ہے۔ اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، وہ بھی مصورِ ازل کا ایک شاہکار تھی۔ اگر مصور نے اپنی شاہکار کو غفلت سے پھینکدیا تو خطا تصویر کی تھی ــــ یا مُصوّر کی؟

بیرسٹر کلیم کی نہایت نفیس اقدارات کوٹھی کے سامنے اُن کی موٹر آکر رُکی۔ وہ اُترے اور پھر اندر گئے۔

"ریحہ........ ریحہ........ بیٹی ریحہ کیا کر رہی ہو"

ان الفاظ کے ساتھ بیرسٹر صاحب مکان میں داخل ہوئے اور اکلوتی لڑکی کو پکارنے لگے۔

رقیہ ریحانہ، اُن کی خوبصورت سیزدہ سالہ لڑکی نے اپنے کمرے سے جواب دیا "کچھ بھی نہیں۔ ابا جان .... پڑھ رہی ہوں۔

"کیا پڑھ رہی ہو بیٹی" بیرسٹر صاحب مسکراتے ہوئے ٹوپی ہاتھ میں لئے ہوئے اپنی بیٹی کے کمرہ کے اندر پہنچے۔ ریحانہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ انھوں نے اُس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اس کی طرف محبت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ بیٹی پہلے نیچے دیکھنے لگی۔ پھر نظر اٹھا کے باپ کے ہنستے ہوئے خوبصورت چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر شرمائی ہوئی نظروں سے کتاب کی طرف اشارہ کرکے کہا "آج کا سبق یاد کر رہی تھی"۔

"شاباش بیٹی شاباش۔ خوب دل لگا کر پڑھو"۔ بیرسٹر صاحب نے اُس کے سر کے سنہرے بالوں پر دوبارہ ہاتھ پھیرا۔ اُن کی انگلیاں اپنی نورنظر لڑکی کے بالوں میں ایک لرزش سے حرکت کر رہی تھیں۔ دنیا میں اس کے سوا کوئی ان کا نہ تھا۔

بیرسٹر کلیم لکھنؤ کے نہایت ممتاز بیرسٹروں میں سے تھے مگر ان چند بے فکروں میں سے جن کی آمدنی ہر صورت میں خرچ کی بہتات کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ اور اس کا نتیجہ تھا کہ بے ٹھاٹ قرض لیتے اور ادا کرتے جاتے۔ جائداد کی قسم سے صرف ایک کوٹھی تھی جس میں رہتے تھے اور بس

تین سال گزر گئے۔ ریحانہ اپنی زندگی کے سولھویں سال میں قدم رکھ چکی تھی۔ باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ ماں کا نہایت کمسنی میں انتقال ہوگیا تھا۔ باپ نے بہت بہتر تعلیم دلائی تھی۔ اب وہ تھابرن کالج میں پڑھ رہی تھی۔

بیرسٹر صاحب ایک مقدمے کی پیروی میں الہ آباد گئے۔ ریل پٹری پر سے اُتر گئی مقتولین میں اُن کا بھی نام تھا۔ اب دنیا میں ریحانہ کا کوئی نہ تھا۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا سین تھا۔

(۲)

مارا دیارِ غیر میں مجھکو وطن سے دور
رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

بیرسٹر صاحب کا مکان قرضخواہوں کے نظر ہوا۔ سامان نیلام کیا گیا۔ غریب ریحانہ کا ہمدم و دمساز اب کوئی نہ تھا۔ وہ تھی اور یہ دنیا۔ جس طرح کوئی کشتی ایک بحرِ ذخار میں چھوڑ دی جائے اور ساحل ہزاروں میل دور ہو۔ اُسی طرح وہ اس انسانوں کی دنیا میں اکیلی تھی۔ کوئی دلاسا دینے والا تک نہ تھا۔ کوئی بات کیا پوچھتا۔ جب مصیبتوں کا ہجوم ہوتا ہے تو اپنی ہی عقل کام آتی ہے اُس نے خیال کیا بہتر یہی ہے کہ لکھنؤ چھوڑ کر کہیں دور نکل جاؤں اور پڑھانے کی نوکری کروں۔ سب سے پہلے اُس کے ذہن میں حیدرآباد کا نام آیا اور وہ چند روپے لیکر جو اس کی ایک فیاض سہیلی نوشابہ نے اُس کے سفرخرچ کے لئے مہیا کر دیئے تھے۔ وہ حیدرآباد پہنچی۔ نوشابہ نے اُسے بیگم حیات جنگ کے نام ایک خط اپنی والدہ کی طرف سے لکھوا دیا تھا۔ اس خط کو دیکھکر بیگم حیات جنگ اُس سے مہربانی سے ملیں۔ اور اُس کی کمسنی کے باوجود اپنی چھوٹی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اُس کو نوکر رکھ لیا۔

اس بعد کے واقعات ان خطوط سے معلوم ہو سکتے ہیں جو ریحانہ نے نوشابہ کے نام لکھے۔

(۳)

پہلا خط

نوشابہ پیاری۔ اب بھی اب بھی تم مجھے یاد کرتی ہو۔ اُس

رسوائے زمانہ ہستی کو جس کو دنیا حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اب بھی تم اس کو خط لکھتی ہو۔ تم مجھے پیاری ریحانہ لکھتی ہو۔ تم لکھتی ہو کہ اب بھی تمہیں میری حالت پر ترس آتا ہے۔ نوشابہ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ کم از کم دنیا میں تم تو موجود ہو جس سے میں اپنے دل کی باتیں، دل کے راز بیان کرسکتی ہوں۔ دل کی بھڑاس نکال سکتی ہوں۔ تم مجھے پوچھتی ہو میں نے اپنی کیا گت بنائی ہے .... ہاں ٹھیک ہے میں نے ہی اپنی گت بنائی ؟ ...... میری نوشابہ میرا دل بھی چاہتا ہے کہ تم ہو تم سے لپٹ کر روتی، خوب روتی، ہچکیاں لیتی، دل کی بھڑاس نکالتی۔ کیونکہ نوشابہ میری نوشابہ میں نے خود نہیں۔ آسمان ظالم آسمان نے میری یہ گت بنائی۔

میں حضرت آدم و حوا کی سچی بیٹی ہوں۔ نوشابہ۔ اسی وجہ سے دنیا مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ آسمان سے وہ دونوں گناہگار نکالے گئے۔ اُن کا قصور کیا تھا۔ جب خدا نے منع کیا تھا کہ پھل نہ کھاؤ تو خدا نے شجر ممنوع کو وہاں رکھا کیوں ؟ اور پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا ہی نے شیطان کو اسکی اجازت کیوں دی کہ وہ اُن کو بہکائے ؟ اور جب انھوں نے گناہ کیا تو سزا اُن بیچاروں کو دی گئی۔ حالانکہ وہ گناہگار، ناکردہ گناہ تھے۔

نوشابہ یہ نہ سمجھنا کہ میں خدا کو الزام دیرہی ہوں۔ نہیں۔ اب بھی میں اُس کو مانتی ہوں مگر اب اُس سے ڈرتی نہیں۔ اُس سے محبت کرتی ہوں۔ اُس کی بعض بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ مثلاً یہی آدم و حوا کا قصہ تو میں یہ کہہ کر چپ ہو جاتی ہوں کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

اچھا نوشابہ سنو۔ میں تم کو قصہ سناتی ہوں کہ میری یہ گت کیسی بنی۔ سنو مجھ سے نفرت نہ کرنا۔ میں انسان تھی۔ کمزوری میری سرشت میں فطرتاً داخل تھی میں حیات جنگ کی لڑکیوں کو پڑھاتی تھی۔

حیدرآباد کے طبقہ رؤسا کی خصوصیتیں تم کو معلوم ہی ہوں گی۔ بہر حال ان میں سے اکثر و بیشتر خرابیاں حیات جنگ میں بھی پائی جاتی تھیں۔ ہندوستان بھر میں عام طور پر مسلمان اُمرا اس قسم کی خرابیوں کا شکار ہیں۔ طرح طرح کی تعیشات میں مبتلا ہیں۔ میں جب لڑکیوں کو پڑھاتی ہوتی تو اکثر وہ اندر آجاتے اور جب کوئی نہیں ہوتا تو میری طرف اس قدر بھری بھری للچاتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے کہ میں شرم سے عرق عرق ہو جاتی میرا چہرہ سُرخ ہو جاتا اور دل ہی دل میں میں اپنی قسمت کو کوستی اور اکیلے میں ایک دو آنسو بہا لیتی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ بیگم حیات جنگ، قیصر جنگ کے یہاں دعوت میں مع لڑکیوں کے گئی ہوئی تھیں۔ میں گھر میں اکیلی تھی۔ چند مامائیں اور تھیں۔

حیات جنگ اندر آئے۔ اور مجھے دیکھا، اُسی طرح حریفانہ شرارت آمیز نظروں سے اُن کو خوب موقعہ ملا تھا۔ وہ جھپٹ کر اپنا بالائی ہونٹ چباتے ہوئے بڑھے اُن کی ہر حرکت سے ایک بہیمیت ظاہر ہو رہی تھی میں بھاگی اور وہ میرے پیچھے دوڑے۔ میرا اُن کا کیا مقابلہ۔

نوشابہ۔ میں بے بس تھی۔

نوشابہ۔ اُس وقت تمہارا خدا کہاں تھا۔ اُس وقت خدا کیا کر رہا تھا؟ سو رہا تھا؟ سوچ رہا تھا؟ کسی اور کام میں مصروف تھا؟ اُس وقت اُسے اس کا احساس نہیں ہوا کہ ایک شریف خاندان بیکس، یتیم لڑکی کی عزت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاک میں مل رہی تھی۔

اب میں سادی۔ ناتجربہ کار دوشیزہ نہ تھی۔ اب مجھے ہوش آچکا تھا۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ میں نے سارا قصہ من و عن بیگم صاحبہ سے بیان کر دیا۔ اُن کو کچھ غصہ آیا، اور کچھ میری حالت پر ترس آیا۔ میں اب ایک دن بھی اُس گھر میں ٹھیر نہ سکتی تھی۔ اس نیک دل

خاتون نے مجھے کچھ دلاسا دیا۔ کچھ نقدی دی۔ اور میں وہاں سے چلی آئی۔

نوشابہ یہ میرا گناہ نہ تھا۔

میں ناکردہ گناہ تھی۔ مگر دنیا اب بھی مجھے گنہگار ہی سمجھتی رہی۔

میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ میں نے خدا کا کیا نقصان کیا تھا۔ پھر خدا نے کیوں اس کو گوارا کیا کہ ایک روح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گمراہ ہو جائے۔

میں ریل میں بیٹھی غور کر رہی تھی۔ اب میں کیا کروں گی۔ دنیا نے مجھے تکلیف دی تھی میرے دل میں انتقام کا شعلہ بھڑکا۔ میں دنیا کو تکلیف دوں گی۔ ہر قسم کی تکلیف ...... اور اس طرح میں اپنے خدا سے انتقام لونگی۔ اور زیادہ بدنام ہو جاؤں گی' اپنے آپ کو فنا کر دونگی اپنی زندگی کو خاک میں ملا دونگی مگر انتقام ...... سخت ...... سخت ...... انتقام لوں گی۔ اور ہزاروں کو تباہ کر دوں گی۔ خود تباہ ہو ہی چکی ہوں اور سب کو ..... جس سے مجھے سابقہ پڑیگا ہر طرح سے تباہ کر دنگی۔

اب آج سے میں رقیہ ریحانہ کی زندگی کا باب ختم کرتی ہوں اور آج سے میں ریحانہ جان بنتی ہوں۔ خدا نے اگر مجھے خوبصورت بنایا تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟ پھر مجھے، میری خوبصورتی کی سزا کیوں ملی؟ اچھا تو میں اپنی خوبصورتی کو اپنے انتقام کا آلۂ کار بناؤنگی۔ میری دوشیزگی تباہ ہو چکی ہے۔ میں اپنے حسن سے دوسروں کی زندگیاں اور روحیں تباہ کر کے خود اپنے حسن کو بھی فنا کر دونگی۔

میں فنا ہو چکی ہوں۔ میری روحانی زندگی ختم ہو چکی ہے۔ جب سے میرے خدا نے مجھے چھوڑ دیا میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ تاہم اب بھی میں اُسے بہت چاہتی ہوں اس کی محبت کو اپنے دل سے نکالنا چاہتی ہوں مگر نہیں نکال سکتی۔ روحانی زندگی کے خاتمے کے بعد میں نے اپنے خوبصورت جسم کو ایک گوشت کے لوتھڑے کی طرح چند کتوں کے سامنے ڈالدیا ہے

تاکہ وہ میرے لئے آپس میں لڑیں، لہولہان ہوں اور جب مجھے کھائیں تو وہ سمیت جو میری روح کو مار چکی ہے اُن کو بھی فنا کردے۔

کلفت افسردگی کو عیش بے تابی حرام ؎ ورنہ دندان در دلِ افشردن بنائے خندہ ہے

تم نے میرے خط کا اتنا محبت بھرا جواب دیا۔ میری نوشابہ تمہارا شکریہ کس زبان سے ادا کروں! تم نے مجھے کم از کم اس نظر حقارت سے نہ دیکھا جس سے دنیا دیکھتی ہے۔ تم اور صرف تم ہی مجھے کچھ سمجھ سکیں۔ کبھی کبھی مجھے یاد کرلیا کرو۔

تمہاری ریحہ

(۴)

میری پیاری نوشابہ۔ تمہارا خط میرے ہاتھ میں ہے۔ میں کبھی اُسے پڑھتی ہوں کبھی روتی ہوں اور روتے میں مسکرانے لگتی ہوں اور پھر تمہارے محبت بھرے خط کو کبھی اپنے لبوں سے اور کبھی اپنے آنکھوں سے لگاتی ہوں۔ میری نوشابہ تم گھر میں شرافت سے آرام سے زندگی بسر کررہی ہو خدا تمہارے آرام و آسائش میں برکت دے۔ مگر پھر بھی اس آرام و آسائش کے باوجود تم اپنی بچپن کی سہیلی کو نہیں بھولیں جس نے اپنے آپ کو گمراہ کرلیا تاکہ دوسروں کو گمراہ کرے۔

میری نوشابہ۔ تم مجھے تلقین کرتی ہو کہ اپنی زندگی کو خلق خدا کے بہکانے میں صرف نہ کروں۔ غالباً تم کو یہ خیال ہوا کہ میں نے محض عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے لئے یہ رسوائی اور بے شرمی کی زندگی اختیار کی۔ میری نوشابہ میں تم کو پہلے ہی خط میں لکھ چکی ہوں کہ میں نے یہ زندگی عیش و عشرت کیلئے اختیار نہیں کی۔ میں اس زندگی میں جو روحانی تکلیفیں برداشت کرتی ہوں میرا ہی دل جانتا ہے۔ بیشک میرے لئے زندگی

زندگی بسر کرنے کے اور بھی بہت طریقے تھے۔ میرے سامنے موت کا کھلا راستہ موجود تھا۔
میں خودکشی کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا کی مصیبتوں سے نجات پا سکتی تھی۔ لیکن
تو شاید میں دنیا سے انتقام لینا چاہتی تھی، میں بے گناہ تھی اور مجھ پہ وہ ظلم کیا گیا جس سے
بڑھ کر کوئی اور ظلم ایک شریف لڑکی پر نہ ہوسکتا تھا میں نے اس ظلم کا، اس نا انصافی کا بدلہ
لینا چاہا۔ اور اس خواہش انتقام نے مجھ میں زندگی کی ایک ناقابل بیان، ناقابل اظہار
خواہشیں پیدا کردی۔ دنیا جسے زندگی کہتی ہے، وہ زندگی بسر کرنا میرا فرض تھا حالانکہ میری
ہستی کا، میری ہستی کی روحانی دلکشیوں کا خاتمہ ہوچکا۔

دنیا سمجھتی ہے کہ میں زندہ ہوں۔ اور دنیا ٹھیک کہتی ہے۔ لیکن میرے احساسات
لطیف، اور پاک جذبات۔ معصوم تمنائیں سب فنا ہوچکے ہیں۔ میری زندگی، یوں کہو کہ
ایک بجلی تھی، جس کا فضائی نور غائب ہوچکا، جو ایک مکان پر گری اور اُسے جلا گئی، اب
اسی جلے ہوئے مکان میں چند شعلے بھڑک رہے ہیں۔ لیکن ان شعلوں کو اُس فضائی
خیال آرا بجلی کی چمک سے کیا نسبت ؟

میرے دل میں جو آگ بھڑک رہی تھی وہ بجھ چکی ہے۔ اب چند شعلے جو بھڑک رہے
ہیں، اس دنیا کو جلانے کے لئے ہیں، حالانکہ میں جانتی ہوں کہ یہ شعلے مجھے سب سے زیادہ
نقصان پہنچائیں گے۔ مگر میں اپنے کو تو ایک ہستی موہوم سمجھتی ہوں۔

سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

رُوسا، اُمرا کی موٹریں، آکر میرے دروازے کے سامنے رُکتی ہیں۔ سب آپس میں
ایک دوسرے سے میرے لئے لڑتے ہیں۔ ہر ایک اپنی دولت قربان کرتا ہے۔ میری وجہ
سے بہت سے شریف خاندانوں کے لڑکے برباد ہوچکے۔ بہت سی جائدادیں تباہ ہوچکی ہیں

میرا انتقام کامیاب ہوتا جا رہا ہے۔

انسان کی وہ فطری کمزوری، جس کو تم نیکی اور خدا ترسی کہتی ہو۔ اب مجھ میں باقی نہیں رہی۔ جب تک مجھ میں یہ کمزوری باقی تھی۔ میں نقصان اٹھاتی رہی۔ میں نے اس کمزوری کو چھوڑا، اور اب مجھے وہ روحانی تکلیفیں نہیں ہوتیں۔ تم کو یاد ہو گا بچپن میں میرا دل کس قدر کمزور تھا........ اب مجھے ہنسی آتی ہے۔ تم اس کو سیاہ دلی کہو گی .... یہ بھی میرا قصور نہیں مصیبتوں نے مجھے ایسا بنا دیا۔

میں نے لکھا تھا کہ میری ہستی فنا ہو چکی ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرا دل مرجھا چکا ہے۔ میری آرزوئیں، تمنائیں فنا ہو چکی ہیں۔ لیکن اب بھی مجھ میں قوتِ احساس کا وجود تھوڑا بہت باقی ہے۔

ایک دولتمند ساہوکار آتا ہے، موٹا جسم، چیچک کے داغ، سیاہ جسم، چہرے سے زیادہ روح کا رنگ سیاہ اور مجھے اپنی آغوش میں گھسیٹتا ہے۔ میرے لبوں کو، رخساروں کو چومتا ہے، اور میں اس طرح ساکت وصامت رہتی ہوں جیسے کوئی مرمریں مجسمہ۔ اس کے پنجے سے چھوٹنے کے بعد گھنٹوں روتی ہوں۔

بعض بے فکرے نوجوان آتے ہیں۔ گانا سنتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔ مذاق کرتے ہیں اور پھر میں یہ بھی برداشت کرتی ہوں۔ اُن کے ساتھ ہنستی ہوں، بولتی ہوں، باتیں کرتی ہوں، وہ لوگ چلے جاتے ہیں اور پھر گھنٹوں سوچتی ہوں۔

بعض حساس، نوجوان شعرا آتے ہیں۔ گانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ میں گاتی ہوں وہ سر دھنتے ہیں میں اُن کے سر دھننے پر ہنستی ہوں۔ میری موسیقی بے روح ہے، اُس پر سر دھننا حماقت ہے۔ پھر وہ میری تعریف میں نظمیں لکھتے ہیں۔ سرد آہیں بھرتے ہیں مجھے نصیحتیں کرتے ہیں۔ میں اُن کے سامنے، اور اُن کے پیچھے خوب ہنستی ہوں۔ کیونکہ پھر جب

کسی اور خوبصورت عورت کو دیکھتے ہیں تو اس سے زیادہ جھوم جھوم کر نظمیں لکھتے ہیں۔ اور اور تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ ہے وہ دنیا جس میں، نوشابہ میں زندگی بسر کر رہی ہوں۔ میرے لئے اب کوئی مصیبت باقی نہیں رہی۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

لیکن کبھی کبھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب میں بوڑھی ہو جاؤنگی تو کیا ہوگا؟ مگر پھر مجھے تسکین ہو جاتی ہے۔ ابھی تو میری عمر ہی کیا ہے اس کے علاوہ میں برابر کچھ نہ کچھ پس انداز کرتی رہوں گی۔

اس طرح میں اُس خدا سے الگ ہو کر جو غریبوں کی مدد نہیں کرتا، جو بیکسوں اور مظلوموں کو نہیں بچاتا، اپنی مدد آپ کر رہی ہوں۔ اور کم از کم مجھے ایک اطمینان حاصل ہے۔ حیات بعد الموت کی میں نہ پہلے کبھی قایل تھی اور نہ اب ہوں۔

باوجود اس قدر مردہ دلی اور بدبختی اور روحانی کرب کے۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

پیاری نوشابہ کی پیاری۔

ریحانہ



(۵)

آخری خط

نوشابہ آج میں تم کو آخری خط لکھتی ہوں۔ پھر کبھی تم کو مجھ سے رشتہ باقی نہ رہیگا میں تمہارے لئے صرف ایک گزرتا ہوا خیال بن جاؤنگی اور بس۔ مجھے فرصت نہیں کہ بہت کچھ

لکھوں، اپنے دل کی بھڑاس نکالوں۔ صرف اجمالی حالت لکھتی ہوں۔

ایک شام کو میں خود موٹر چلا کر رہی تھی۔ اور شہر کے ایک بے رونق اور پست حصے سے گزر رہی تھی۔ مغرب کا وقت تھا۔ سڑک کے موڑ پر ایک چھوٹی سی مسجد میں نمازی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو رہے تھے۔

میری روح میں اس قدر صنم پرستی داخل ہو چکی تھی کہ اب یہ سادہ عبادت مجھے کسی قدر عجیب معلوم ہوئی۔ اب تک میں اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ کیونکہ میں دیکھتی تھی کہ عبادت کرنے والے، پس پردہ، کیسی کیسی سیاہ کاریاں کرتے تھے۔

میں نے موٹر کی رفتار بہت کم کر دی۔ یہ نمازی گندم نما جو فروش دنیا کو دھوکا دینے والے لوگ نہ تھے۔ اس چھوٹی سی مسجد میں غریب، مفلوک الحال بندگانِ خدا جمع تھے۔ جن کے چہرے سے، جن کے لباس سے، افلاس و نکبت کا اظہار ہو رہا تھا، اس کے باوجود وہ اپنے خالق کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

میں نے موٹر روک کی اور امام کی آواز سننے لگی۔ اس سادہ آواز میں جو خدا کے کلام کو دہرا رہی تھی ایک خاص اثر تھا۔ اس طلسمی اثر نے مجھے مسحور کر دیا۔ آواز سے زیادہ اس سادگی، اس خلوص، اس انہماک کا مجھ پر اثر ہوا جو یہ غریب اور دنیا کی نظروں میں ذلیل انسان اس صداقتِ قلب سے ظاہر کر رہے تھے۔

ان میں سے سب کے سب مجھ سے زیادہ ستم رسیدہ، مجھ سے زیادہ مظلوم تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے لئے ایک جائے پناہ تھی۔ جب دنیا ان کو تکلیف پہنچاتی تو خدا کے رحمت کے خیال میں وہ پناہ لیتے .... رحمت کا خیال، رحمت کی اُمید یہی کیا کم دلاسا تھا؟

وہ لوگ مجھ سے زیادہ خوش اور مطمئن تھے۔ اُن کی جسمانی زندگی پامال حوادث تھی

مگر اُن میں روحانی قوت موجود تھی۔

اُن میں "انسانیت" موجود تھی۔ مجھ میں "انسانیت" فنا ہو چکی تھی۔ جس کی میں ہی خود ذمہ دار تھی۔

وہ پہلی رکعت ختم کر چکے تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے موٹر اسٹارٹ کی، اور روانہ ہو گئی تیز خنکی سے بھری ہوئی ہوا، میرے چہرے کی مخالف چل رہی تھی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ میرا دماغ قابو میں نہیں ہے۔ میں فورٹ کی خوبصورت سڑکوں پر اُڑی چلی جا رہی تھی، جیسے کوئی خواب دیکھتا ہو۔

نمازیوں کی ظاہرہ کیفیت اور اُن کے دلی اطمینان و مسرت کا میرے دل پہ ایک خاص اثر ہوا۔ میرا کافر دماغ، تاریکی کے ایک طویل عرصے کے بعد آج پھر روشنی کی پہلی شعاعوں سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ مجھے چکر آ رہا تھا۔

سامنے سے ٹرام آ رہی تھی۔ میں نے موٹر کو ہٹانا چاہا۔ مگر میرے ہاتھ پیر جواب دے رہے تھے۔ دماغی اختلال نے سارے جسم کو معطل کر دیا تھا۔ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ میں بے ہوش ہو گئی۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک آراستہ کمرے میں ایک مسہری پر لیٹا پایا۔ میرے پاس ایک دو نرسیں کھڑی تھیں۔ اور کچھ دور ایک مرد میری طرف پشت کئے بیٹھا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے تکتہ کا خیال آ گیا۔ اور میں نے ایک نرس سے پوچھا "میں کہاں ہوں"؟

میری آواز سنکر وہ شخص اُٹھا، نہایت خوبرو نوجوان تھا، اور بہت بیش قیمت کپڑے پہنے تھا اور کہنے لگا "گھبرائیے نہیں۔ آپ میری مہمان ہیں۔ میں جے۔ جے۔ ہسپتال کا ایک ڈاکٹر ہوں۔ حادثہ بالکل میرے مکان کے سامنے ہوا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ

آپ کو یہاں اُٹھوالاؤں۔ آپ کے زخم نہایت معمولی ہیں۔ اور انشاءاللہ کل تک آپ بالکل تندرست ہو جائیں گی۔ اس وقت اگر آپ آرام فرمائیں تو مناسب ہو گا۔" یہ کہکر اُس نے ٹوپی اُٹھائی، جھکا اور مُسکرا کر چلا گیا۔

میرا دماغ تھکن سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ میں بہت جلد نیند میں غرق ہو گئی۔

صبح کو میری طبیعت سنبھل چکی تھی۔ ناشتے پر میں نے اپنے میزبان کی عنایت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "اب میں جانے کے قابل ہو چکی ہوں۔"

اُس نے کہا کہ "میں تو چاہتا تھا کہ آپ کچھ دیر اور ٹھیریں۔ لیکن خیر آپ کی مرضی۔ جب کبھی آپ کو ضرورت ہو تو آپ مجھے طلب فرما سکتی ہیں۔ میرا نام ڈاکٹر علی رضا ہے۔...... کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟"

اُس نوجوان کی بے انتہا شرافت اور نیک نفسی کا میرے دل پر بہت اثر ہوا اور میں نے کہا "بہتر ہوتا کہ آپ میرا نام نہ پوچھتے۔ کیونکہ آپ جیسے حقیقی شریف اور ہمدرد انسان مجھ سے، میرا نام اور پیشہ سنکر نفرت کرنے لگتے ہیں۔"

جوان نے کہا "میں سمجھ گیا۔ لیکن آپ یقین جانئے میں آپ کو نفرت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ دنیا میں ہر انسان خامیوں اور خرابیوں میں مبتلا ہے کسی کی خامیوں اور خرابیوں کی وجہ سے اُس کی قدر دنیا کی نظر میں گھٹتی ہے۔ لیکن حقیقتاً نہیں گھٹ سکتی کیونکہ بدی اور گناہ، اصل میں گم کردہ نیکی ہے۔"

اب تک مجھے دُنیا میں دو قسم کے آدمی ملے تھے ایک تو وہ بوالہوس طبقہ جو مجھے نام نہاد تعریف کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور دوسرے وہ طبقہ جو مجھے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مجھے بیسوا کہتا تھا۔ میری ہنسی اُڑاتا تھا۔ پہلا شخص تھا جو اس قدر خوبصورت اور کمسن، ہونے کے باوجود مجھ سے ایک بے غرض خالص اور انسانیت سے لبریز لہجے میں

باتیں کر رہا تھا۔

تو خدا کی مخلوق میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ دُنیا میں سب لوگ بدنفس، بدباطن ریاکار نہیں —— ہزار میں ایک مخلص اور ہمدرد بھی نظر آجاتا ہے۔ اُس کی زبان سے سچی ہمدردی کے الفاظ سُنکر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ میرے الفاظ سے آپ کو تکلیف ہوئی" اُس نے متاسف لہجے میں کہا" لیکن جہاں تک میرا خیال ہے کوئی اندرونی غم آپ کو تکلیف پہنچا رہا ہے"۔

جس طرح کسی روتے ہوئے بچے کو کوئی دلاسا دیکر چپ کرے تو وہ اُس وقت اپنے ہمدرد کو اپنا سب سے بڑا دوست سمجھنے لگتا ہے۔ کچھ اسی قسم کے خیال سے متاثر ہو کر پہلی ملاقات میں مَیں نے اُس سے اپنی زندگی کے پورے واقعات من وعن بیان کر دیئے۔"

وہ اِن واقعات کو دلچسپی اور ہمدردی سے سنتا رہا۔ اور اس کے بعد کہا۔

"خدائے پاک نے آپ کی زندگی کے منازل حسب معمول بالکل فطری طریقے پر طے کرائے۔ لیکن ایک مرتبہ کی مظلومیت، عصمت کی بربادی نے آپ کے حساس دل سے نیکی اور خداترسی کے جذبات نکال لیئے۔ اور پھر حسن فروشی کی زندگی نے ملکوتی محبت کے بجائے ادنیٰ جذبات کا آپ کو شکار بنا دیا"۔

"یہ میری غلطی نہ تھی"۔

"ایک حد تک۔ کیونکہ آپ نے یہ سمجھ کر نہیں کی کہ آپ غلطی کر رہی ہیں"

"میں مجبور تھی"

"یہی خدا کا منشا تھا"

"یہ کہ میں برباد ہو جاؤں۔ میری روح اپنی لطافت سے" اپنی کیفیات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے۔

"جی نہیں۔ شمع اس لئے جلائی جاتی ہے کہ خود جل کر دوسروں کے لئے روشنی کا باعث ہو۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"سنیئے۔ ایک سنگتراش ایک مجسمہ بناتا ہے۔ پہلے مرمر کے ٹکڑے کو کاٹتا ہے تو ضربیں لگاتا ہے۔ اسی طرح خدا انسان کی ہستی انسان کی روح کو زیادہ بلند پایہ بنانے کے لئے اُس پر طرح طرح کی مصیبتیں توڑتا ہے۔ تاکہ مصیبتیں کثافتوں کو خارج کر دیں۔ اب اپنی ہی مثال لیجئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کے والد زندہ رہتے۔ آپ کی کسی شریف گھرانے میں شادی ہوتی، آپ مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکتیں۔ آپ کو ہر طرح کا دنیاوی عیش میسر ہوتا۔ مگر آپ خدا سے اس قدر قریب نہ ہوتیں۔ آپ ایک ظالمانہ گناہ کا شکار ہیں۔ خدا کی مصلحت تھی کہ آپ کی ہستی میں سمیت اس لئے داخل کرے کہ وہ آپ کی ہستی کی کثافتوں کو جلا دے۔ اس سمیت سے آپ محسوس کرنے لگیں کہ کثافت کیا ہے۔ اب خدا نے آپ کے لئے روحانی غمناک لطافتیں، خود کثافتوں کے ذریعہ مہیا کر دیں۔ یعنی آپ نے انتقاماً کثافت سے لبریز زندگی اختیار کی، اور خود اپنی ہستی کی خواب نما کثافتوں کو قربان کر دیا۔ لیکن یہ محض آپ کا خیال تھا۔ آپ کے دل میں اندر ہی اندر آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور موقع کے منتظر تھے کہ جذباتی کثافتوں کو جلا کر خاک کر دیں ان شعلوں کو اور زیادہ بھڑک اٹھنے اور اپنی سوزش کا اثر دکھانے کا موقع اُس وقت ملا جب آپ نے کل شام نمازیوں کو خدا کے سامنے سر جھکاتے دیکھا۔ اب آپ دیکھئے گا رفتہ رفتہ یہ مردہ کثافتیں فنا ہوتی جائیں گی۔ اور اُس کے بعد آپ کی ہستی میں صرف روحانی لطافتیں باقی رہ جائیں گی۔

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فلسفیانہ جملوں کا مجھ پر بہت کافی اثر ہوا۔ میں جب

جب اُن سے رخصت ہو کر گھر پہنچی تو پھر میں اپنے آپ کو پرانی رقیہ ریحانہ — تمہاری پرانی سہیلی — وہ معصوم لڑکی سمجھنے لگی۔ میں ہنس رہی تھی۔ بشاش تھی۔ اور باوجود ان خفیف زخموں کے بہت زیادہ مسرور تھی۔

رات ہوئی تو میں نے وہ سفید کپڑے نکالے جو آپا جان کے سامنے پہنا کرتی تھی اُن کو پہن کر میں جا نماز بچھائی۔ عود سلگایا۔ اور ایک طویل سجدے میں محو ہوگئی آج میری روح پر کوئی بار نہ تھا۔ میں اپنے آپ بالکل معصوم تصور کر رہی تھی۔ کیونکہ آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ سب سے بڑا مددگار مجھے بھولا نہ تھا۔ میرے خدا نے کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ اس نے مجھے زندگی کا راستہ کانٹوں بھری سڑک سے طے کرا دیا۔ اس لئے کہ کانٹوں سے پاؤں چھد کر کثیف خون بہ جائے اور جب میں گلِ مقصود تک پہنچوں تو مجھ میں چلنے کی سکت باقی نہ رہے اور خوشبودار پھول کو لبوں سے لگا کر اپنے آپ کو پھول کی خوشبو میں فنا کر دوں۔

ہر مصیبت کی تہ میں راحت ہے۔ جاہل کم عقل انسان مصیبت دیکھتا ہے۔ راحت نہیں دیکھتا۔ اور پھر خدا کو الزام دیتا ہے۔

میری نوشابہ میں نے لکھا تھا کہ یہ میرا آخری خط ہے......... ہاں کیوں کہ جس وقت یہ خط تم تک پہنچے گا۔ میں سطح زمین سے دو گز نیچے آرام سے سو رہی ہوں گی۔ نوشابہ، ڈاکٹر ٹھیک کہتا تھا۔ میری کثافتوں کا زمانہ خدا نے ختم کر دیا۔ اس لئے کہ مجھے کامل روحانی طمانیت سے ہمکنار کرے۔ چند گھنٹے — آج کے دن کے چند گھنٹے — میں نے اس بیخودی میں گزارے اور ابھی تک میں بیخود ہوں۔ مدہوش ہوں۔ مسرور ہوں۔ کیونکہ اب میں کانٹوں بھرے راستے کو ختم کر چکی ہوں۔ گلِ مقصود کو سونگھنے، اور چومنے کے لئے۔

نوشابہ تم کو یاد ہوگا کہ جب ہم ساتھ ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے تو مجھ پر اس

گیت کا کس قدر اثر ہوتا تھا۔

چلی پی کے نگر بن ٹھن کے دلہن اب میکے میں جی گھبراوت ہے

آج پھر میں یہ گیت گنگنا رہی ہوں۔ آج میں نے کئی گیت گائے۔ کسی کو سنانے کے لیئے نہیں۔ صرف اپنے آپ کو سنانے کے لئے۔ آج میں خوش ہوں۔ حقیقی معنوں میں مسرور ہوں۔ میری مسرت کی گھڑیاں گنتی کی ہیں مگر زندگی بھر کی تکالیف کا نعم البدل ہیں۔

تم کہوگی یہ مسرت خیالی محض خیالی ہے۔

نوشابہ تم کو کیا معلوم خیال کس قدر بلند پایہ چیز ہے۔ خیال ہم ستم رسیدوں کی جائے پناہ ہے۔

میں وصیت نامہ میں اپنی ساری دولت گورنمنٹ کے حوالے کر چکی ہوں۔ وہ جس کام میں چاہے صرف کرے۔ تم کو یہ خط اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میری داستان نامکمل نہ رہ جائے میرے مرنے کے بہت دنوں بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دس بارہ سال کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب دنیا مجھے بالکل بھول جائے تو میری داستان شائع کرا دینا تاکہ خدا کا منشا پورا ہو۔

ممکن ہے میری زندگی دوسروں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیسکے۔

میرے گناہ۔ میری اپنی نظروں میں بہت مقدس تھے۔ دوسروں کی نظروں میں ہوں یا نہ ہوں۔

اچھا میری پیاری نوشابہ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ

تمہاری بدنصیب بیگانہ

(۶)

حسن فنا ہو جاتا ہے حسن کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔

ہر حسین چیز پیدا اسی لئے کی جاتی ہے کہ خود برباد ہو۔ دوسروں کو برباد کرے۔ یہانتک کہ فنا ہو جائے۔

یہی حال ریحانہ کا ہوا۔

وہ مصورِ ازل کا ایک شاہکار تھی۔ ہر شاہکار کی طرح " اس کی ہستی ہی اپنی فنا پر دلیل تھی"

ہر شاہکار کو سنبھال کر رکھنا، اصل میں اس کی حقیقی قیمت کو زائل کرنا ہے۔ یہ مصورِ ازل کا اصول ہے۔

خطا نہ مصور کی ہے ——— نہ تصویر کی۔

بلکہ بحرِ زندگانی میں ایک حباب اٹھا اور فنا ہو گیا۔ عظیم الشان کائنات میں اس کی ہستی ایک حباب تھی اور بس ——— اور حباب کی اہمیت معلوم۔

عزیز احمد
کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

ہندوستان اور مویشی

ازجناب شبیر علی صاحب متعلم کلیۂ جامعہ عثمانیہ

برِ اعظم ایشیا میں ہندوستان جن وجوہ کی بنا پر منور ہے منجملہ اُن کے ایک اُس کی زمین کی زرخیزی بھی ہے۔ یہاں کی زمین بہ نسبت دوسرے ممالک کے اپنی زرخیزی کے باعث اچھی سے اچھی پیداوار اُگاتی اور اُگا سکتی ہے۔ شمالی ہند میں ہمالیہ کا زیرین حصہ جو دوآب کا علاقہ کہلاتا ہے کس قدر زرخیز ہے کہ از قسم جنس جو پیداوار بھی اُس زمین سے حاصل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں شروع ہی سے زراعت کی طرف زیادہ توجہ رہی۔ ہندوستانی صنعتوں کے افسوسناک زوال سے پہلے اور منتہائے کمال کے وقت بھی کبھی زراعت سے بے توجہی نہیں برتی گئی اور اب جبکہ یہاں کی صنعتیں پورے پورے طور پر خواہ وہ کسی طرح سے کیوں نہ ہو کافور ہو چلیں اور آبادی کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہیں رہا تو مجبوراً لوگ زراعت پر بادل ناخواستہ ٹوٹ پڑے اور اب تو ستر فیصدی آبادی زراعت کرتی ہے۔ اسی طرح اگر پانچ ہزار سے کم آبادی کے حصوں کو دیہات کہا جائے

تو تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس آبادی کا ۹۰ فیصدی حصہ زراعت کرتا ہے یا زراعت سے متعلق کاموں ہی میں مصروف ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے بہت سے لوگ ہندوستان کو زراعتی ملک اور یہاں کی آبادی کو زراعت پیشہ کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ لحاظ زراعتی پیداوار کے دنیا کے بڑے بڑے شہروں ملکوں میں ہندوستان کا بائیسواں نمبر ہے۔ گو یہ لحاظ رقبہ اور آبادی دنیا کے عظیم الشان ملکوں میں اس کا نمبر علی الترتیب ساتواں اور دوسرا ہے۔ چونکہ اب ہندوستان جزائر برطانیہ کے زیرنگیں ہے اس لئے اُس کے حصہ میں خاص کر انگلستان کے مصنوعات کے لئے پیداوار خام مہیا کرنا رہ گیا ہے اور پیداوار خام کا منبع ، مرکز چونکہ زراعت ہے۔ اس لئے یہاں زراعت کی کثرت ہے۔ خصوصاً جنگ کے بعد سے زرعی پیداوار کی مانگ اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ ادنیٰ درجے کی ناکارہ اور بنجر زمینات بھی زیر کاشت آرہے ہیں اور ایک فصل کے تیار ہونے کے ساتھ ہی دوسری فصل کی تیاری شروع ہوجاتی ہے۔ اور جب سے کہ روئی کی مانگ بڑھی غلے کے کھیتوں میں بھی روئی کی کاشت ہی ہونے لگی ہے۔ مختصر یہ کہ اب ہندوستان کا زیادہ تر مدار زراعت پر ہے۔

زراعت پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود زراعت کی اتنی اہمیت کے پھر بھی ہندوستان بہ نسبت دوسرے ممالک مغربی یعنے جرمن اور فرانس سے پیچھے ہے۔ اس کی وجہ یہاں کے کاشتکاروں کی جہالت ان کا افلاس جدید آلات زرعی کا فقدان، عمدہ کھاد کی کمی، طاقتور اور کارآمد مویشیوں کی عدم موجودگی اور اس قسم کے دیگر مختلف اسباب ہیں۔ گو ہندوستان میں ریل کے جاری ہونے سے پیداوار کی حمل و نقل میں اب پہلے کی مانند وقت اور مویشیوں کی محتاجی نہ رہی لیکن پھر بھی ہندوستان کی زراعت بیشتر مویشیوں کی ہی محتاج ہے کیونکہ عام طور پر زراعت کا دار و مدار مویشیوں ہی پر زیادہ رہتا ہے اور حقیقت تو

تو یہ ہے کہ اگر جدید طریقے زراعت میں استعمال کئے جائیں تو ایسی صورت میں بھی مویشیوں کا ہونا زراعت کے لئے ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک پر نظر ڈالیئے کہ باوجود جدید طریقوں کے استعمال کے پھر بھی وہ مویشیوں کی پرورش اور ان کی اعلیٰ نسل کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں رہتے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ملک کے ہر حصے میں خواہ اُس کے جغرافی حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں ریل ہو اور وہاں کی پیداوار مارکٹ تک بآسانی جاسکے بلکہ بعض کم زرخیز اور کم آبادی والے ایسے قطعات رہتے ہیں جہاں ریل کے نہ ہونے سے پیداوار کا مارکٹ تک آنا زیادہ تر مویشیوں ہی پر منحصر رہتا ہے اور خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں کہ جہاں ابھی ریل کا جال پورے طور پر وسیع نہ ہوا ہو بہت سے دور دراز مقامات پر بعض قطعے ایسے پائے جاتے ہیں کہ وہاں کی پیداوار کا مارکٹ تک آنا تمام تر بنڈیوں، چھکڑوں اور اسی قسم کی دیگر سواریوں پر منحصر رہتا ہے۔ اس لئے ایسی صورت میں مویشیوں کی جو کہ عمدہ طاقتور اور اعلیٰ نسل کے ہوں بہت ضرورت رہتی ہے۔ اس کے علاوہ جدید آلاتِ زرعی کا چونکہ ہندوستان میں بہت کم استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کی غیر موجودگی میں ہل جوتنے اور پانی کھینچنے کے لئے بھی بغیر مویشیوں کے چارہ نہیں۔ لہذا ان حالات کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی زراعت کا تمام مدار مویشیوں پر ہے۔ شاہی زراعتی کمیشن نے حال میں اپنی رپورٹ ہندوستان کی زراعت کے متعلق شائع کی ہے۔ اس کا یہ قول ہے کہ "دنیا کے کسی ملک میں مویشیوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ ہندوستان میں"۔ باوجود زمین کی زرخیزی اور محنت کی افراط کے ہندوستان میں زراعت کو جو ترقی نہیں ہو رہی ہے منجملہ دیگر اسباب کے اس کا ایک اہم سبب عمدہ اور طاقتور مویشیوں کی عدم موجودگی ہے۔

یہاں تک تو مویشیوں کی اہمیت بہ لحاظ زراعت کے بیان کی گئی لیکن اس کے علاوہ عمدہ مویشیوں کی دیگر اسباب کی بناء پر بھی ہندوستان کو بہت ضرورت ہے۔ گو بہ نسبت

ہندوؤں کے مسلمانوں کی آبادی بہ حیثیت مجموعی بہت کم ہے۔ اس پر بھی مسلمان چونکہ گوشت کھانے کے عادی ہیں اس لئے مویشیوں کا تندرست حالت میں ہونا ہر لحاظ سے ضروری ہے۔ مویشی اگر بیمار رہوں تو اُن کا گوشت بھی آبادی کی صحت کے لئے مضر ثابت ہوگا۔ ملک میں عام طور پر جو طاقت اور توانائی گھٹ رہی ہے اور لوگ جو مختلف بیماریوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مویشی جن کا گوشت کھایا جاتا ہے بلحاظ صحت تندرست نہیں رہتے قطع نظر گوشت خواری کے یہاں کے لوگ دودھ مکھن کا بھی استعمال کرتے ہیں اس لئے بھی عمدہ مویشی کی ضرورت بہت رہتی ہے۔ گو دودھ مکھن کا استعمال اَب بہت کم ہوگیا ہے حالانکہ کسی زمانہ میں یہاں اُن کی بہت افراط تھی لوگ بھی بہت تندرست اور توانا ہوتے تھے۔ اب یہ لذیذ اور مقوی غذا ئیں، تو بسا اوقات جماعت کثیر کو گاہے ماہے بطور تبرک نصیب ہوتی ہیں اس کی وجہ گرانی ہے گرانی کے علاوہ ایک اور خرابی یہ ہے کہ ان میں اب دوسری چیزوں کا میل بہت بڑھا دیا گیا ہے چنانچہ بڑے بڑے شہروں میں یا تو خالص گھی اور دودھ ملنا ایک امر محال ہے۔ اور اس آمیزش کی بدولت آبادی میں اب وہ پہلی سی توانائی اور طاقت نہیں رہی۔

ہندوستان میں مویشیوں کی موجودہ حالت بہت خراب اور قابل اصلاح ہے۔ اور مجموعی طور پر ہندوستان کی زمین اور عمدہ مویشیوں میں کوئی ٹھیک نسبت نہیں ہے (اس لئے اُن میں زیادتی کی بہت ضرورت ہے۔ عمدہ مویشیوں کی قلت کے متعدد اسباب ہیں۔ ہندوستان میں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مویشی متعدد امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عمدہ اور طاقتور مویشیوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوتا۔ شرح اموات کی زیادتی کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُن کی نگہداشت کافی طور پر نہیں کی جاتی۔ اور کاشتکار چونکہ جاہل اور مفلس ہیں اس لئے وہ نگہداشت کی مختلف تدابیر سے ناواقف رہتے ہیں۔ صرف ایک ریاست میسور

میں مویشیوں کی نگہداشت کا عمدہ انتظام پایا جاتا ہے اور حال کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ۱ کروڑ مویشی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بہ لحاظ تیز رفتاری اور جفاکشی وہاں کے بیل پورے ہندوستان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں مویشیوں کو تندرست حالت میں رکھنے اور بیماریوں سے بچانے کے لئے انہیں انسانوں کے مانند ہر سال ٹیکہ دینا چاہئے جس سے وہ مختلف موسمی امراض کا شکار نہ ہوسکیں۔ چنانچہ اس طریق کو روس۔ جنوبی افریقہ۔ جزائر فلپائن اور مصر میں بہت کامیابی ہوئی اور ہندوستان میں اب تک صرف ریاست میسور میں وسیع پیمانہ پر اس کا تجربہ کیا گیا۔ ٹیکہ دینے پر پہلے تو جانور متعدی امراض میں مبتلا ہی نہیں ہوتا یا اگر ہو بھی جائے تو بیماری کا اثر اس پر بہت کم ہوتا ہے اور وہ بہت جلد اچھا ہو جاتا ہے۔ لیکن ٹیکہ دینے میں چونکہ مصارف بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لئے غریب کاشتکاران کا متحمل نہیں ہوسکتا اور اسیطرح گورنمنٹ کے لئے بھی یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کثیر مصارف برداشت کرکے ملک کے پورے مویشیوں کو ٹیکہ لگوایا جائے۔ البتہ اس کے لئے اگر امداد باہمی کی انجمنیں قائم ہوں اور وہ کاشتکاروں کی مدد کریں تو پھر یہ طریقہ کچھ مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتا ہے بعض کا خیال ہے کہ مویشیوں کو متعدی امراض سے محفوظ رکھنے کے لئے ٹیکہ لگوانا بالکل لازمی قرار دیدیا جائے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے ایسا ہونا ناممکن ہے لیکن اگر یہ صورت حال ان لوگوں پر لازمی قرار دی جائے جو گائے بھینس صرف اس غرض سے رکھتے ہیں کہ ان کا دودھ اور مکھن فروخت کرکے خوب روپیہ کمائیں۔ جیسا کہ ہمارے یہاں عام طور پر گولی یا مالکان ڈیری فارم ہوتے ہیں تو ان لوگوں کو یہ کوئی زیادہ بار نہیں گزرے گا اور وہ اس کے متحمل ہوسکیں گے۔

ہندوستان میں کوئی مبارک سال ایسا نہیں گزرتا جس میں کہ کوئی نہ کوئی بیماری ملک پر مسلط نہ ہوا اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مویشیوں کا خاتمہ نہ کردے۔ جب کسی قصبے یا

شہر میں مرض مویشی جو اکثر متعدی ہوا کرتا ہے ۔ پھیلتا ہے تو مالکان مویشی کی زبردست خواہش یہ رہتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے مریض مویشی کو مارکٹ لیجائیں اور جو کچھ بھی دام وصول ہوسکتے ہوں نقد کریں ورنہ اس ادنی قیمت سے بھی محروم رہنے کا اندیشہ اور قصبے یا شہر کے عمدہ مویشیوں کے اس مرض متعدی میں مبتلا ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ غرض اس طرح مالکان مویشی اپنے گاؤں کی بلا ٹال کر دام نقد کر لیتے ہیں لیکن مارکٹ سے ان بیمار مویشیوں کو جو بدقسمت اچھے ہو جانے کی امید میں کم قیمت میں خرید کر اپنے گاؤں میں لے جاتا ہے۔ وہاں اس مرض کے پھیلنے کا خوف رہتا ہے۔ اب ان مویشیوں میں سے بعض کچھ دن کے علاج معالجہ کے بعد تندرست ہو جاتے ہیں اور بعض چل دیتے ہیں اس طور پر مردہ مویشیوں کے جراثیم گاؤں کے دوسرے عمدہ مویشیوں میں پھیلکر وہاں بھی مرض پھیلاتے ہیں۔ اس طرح پر نہ صرف عمدہ مویشیوں کی تعداد ہی میں کمی واقع ہوتی ہے بلکہ مفلس کاشتکار پر مزید بار پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی خرابی کو دور کرنے کے لئے ریاست میسور کے ناظم زراعت نے یہہ تحریک کی تھی کہ مویشیوں کی نقل وحمل میں نہایت سخت احتیاط برتی جائے لیکن اُس پر عمل نہیں ہو رہا ہے ۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے محکمۂ علاج حیوانات میں بھی اصلاح اور توسیع کی بہت ضرورت ہے اور اگر یہ کمی پوری ہو جائے تو پھر مویشیوں کا مسئلہ اس قدر اہم نہ رہتا جتنا کہ اب معلوم ہوتا ہے۔ محکمۂ علاج حیوانات کے ملازمین یا ڈاکٹر دواخانے میں بیٹھ کر صرف ان بیمار مویشیوں کا ہی علاج نہ کریں جو کہ ان کے پاس خود رجوع کئے جائیں۔ بلکہ دیہات میں جا کر انہیں وہاں کی مقامی زبان میں تقاریر کرنی چاہئیں اور کاشتکاروں کو مویشیوں کی نگہداشت کے مختلف طریقے، حفظ ماتقدم کے تدابیر اور معمولی امراض کے انسداد کے طریقوں سے آگاہ کرنا چاہئے کیونکہ مرض میں مبتلا ہونے کے بعد اس کے علاج کے تدابیر سوچنے

سے پہلے اگر مرض ہی کو آنے نہ دیں تو بہت بہتر ہے اور اس کے لئے ہندوستانی جاہل کاشکاروں کو ڈاکٹروں کی وقت بیوقت مدد اور طبی مشورے کی سخت ضرورت ہے۔ برطانوی ہند میں ۲۷۲ اضلاع اور ہر ضلع میں کئی قصبے اور دیہات ہیں لیکن ہر قصبے اور گاؤں میں علاج حیوانات کے دواخانے تو نہیں ہیں۔ بلکہ شہروں میں یا زیادہ سے زیادہ ضلعوں کے مستقر پر قایم ہیں۔ اگر کسی قصبے میں کوئی جانور کسی مرض میں مبتلا ہو تو اُس کے مالک کو اُسی ضلعے میں ڈاکٹر کے پاس لانے کے لئے ایک تو اخراجات کا بار اُٹھانا پڑتا ہے اور دوسرے آمد و رفت کے وقت اور راستے کی تکان سے مویشی کے مرجانے کا بھی ڈر لگا رہتا ہے۔ اس لئے دواخانوں کی عدم موجودگی کی صورت میں قصبات اور دیہات کے کاشکاروں کو خود علاج حیوانات سے واقف رہنا نہایت ضروری ہے۔ علاج حیوانات سے متعلق جو کالج اور مدارس قائم ہیں جہاں اس فن کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں کے پرفیسروں اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اپنے فن سے متعلق فرصت کے اوقات میں سائنٹفک تحقیقات کریں اور طالب علموں کو اپنے مفید معلومات اور نئے نئے تحقیقات سے آگاہ کریں تاکہ ان کالجوں اور مدارس کی پیداوار ملک کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو۔

اس کے علاوہ ہندوستان میں مویشیوں کے تحفظِ نسل اور ان کی نگہداشت کے تدابیر کا بھی فقدان ہے۔ یہاں کے کاشتکار اپنی جہالت کی بنا پر یہ نہیں جانتے کہ کیوں کر مویشیوں کی نسل کی حفاظت کی جائے اور ان کی پرورش کی جائے۔ گو ہندوستان کے ایک صوبے اور دوسرے صوبے میں جغرافی لحاظ سے بہت فرق پایا جاتا ہے لیکن اس پر بھی تعجب کی بات ہے کہ مویشیوں کی نگہداشت اور پرورش سب جگہ ایک ہی بے ڈھنگے طریق پر کی جاتی ہے۔ شاہی زراعتی کمیشن کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مویشی بہت زیادہ ہیں۔ لیکن باوجود زیادتی کے وہ زرعی پیداوار کی مقدار بڑھانے میں مفید ثابت

ہیں ہو سکتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ مویشی لاغر اور کم طاقت اور بہ لحاظ صحت کے بھی اچھے
نہیں ہوتے۔ دوسری ترقی یافتہ ممالک کے مویشیوں سے اگر یہاں کے مویشیوں کا مقابلہ
کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر بیکار مویشیوں کی تعداد کم کر کے عمدہ مویشیوں کی تعداد بڑھانے
کا انتظام کیا جائے تو اس سے فی الحال زراعت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ زیادتی کی صورت
میں چارہ اور راتب کے کم ملنے کی وجہ سے گائیں اور بھینسیں اپنی نسل عمدہ حالت میں نہیں چھوڑ
سکتیں جس سے کاشتکاروں کو بھی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن کی وجہ سے کارآمد اور عمدہ
نسل کے مویشیوں کی غذا میں کمی واقع ہوتی ہے۔ مویشیوں کو طاقتور۔ قوی اور عمدہ نسل
کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ عمدہ مویشیوں کی کم تعداد ناکارہ مویشیوں کے ایک بڑے گلے
سے بہت بہتر ہے۔ بعض لوگ اپنی کوتہ بینی کی بنا پر یہ اندازہ قایم کرتے ہیں کہ بہ نسبت اعلیٰ
نسل کے ادنی نسل کے مویشیوں کے مصارف کم ہوتے ہیں لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ادنی نسل
کے مویشی بہ نسبت اعلیٰ نسل کے مویشیوں کے بدرجہا زیادہ کھانے والے ہوتے ہیں۔ اس طرح
بہ لحاظ کفایت و مصارف۔ کے بہت بہتر ہوگا کہ اعلیٰ نسل کے مویشی رکھے جائیں جس سے
مصارف میں کفایت ہوگی اور کام بھی زیادہ اور عمدہ ہوگا۔ اور خصوصًا ہندوستان جیسے ملک
میں جہاں خاص خاص موسموں میں چارہ اور راتب کا مہیا کرنا ایک اہم سوال ہوتا ہے۔ بڑی
حد تک عمدہ مویشیوں کے تحفظ نسل اور ان کی نگہداشت بہت ضروری ہے۔ عمدہ مویشی
زراعت اور باربرداری میں بہت مدد دیتے ہیں اور مالک کو ہر قسم کی کفایت رہتی ہے۔
خاص اہتمام سے عمدہ نسل کے بیل گائے پیدا کرنے کا انتظام دیسی ریاست میسور میں پایا جاتا
ہے۔ اور اسی طرح یورپ کے ممالک میں بھی اس کے لئے مختلف تجربے کئے جاتے ہیں۔ ایک
تجربہ اگر ناکام ہوتا ہے تو دوسرا تجربہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے وہاں عمدہ مویشیوں
کی قلت نہیں ہے۔ لیکن اب گورنمنٹ کی جانب سے محکمہ حیوانات خاص طور پر حفاظت نسل کا

انتظام اور تجربے کر رہا ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن کے زمانہ میں جبکہ ایک امریکن نے لارڈ موصوف کی معرفت تیس ہزار پونڈ کا گرانقدر عطیہ ہندوستان میں زراعتی سائنٹفک تحقیقات کے لئے عطا کیا تو اس سلسلہ میں ایک مویشی خانہ بھی عام طور پر مویشیوں کی حالت سدھارنے کے لئے لوسا میں قائم کیا گیا۔ خود گورنمنٹ بھی اپنی فوجی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے خصوصاً گھوڑوں اور بیلوں کی نسلوں میں ترقی دینے کے لئے بہت کوشش کر رہی ہے۔ لیکن اس پر بھی ابھی تک محکمۂ حیوانات سرکاری طور پر ملک کے ضروریات پورا کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ مگر امید ہے کہ کچھ دنوں میں یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ عام طور پر لوگوں میں رغبت پیدا کرنے کے لئے سرکار انعامات کے لالچ سے بھی اپنی رعایا کی ہمت افزائی کر رہی ہے۔ چنانچہ ہر سال مویشیوں کے میلے ہوتے ہیں جہاں عمدہ سے عمدہ مویشی فروخت ہوتے ہیں۔ اور اب تو ہندوستان کے بعض مقامات مثلاً ہریانا شوال رنگوں کاٹھیاوار اور گجرات میں عمدہ نسل اور بڑے قد کے مویشی پائے جاتے ہیں۔

عمدہ نسل کے مویشیوں کی ترقی کے لئے چند چیزیں ضروری ہیں پہلے تو یہ کہ بیکار اور زائد از ضرورت مویشیوں کی تعداد میں کمی کی جائے۔ دوسرے ہل چلانے والے مویشیوں کی کارکردگی میں اضافہ کیا جائے۔ تیسرے دودھ نہ دینے والی گائیوں اور بھینسوں اور کمسن بچھڑوں کی نگہداشت عمدہ طور پر کی جائے کیونکہ عام طور پر سوکھے جانور جو دودھ نہ دیتے ہوں اور کمسن بچھڑے جو کمسنی کی وجہ سے کسی کام کے نہ رہتے ہوں نہایت ہی لاپروائی اور بیکسی کی حالت میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں جس سے آئندہ نسلوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اور خصوصاً ہندوستان میں جہاں جانوروں کو فسط پر چرانے کا انتظام بہت کم پایا جاتا ہے۔ جانوروں کے لئے چراگاہوں کے رقبوں کا انتظام نہایت ضروری ہے۔ عام

پر یہہ دیکھا جاتا ہے کہ گاؤں اور قصبات کے اور گرد جو چراگاہ ہوتے ہیں اُن میں زیادہ تعداد میں جانور چرنے کی وجہ سے بہت جلد وہاں کی گھانس ختم ہو جاتی ہے اور کسی دوسری چراگاہ کی فکر کرنی پڑتی ہے ورنہ جانوروں کے بھوکے مر جانے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ معمولی کسان تو اپنے کار آمد مویشیوں کے لئے کسی طرح غذا مہیا کر لیتا ہے اور ناکارہ کو جنگل کا کچرہ کوڑہ پر چھوڑ دیتا ہے لیکن خراب موسم یا قحط کے زمانے میں تو مالدار کاشتکاروں کے لئے بھی عمدہ اور کار آمد مویشیوں کے غذا مہیا کرنا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اسی لئے عمدہ نسل کے مویشی ترقی کرنے نہیں پاتے۔

اب مویشیوں کی خوراک پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ خوراک کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ مویشیوں کی ترقی اور بقا کے لئے خوراک ناگزیر ہے۔ کیونکہ بغیر خوراک کی موجودگی کے مویشی کی پرورش ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔ جہاں تک کہ ان کی خوراک کا تعلق ہے عام طور پر اس کے چار ذریعے ہیں۔ (۱) دیہات اور قصبات کے اطراف کی افتادہ زمین کی گھانس (۲) بھوسہ۔ کھلی وغیرہ (۳) جنگلات کی سبزی (۴) موسم گرما میں محفوظ گرپول کی گھانس جو بڑے بڑے چراگاہوں یا رمنوں سے کاٹ کر خاص طور پر محفوظ رکھی جاتی ہے حال کی تحقیقات کا جہاں تک تعلق ہے یہہ معلوم ہوتا ہے مویشیوں کے لئے یہاں چراگاہیں یا رمنوں کے رقبے ہیں اگر وسعت دی جائیں تو یہہ کام باآسانی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی نگہداشت کی ضرورت ہے اور اس کے لئے چند طریق اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ عام چراگاہ کا ایک خاص حصہ کسی گاؤں کی انجمن ترقی مویشیان کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پہاڑی مقامات میں جہاں جانوروں کے چرانے کی سہولتیں بہ نسبت دوسرے مقامات کے زیادہ ہیں۔ چراگاہوں کو حسب ذیل شرائط سے دیہات کے چند گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے جو اس قصبے کی زمینات کے مالک ہوں (۱) رقبے؛

صرف ROTATION کی صورت میں جانور چرائے جائیں گے (۲) صرف اس گروہ کے جانور ہی اس رقبے پر چر سکیں گے۔ جس کے حصے میں یہ رقبہ آیا ہو (۳) دوسرے گروہوں کے جانور وہاں سے خارج کردیئے جائیں گے (۴) اس رقبے کے ایک حصے کی گھانس کاٹ کر موسم گرما کے لئے محفوظ رکھی جائے گی۔ بہت سے حصے ایسے ہیں جہاں پانی نہ ہونے کی وجہ سے افتادہ زمینات پر گھانس نہیں اوگتی۔ اس لئے جہاں پانی کی کمی ہو وہاں گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ بہت ہی کشادہ دلی اور رعایت کے ساتھ مدد کرے۔ اور اپنے مشورے سے بھی مستفید ہونے کا موقع دے۔

عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ گھانس برسات کے زمانے میں بہت اوگتی ہے اور اس زمانے میں مویشیوں کی خوراک سے جو گھانس بچ رہتی ہے اُس کو گریوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے تاکہ موسم گرما میں اس سے کام لیا جاسکے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی مقدار اتنی کثیر نہیں ہوتی کہ پورے موسم گرما میں کفالت کرسکے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موسم گرما ابھی ختم نہیں ہوتے پاتا کہ مویشی گھانس کے نہ ہونے سے بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ گھانس کی ہر کمی کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ پیداوار کی مانگ زیادہ ہورہی ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے افتادہ زمینات بھی زیر کاشت آتے جارہے ہیں جو پہلے مویشیوں کی چراگاہ کا کام دیتے تھے اس کے علاوہ جب کبھی قحط نمودار ہوتا ہے تو مویشیوں کی پرورش اہم ہوجاتی ہے۔ قحط میں انسانوں ہی کے لئے جب غذا مشکل سے میسر آئے تو ایسی صورت میں مویشیوں کے لئے غذا کا فراہم کرنا ایک امر محال ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بہت سے مالکان مویشی قحط کی وجہ سے زمینات کی کاشت نہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان ہی مویشیوں کی پرورش کی کوئی صورت نہیں نظر آتی تو وہ مویشیوں کو بنام خدا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں مویشی کچھ دنوں تک ادھر اُدھر پھرتے ہوئے بمشکل

زندہ رہتے ہیں اور بعد ازاں مرجاتے ہیں۔ ایسے ملک میں جس کا زیادہ انحصار زراعت ہو قحط سالی رہا سہا بھرم بھی کھولدیتی ہے۔

اب مویشیوں کی خوراک کے دوسرے جز یعنی کھلی بھوسہ اور بنولہ کے راتب پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بھی بہت قلت ہے اور اس کی قلت کے وجوہ خود ہندوستانیوں کے پیدا کردہ ہیں۔ اگر اس کی طرف توجہ کی جائے تو بہت آسانی کے ساتھ یہ قلت کثرت سے مبدل ہوسکتی ہے۔ جہاں تک کھلی کا تعلق ہے ہندوستان میں ملتھن بہت پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی بیشتر مقدار برآمد کردی جاتی ہے۔ اس برآمد میں فرانس کا بہت بڑا حصہ ہے اور فرانس اس سے خوشبودار تیل اور صابون بناتا ہے اور خوب دولت حاصل کرتا ہے۔ اگر برآمد کی مقدار گھٹا کر ملتھن کی پیداوار کے کچھ حصے سے خود ہندوستان میں کام لیں تو اس سے ہندوستان کو دوہرا فائدہ پہنچیگا۔ پہلے تو یہ کہ یہاں بھی تیل اور صابون کی صنعت جو ابھی عالم طفولیت میں ہے اس کی وجہ سے ضرور ترقی کرے گی اور اس سے ملک کو بہت فائدہ ہوگا دوسرے یہ کہ ملتھن سے تیل نکال لینے کے بعد جو کھلی حاصل ہوتی ہے وہ یہاں کے مویشیوں کے کام آے گی۔ جہاں تک عام تجربہ اور مشاہدہ کا تعلق ہے مویشیوں کے حق میں کھلی مقوی اور لذیذ غذا کا کام دیتی ہے اور اس سے مویشی عمدہ اور طاقتور ہوتے ہیں قطع نظر اس کے ملتھن کی برآمد سے پیداوار خام کی صورت میں جو قیمت اب بحالت موجودہ ملک کو وصول ہورہی ہے اس سے کئی گنی زیادہ قیمت کی ترقی سے وصول ہوسکتی ہے اور پھر ہندوستان روزمرہ استعمال کی چیزوں کے لئے بھی آج جو دیگر ممالک کا دست نگر ہے یہ صورت باقی نہیں رہے گی۔ اور ہندوستان اپنے پاؤں پر آپ کھڑا رہنے کے قابل ہوجائیگا۔ چہ خوش بود کہ برآمد بیک کرشمہ دو کار

اسی طرح نبولہ مویشیوں کے راتب کے کام آسکتا ہے اور خصوصاً جنگ کے بعد سے روئی کی جو مانگ بڑھی اس کی وجہ سے ہندوستان میں روئی کی پیداوار میں خاص توجہ کے ساتھ معتد بہ اضافہ ہوا ہے اور بہت سے غلے کے کھیتوں میں بھی روئی کی کاشت ہونے لگی اس طرح پر مجموعی پیداوار کے لحاظ کرتے ہوئے دنیا میں امریکہ کے بعد ہندوستان کا ہی نمبر ہے۔ افسوس ہے کہ اس کی کثیر تعداد زیادتی قیمت کے لالچ میں برآمد کر دی جاتی ہے جس سے ملک کو بہت زبردست نقصان پہنچ رہا ہے۔ ماہرین نے تحقیقات کر کے یہ اندازہ لگایا ہے بنولے میں اس قدر روغن ہوتا ہے کہ وہ مویشیوں کو پورے پر ہضم نہیں ہوسکتا اور فضلے میں خارج ہوجاتا ہے۔ بنولے کے بجائے اگر اس کی کھلی دی جائے تو مویشیوں کو ویسا ہی بلکہ اس سے زیادہ فائدہ پہنچے اور اس کے سوا قیمتی تیل ہاتھ آئے گا اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر بنولے سے تیل نکلنے لگے تو بحالت موجودہ ہر سال تین چار کروڑ روپئے کا خالص منافع ہوگا۔ اسی طرح بھوسے کی حالت بھی ہے۔ لیکن کوئی ایسی حالت نہیں ہے کہ اگر ہندوستانی ان کی طرف توجہ کریں تو یہ مسئلہ حل نہ ہوسکے بلکہ نہایت ہی آسانی کے ساتھ برآمد کی پالیسی میں ذرا سی تبدیلی کرنے سے یہ خطرناک صورت رفع ہوسکتی ہے۔

مویشیوں کی قلت کا ایک اہم سبب جو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے گو وہ کسی قدر غور طلب ہے۔ یہ کہ مسلمان زیادہ تر گوشت خور ہیں اور ہر سال مویشیوں کی کثیر تعداد صرف اس مقصد کے لئے ذبح کی جاتی ہے۔ یہ اعتراض زیادہ تر ہمارے ہندو بھائیوں کی جانب سے نہایت شد و مد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا حقیقت میں گوشت خواری کی وجہ سے ہندوستان میں مویشیوں کی قلت ہے؟ کیا مسلمان لوگ گوشت کھانا چھوڑ دیں تو مویشیوں کی ترقی ممکن ہے۔ اگر ان سوالات پر ذرا ٹھنڈے دل سے بغیر کسی

جانب داری کے غور کریں تو صاف صاف اس کا پتہ چل جائے گا کہ مسلمانوں کی گوشت خواری ہندوستان میں مویشیوں کی قلت کا باعث نہیں بلکہ حقیقت میں مویشیوں کی نگہداشت کی غیر موجودگی اور حفاظت نسل کے تدابیر کا فقدان اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔ مویشیوں کی قلت سے مراد ہمیشہ عمدہ نسل کے مویشیوں کی غیر موجودگی ہوتی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں بیکار مویشی بہت سے ہیں جن سے زراعت کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ ان کی موجودگی الٹا ملک پر بار ثابت ہو رہی ہے اور اس وجہ سے شاہی زراعتی کمیشن اپنی مرتبہ رپورٹ میں اس کی سفارش کی ہے کہ بیکار مویشیوں کی تعداد میں کمی کی جائے۔ اس کے علاوہ زیادہ تر مویشی جو ذبح کئے جاتے ہیں وہ کبھی طاقتور قوی۔ اور قابل زراعت نہیں ہوتے بلکہ ناقابل زراعت ہوتے ہیں یا ایسے جو کسی اتفاقی اور ناگہانی بیماری کی وجہ سے قصاب کے ہاتھ فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ ذبح نہ کرنے کی صورت میں مالک نہ صرف ان کی اول قیمت سے بھی محروم رہتا ہے۔ بلکہ مرنے پر ان کے اٹھوانے کے اخراجات کا بار بھی اس پر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ گوشت کی قیمت کا اندازہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور جو قصاب کے ہاتھ فروخت ہوتے ہیں وہ اغراض کاشت کے لئے زیادہ تر ناکارہ ہوتے ہیں اور ناکارہ مویشیوں کی قیمت کارآمد مویشیوں کی مساوی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ قطع نظر اس کے کبھی خشک سالی سے مجبور ہو کر اور کسی افلاس سے تنگ آکر بھی مالک اکثر قصاب کے ہاتھ اپنے عمدہ مویشی فروخت کر دیتا ہے۔ جو ہر طرح سے کارآمد ہوتے ہیں اور ایسی مویشیوں کی قصاب کے ہاتھ فروخت ہونے سے زراعت کو بہت کچھ نقصان پہنچتا ہے۔ یہہ صورتِ حال بہت خطرناک ہے اور اس کے انسدادی تدابیر کا اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔ زرعی انجمن ہائے امداد باہمی سے قیام سے جو بہت کم شرح سود پر کاشتکار کو قرضہ دے سکیں یہہ خرابی ایک حد تک دور ہو سکتی ہے۔

اس قسم کی چند انجمنیں پنجاب میں قائم ہوئی ہیں اور وہاں وہ بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اسی طرح احاطۂ بمبئی میں بھی ان کا مستقبل نہایت شاندار نظر آرہا ہے۔ لیکن صوبجات متحدہ اور متوسط میں تھوڑے ہی عرصے کے قیام کے بعد یہ انجمنیں ناکام ثابت ہوئیں۔ شاہی زرعی کمیشن کے ممبروں کی رائے ہے کہ جہاں تک ہو سکے ممکنہ طور پر اہل ملک ایسی انجمنوں کی امداد کریں تاکہ وہ ملک کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوسکیں۔

ہندوستان میں بہ نسبت مسلمانوں کے ہندوؤں کی آبادی بہت زیادہ ہے اور ہندوؤں کے مذہب کے مطابق گاؤکشی ممنوع ہے۔ اس لئے ہماری ہندو بھائی گاؤکشی سے آزردہ خاطر ہوتے ہیں۔ لہذا انہیں ذبح ہونے سے بچانے کے لئے گاؤسالے قائم کرتے ہیں۔ جہاں کہ ناقابل زراعت اور ناکارہ مویشیوں کو ان کے مالک سے بہت کم قیمت پر خرید کر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اپنی قوم سے چندہ جمع کرکے گاؤسالے کے اخراجات پورا کرتے ہیں لیکن اس میں سب سے پہلی خرابی تو یہ ہے کہ چندہ اتنا جمع نہیں ہوتا کہ ملک کے تمام ناکارہ اور ناقابل زراعت مویشی گاؤسالے میں پرورش پاسکیں اور ذبح ہونے سے بچ جائیں۔ بعض قومی لیڈروں نے ان گاوسالوں کی چشم دید حالت یوں بیان کی ہے کہ یہاں مویشی زمین چاٹتے رہتے ہیں اور انہیں معمولی سے معمولی چارہ بھی کھانے کے لئے میسر نہیں ہوتا ایسی حالت میں وہ چند دن بعد بھوک کی مصیبت برداشت کرتے ہوئے عالم جاودانی کی راہ لیتے ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ مویشیوں کو اس طرح بتدریج مصیبت دیکر مارنے کے بجائے ایک دن ذبح کرکے دوامی نجات دیدیجائے۔ اس کے علاوہ ان گاؤسالوں کے قیام سے دو خرابیاں اور بھی پیدا ہوتی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ ان مویشیوں کی موجودگی کی وجہ سے قابل زراعت مویشیوں کی غذا کا ایک معتدبہ حصہ کم ہو جاتا ہے جس کی وجہ ہندوستان میں مویشیوں کی ترقی نہیں ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غذا کے کم یا عمدہ نہ ملنے

کی وجہ سے عمدہ مویشی بھی بہت جلد ناکارہ ہو جاتے ہیں اور اس سے زراعت کو نقصان پہنچتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان ناکارہ مویشیوں سے آبادی کے لئے گوشت کی صورت میں جو غذا مہیا کی جاتی تھی وہ بھی پوری نہیں ہوتی۔ ہندوستان کے مشہور ماہر معاشیات پروفیسر کالے KALE اپنی کتاب AN INTRADUCTION TO INDIA ECONOMICO میں لکھتے ہیں کہ "اگر گاؤکشی کی ممانعت قانوناً نہ صرف معاشی بلکہ دوسرے اسباب کی بنا پر ناممکن ہے اس میں شک نہیں کہ جانوروں کے ذبح کرنے سے اور خصوصاً گاؤکشی کی وجہ سے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگتی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کاروباری نقطۂ نظر سے کم تعداد عمدہ اور طاقتور مویشیوں کا ہونا بہ نسبت زاید فاقہ کش اور ناکارہ مویشیوں کے بہتر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذہبی احساسات کو بالکل نظر انداز نہ کرکے عمدہ جانوروں کو ذبح کرنے سے احتیاط کی جائے" اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے مویشیوں کا ذبح کرنا ہندوستانی زراعت کے لئے بہت نقصان دہ ہے۔

اس کے علاوہ مویشیوں سے متعلق یہاں ڈیری فارم کے طریقے کو ابھی پوری طور پر رواج نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کام کو چند گولی انجام دیتے ہیں جن کا یہ موروثی پیشہ ہوتا ہے اور اسی پر ان کی گزر اوقات کا مدار ہوتا ہے۔ حالانکہ ڈیری فارم کے قیام سے ملک میں بہت سے ترقی کی ذرائع کھل سکتے ہیں۔ کھیتوں کے لئے مویشیوں کا فضلہ کھاد کا کام دیتا ہے جس سے زراعت میں بھی ترقی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مسٹر ڈبلیو سمتھ W.SMITH جو کہ ڈیری فارم کے ماہر مانے جاتے ہیں ہندوستان کی لاپروائی اور مویشیوں کے انحطاط نسل اور ڈیری فارم کی غیر موجودگی کے متعلق اپنی رائے کا اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ گزشتہ پچاس برس کے عرصے میں جزائر برطانیہ، فرانس اور جرمنی نے ڈیری فارم کا طریقہ کثرت سے اپنے ملکوں میں جاری کیا جس کی وجہ سے انکی زراعت میں بہت ترقی ہوئی اور

دولت سے مالا مال ہو رہے ہیں لیکن ہندوستان میں اس کی کمی ہے اور بہت سخت توجہ کی ضرورت ہے! یوں تو ہمارے ہندو بھائی گائے کے بہت طرفدار ہیں اور گائے کو توماتا کہتے ہیں لیکن تعجب اور اس کے ساتھ ہی افسوس بھی ہے کہ انھوں نے دودھ کمپنی کے کارخانوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کی اس میں گائے بھی پرورش ہوتیں اور منافع بھی کثیر ملتا۔ قطع نظر اس کے عمدہ دودھ گھی اور مکھن رہم رسانی ایک لحاظ سے ملکی خدمت بھی ہے کیونکہ تندرستی و طاقت ان سے بہت کچھ وابستہ ہے اور خصوصاً آج کل جبکہ ان چیزوں میں عجیب عجیب طریقوں سے میل ملاو شروع کر دیا گیا ہے اور شہروں میں خالص گھی اور دودھ کا ملنا ایک امر محال ہے جس سے عام طور پر ملک کی طاقت اور توانائی گھٹ رہی ہے۔ اس لئے ڈیری فارم کے قیام کی نسبت جتنا بھی لکھا جائے اور جتنی بھی توجہ کی جائے بہت کم ہے۔

گائی اور بھینسوں کا پالنا، اور ان کے دودھ، گھی، مکھن کی تجارت کرنا عام طور پر ہندوستان میں حقیر نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کام انجام دینے کی قابلیت فطری طور پر گولیوں ہی میں موجود ہے اور دوسرے اس کام کو انجام نہیں دے سکتے لیکن ہندوستانیوں کو اس خیال خام سے باز آنا چاہئے اور بہت جلد بیدار ہو کر اس پرمنفعت پیشے کو اختیار کرنا چاہئے۔ چونکہ ابھی پوری طور پر اس کا رواج نہیں ہوا ہے اس لئے بعض کی ہمت نہیں بندھتی کہ وہ اس کام میں سب سے پہلے قدم رکھیں۔ لیکن بلند ہمتی شرط ہے اگر کوئی اپنی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی سے اس کام کو شروع کر دے تو وہ ضرور اس میں کامیاب ثابت ہوگا۔ سویڈن، ڈنمارک۔ سوئٹزرلینڈ یورپ کے یہ چھوٹے چھوٹے ملک خاص کر اسی دودھ کمپنی کی تجارت کی بدولت تمے اس قدر خوشحال اور دولتمند بنے بیٹھے ہیں کہ ہندوستان جیسا وسیع ملک جو بجائے خود ایک براعظم کہا جا سکتا ہے اور نیز رشک کرتا ہے۔ وہاں اس کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہیں ہزارہا گائیں خاص اہتمام سے پرورش کی جاتی ہیں۔ سائنس کے طریق سے دودھ

مکھن پنیر وغیرہ تیار ہو کر دور دراز ملکوں تک جاتا ہے۔

ہندوستان میں جو کچھ بھی دودھ گولی فراہم کرتے ہیں وہ سب کا سب گھی نکالنے یا دہی مکہ یا مٹھائی بنانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں تازہ دودھ کی بہم رسانی کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بمبئی، کلکتہ اور صوبجات متحدہ میں سالانہ فی کس دودھ کا مصرف علی الترتیب ۷ء ۸ اور ۱/۲ ۶ گیلن ہے۔ یہاں خالص دودھ کی قیمت بہت زیادہ ہے اور اگر یہ قیمت گھٹا کر آدہی کر دی جائے تو ایسی صورت میں بلاشبہ دودھ کا مصرف دوگنا ہو جائے گا۔ اور خصوصاً چند سال سے لوگوں میں چاء پینے کی جو عادت پھیل رہی اور پھیل چکی ہے اس کی وجہ سے بھی دودھ کی طلب میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے لیکن رسد کم ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ رسد اور طلب میں توازن قائم کیا جائے۔

حال کی تحقیقات اور تازہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکاروں کے پاس جو گائیں اور بھینسیں رہتی ہیں وہ اتنا دودھ دیتی ہیں کہ اُس سے خود کاشتکاروں کے گھر بار کے مصارف ہی نہیں پورے ہوتے اور دودھ کی یہ مقدار خود اُن کے مصرف کے لئے ناکافی ہوتی ہے۔ لہذا ایسی صورت میں گایوں اور بھینسوں کی پرورش کا مسئلہ تاکہ وہ زیادہ دُودھ دیں بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ سائنٹفک طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر کسی گائے کو عمدہ طور پر پرورش کریں تو وہ ایک سال کے عرصے میں اپنے بچے کو کافی مقدار میں دودھ پلا کر ایک ہزار سے ایک ہزار پانچسو پونڈ تک دودھ دے سکتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں ایسے ہی گائیوں کی سخت ضرورت ہے۔ ہندوستان کے بعض اضلاع ایسے ہیں جہاں ایسے جانور بہت عام ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں کی آب و ہوا ان کے موافق ہے اور مناسب گھانس اور راتب بھی ملتا ہے مثلاً جنوبی کاٹھیاوار کی جھاڑیاں اور جنگل۔ کراچی میں چالیس پچاس میل کے اطراف۔ مدراس میں ضلع نیلور اور دریائے کرشنا کی وادی۔ پنجاب میں دہلی۔ رہتک اور ہانسی حصار۔ اودھ میں کوسی اور چھتا۔

صوبہ آگرہ میں علیگڈہ ۔ میرٹھ میں وہ مقامات ہیں جہاں کی گائیں بہت دودہ دینی والی ہوتی ہیں
ان کے علاوہ بعض اور اضلاع میں ایسے جانور عام طور پر تو نہیں پائے جاتے ۔ لیکن اگر وہاں
خاص طور پر انتخاب کیا جائے تو ایسے جانور وہاں سے بھی مل سکتے ہیں اور بعض ایسے بھی اضلاع ہیں
جہاں گائیوں اور بھینسوں کو اپنے بچوں کا پرورش کرنا محال ہے۔ غرض ان صورتوں میں پہلے
تو جہاں ایسے جانور پائے جاتے ہیں ان کی نگہداشت کرنا اور دوسرے جہاں نہیں پائے جاتے ہیں
وہاں ایسے اسباب مہیا کرنا جن کی وجہ سے وہاں کے جانور بس اس قابل ہو جائیں بہت ضروری ہیں
اس طور پر یہ ڈیری فارم کے طریقے کو رواج دینے میں اس امر کا ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ
ایسے گائیں اور بھینس پرورش کی جائیں کہ جو اپنے بچھڑوں کو کافی مقدار میں دودہ پلاکر مالک
کے لئے بھی نفع کا باعث ثابت ہوں اس سے ایک تو ملک میں ڈیری فارم کے طریقے کو رواج ہوگا
اور دوسرے یہ کہ زراعت کے لئے عمدہ اور طاقتور مویشیوں کی کمی نہیں رہیگی۔ یہاں عام طور پر جو خرابی
پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کاشتکار عموماً گائے اور بھینسوں کو صرف بچھڑے پیدا کرنے کا آلہ سمجھتا ہے اور
اسی کو اہمیت دیتا ہے اور اس کے دودہ کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتا۔ اٹلی میں آج کل دودہ کی
طلب کا مسئلہ اہم ہوگیا ہے اس لئے وہاں کے لوگوں کو اس کا خاص طور پر خیال پیدا ہوگیا ہے
کہ عمدہ قسم کے زائد دودہ دینے والے مویشی مہیا کئے جائیں بعض ماہرین فن کا خیال ہے کہ
اٹلی میں جو مویشی مہیا کئے جا رہے ہیں یا کئے گئے ہیں وہ جنوب مشرقی پنجاب کے مویشیوں سے
زیادہ مشابہت رکھتے ہیں اس سے ممکن ہے کہ وہ مشرقی النسل ہی ہوں۔ اس خیال کے یہاں ظاہر
کرنے سے مطلب صرف یہ ہے کہ جب مشرق یا ہندوستان کے دوسرے ممالک کام لیکر دولت پیدا
کر رہے ہیں تو ہندوستان کو تو خصوصاً اس میں خاص دلچسپی لینی چاہیئے اور اپنے ملک کی قدرتی دولت
کو اس طرح لاپروائی اور بے توجہی کا شکار نہ ہونے دیں ۔ اس کے ساتھ زرعی کمیشن کی رائے کی
موافق ڈیری فارم کے طریقے کو ترقی دینے کے لئے اس امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ عمدہ اور زائد

دودھ دینے والی گائیں اور بھینسوں کی پرورش ایسے مقامات میں ہو جہاں راتب اور چارہ باسانی مہیا ہو سکے تو ایسی صورت میں دودھ کم قیمت پر فروخت ہو سکیگا اور صنعت کو بہت ترقی ہو سکیگی۔

بحالت موجودہ بنگلور میں ڈیری فارم کا ایک امپیریل انسٹیٹیوٹ قائم ہے لیکن اس کی حالت قابل اطمینان نہیں اور اُس کے اسٹاف میں تبدیلی اور اضافہ کی ضرورت ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ نے ماہرین فن نے اپنے طویل تجربے کی بنا پر یہ قطعی رائے ظاہر کی ہے کہ ہندوستان میں ڈیری فارم کی کاروبار کی ترقی کے لئے بہت مواقع موجود ہیں اور ایسے صرف چند خاص خاص بڑے شہروں تک ہی محدود نہیں رکھا جا سکتا بلکہ جہاں کہیں بھی مویشی پائیں جائیں وہاں یہ کاروبار چند خاص حالات کے تحت ضرور ترقی کر سکتا ہے اور اسے صوبہ واری حکومتیں اپنے طور پر انجام دے سکتی ہیں۔ اگر ہر ایک صوبہ داری کالج اپنے طالبعلموں کو ڈیری فارم کے معلومات اور اس کی منفعت بخش تجارت سے آگاہ کرے تو بہت بہتر اور مفید ہوگا۔

کچھ روز سے جدید طرز کے چند دودھ مکھن کے کارخانے کھلنے شروع ہوئے ہیں چنانچہ علیگڈھ بمبئی۔ احمد آباد۔ دارجیلنگ اور دیگر مقامات میں ان کا نام جاری ہے۔ خصوصاً علیگڈھ کے کمپنی اور نیز ہندوستان میں سب سے پہلے نام لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی انتظام کرے تو امداد باہمی کے طریق پر ایسے کارخانے بخوبی چل سکتے ہیں۔ ناگپور اور بنارس میں اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے لیکن یہ مذکورۂ بالا کارخانے ہندوستان جیسے ملک میں جو کہ بہت وسیع ہے بلحاظ تعداد بہت ناکافی ہیں اور اسی قسم کے دیگر کارخانوں کے قیام کی بہت سخت ضرورت ہے تاکہ ملک میں اس کاروبار کو فروغ دینے کے لیے جو قدرتی مواقع حاصل ہیں ان سے پورے پورے طور پر فائدہ اٹھایا جا سکے۔

مختصراً یہ کہ ہندوستان میں مویشیوں کی ترقی اور زراعت کو کامیاب بنانے کے لیئے ضروری ہے کہ عمدہ نسل کے قوی اور طاقتور مویشی پرورش کئے جائیں۔ ان کے نقل و حمل

میں احتیاط برتی جائے تاکہ متعدی بیماریاں عالمگیر نہ ہونے پائیں۔ کاشتکار جو مفلس اور جاہل ہیں وقت بیوقت ڈاکٹروں کے طبی مشورے سے مستفید ہوتے رہیں۔ وسائل خوراک کا کافی انتظام کیا جائے اور اس کے مہیا کرنے میں جو موانعات پیش آتے ہیں انہیں دور کیا جائے۔ عمدہ و کارآمد جانور جو اتفاقی حادثات کی بناء پر قصاب کے ہاتھ فروخت کئے جاتے اور ذبح کئے جاتے ہیں نہ کئے جائیں اور خاص احتیاط کو کام میں لایا جائے۔ آخر میں ڈیری فارم کے طریقے کو رواج دینے کی ممکنہ کوشش کی جائے تاکہ اس سے ملک کو فائدہ ہو اس طریقے یا کاروبار کی ترقی میں اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ زائد دودھ دینے والی گایوں کی پرورش مناسب مقامات پر ہو تاکہ مصارف کی کمی سے دودھ ارزاں فروخت ہو سکے۔ یہی وہ وجوہ ہیں جن کی کمی کی بناپر ہندوستان میں مویشیوں کی حالت بہت خراب ہے اور چونکہ مویشیوں میں زراعت کا دارومدار ہے اس لئے یہاں کی زراعت میں ترقی نہیں ہو رہی ہے۔ اگر ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے تو پھر مویشیوں کا مسئلہ اسقدر پھر دشوار نہ رہے گا جتنا کہ آج کل نظر آتا ہے اور ساتھ ہی زراعت میں ترقی ہو گی۔

روح اور رقص

از

جناب ڈاکٹر یوسف حسین صاحب پروفیسر تاریخ کلّیہ جامعہ عثمانیہ

ناظرین مجلۂ عثمانیہ کے لئے فرانس کے مشہور شاعر اور ادیب پال ویلری کی نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ ترجمہ ویسے ہی بہت مشکل چیز ہے اور پھر پال ویلری جیسے انشا پرداز کے خیال و زبان کی ترجمانی اور بھی زیادہ دشوار ہے۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے تمثیلی رنگ میں لکھتا ہے اور اس لئے اور بھی کہ اپنے خیال کی قوت اور گہرائی اور بیان کی ندرت کے اعتبار سے اُس نے اپنے طرز کی ایک نئی راہ سب سے الگ نکالی ہے۔ اس کے آرٹ میں کبھی کبھی یونانی جمالیاتی رنگ کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے چنانچہ ذیل میں جس مکالمے کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے اس کے سب اشخاص یونانی ہیں۔

ارکسماک۔ ارے سقراط! میں مرا جارہا ہوں۔ مجھ میں روح پھونک اور میرے دماغ کو خیال سے لبریز کردے۔ اپنی چُبھتی ہوئی پہیلیاں مجھے بھی تو سُنا! .... یہ روز روز کی خور و نوش نے میری ساری بھوک پیاس مٹا ڈالی جن پر مجھے کبھی ناز تھا! انسان کی یہ بے بسی بھی عجیب ہے کہ دنیا کی نعمتوں کے ساتھ اسے ایک معدہ بھی ورثہ میں ملتا ہے! ...... اسوقت میری روح کی مثال اِس

خواب کی سی ہے جو مادہ خود اپنے آپ سے متصادم ہوتے وقت دیکھا کرتا ہے!۔۔۔۔ اے دنیا کی نعمتو! خدارا اب میرا پیچھا چھوڑ دو!۔۔۔۔۔ حیف صد حیف! سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی ہم سب ان دنیاوی لذات کا شکار ہونا شروع ہو گئے۔ ان نعمتوں سے اب میرے دل کو دہشت ہونے لگی ہے۔ زمانہ انہیں یہاں تک پھیلاتا بڑھاتا ہے کہ ان کے وجود سے آخر کوفت ہونے لگتی ہے۔۔۔۔۔ قصہ مختصر یہ کہ میرا دل خشک، سنجیدہ اور روحانی باتیں سننے کے لئے بے تاب ہے!۔۔۔۔۔ مجھے اپنی اور فیدر کی صحبت میں بیٹھنے کی اجازت دے۔ میں نے تر و تازہ گوشت کے کھانوں اور ان جاموں سے منہ موڑ لیا جن کی شراب کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ اب مجھے اپنی روح کے ساغر کو اپنی باتوں کی شراب سے بھر لینے دے۔ اچھا یہ کہو تم دونوں ابھی ابھی کیا باتیں کر رہے تھے؟

فیدر۔ کچھ نہیں۔ یوں ہی ہم دونوں کھڑے اپنے ہم جنسوں کے ناؤ نوش کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

ارکسمک۔ شاید سقراط نے اتنی مہلت ہی نہیں دی ہوگی کہ کسی مسئلہ پر غور ہو سکے؟۔۔۔۔۔ اب وہ اسوقت اپنے وجود کی تنہائی میں براج رہا ہے اور اسکی خاموشی اس بلا کی ہے کہ شاید اس کے ڈانڈے اس کی روح سے جا کر ملجاتے ہیں۔ وہ محفلِ ضیافت کے سرے پر الگ تاریکی میں کھڑا مسکرا رہا ہے جیسے کوئی اپنے ہمزاد کی طرف دیکھکر مسکراتا ہو۔ پیارے سقراط! بتا، تیری اس بڑبڑاہٹ سے کیا مراد ہے؟

سقراط۔ میں چپکے چپکے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ آدمی جو خوب کھائے پیئے اس سے بڑھکر دنیا میں کوئی انصاف پسند نہیں ہے۔

ارکسمک۔ دیکھا نہ! اس نے باتوں باتوں میں اپنی چیستان کہہ ڈالی۔ یہ چیستان روح میں ایک طرح کی اشتہا پیدا کرتی ہے۔

سقراط۔ میری بڑبڑاہٹ کا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص جو کھاتا ہے اپنی ذات کے خیر و شر دونوں کو غذا پہونچاتا ہے۔ ہر لقمہ جو اس کے منہ میں گھل کر اسکے جسم میں تحلیل ہوتا ہے اسکی نیکیوں اور اس کی بدیوں

دونوں کے لئے بلا کسی امتیاز کے باعث تقویت ہوتا ہے۔ اس لقمہ سے ایک طرف تو اس کی کلفتوں کو غذا ملتی ہے اور دوسری جانب اس کی تمناؤں کو۔ اور پھر وہی لقمہ جذبات و عقل میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اس ایک لقمہ کی محبت بھی اسی طرح محتاج ہے جیسی کہ نفرت۔ میری مسرت اور میری کلفت، میرا حافظہ اور اس کے سارے منصوبے آپس میں اس لقمہ کو اس طرح سے بانٹ لیتے ہیں جیسے بھائی بھائی آپس میں کسی مٹی بھر چیز کو تقسیم کرلیں۔ اکومن کے فرزند تیری اس معاملہ میں کیا رائے ہے؟

ارکسمک۔ میری رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں میں بالکل تیرا ہم خیال ہوں۔

سقراط۔ تو طبیب ہے۔ اسی واسطے تجھے بتاتا ہوں کہ میں الگ چپ چاپ کھڑا ان سب لوگوں کے جسموں کے اعمال کی تعریف کر رہا تھا کہ کس خوبی سے وہ اپنا تغذیہ کرتے ہیں۔ یہ سارے اجسام، غیر دانستہ طور پر، کس انصاف پسندی سے اس مادہ کو اپنے اندر سمو رہے ہیں جس کی بدولت زندگی کے مواقع اور موت کے جراثیم، جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں، انہیں حاصل ہو جائینگے۔ انہیں اس کا کیا پتہ کہ وہ کیا کر رہے ہیں اس وقت وہ جو کچھ کر رہے ہیں دیوتاؤں کی طرح بے نیازی سے کر رہے ہیں۔

ارکسمک۔ تو نے جو ابھی بیان کیا میں اسے مدتوں سے مشاہدہ کر رہا ہوں۔ جو کچھ کہ انسان کے جسم کے اندر جاتا ہے وہ بہت جلد اپنے مقدر کے موافق ایک خاص صورت اختیار کرلیتا ہے۔ یوں کہئے کہ آدمی کے حلق کی مثال تلون پذیر احتیاجات اور منظم رمز کی چوکھٹ کی سی ہے۔ اسی چوکھٹ پر آکر انسانی ارادہ اور علم و حکمت کی حتمی فرمانروائی کی بے بسی نظر آتی ہے اسی واسطے میں نے اپنے پیشے کے برتنے میں ان سب ناقابل اعتبار خوردنی مرکبات کا استعمال ترک کر دیا جو ادنیٰ درجے کے طبیب اپنے مریضوں کو بتایا کرتے ہیں۔ اور میں تو اب علاج کے ان بدیہی طریقوں کا قائل ہو گیا ہوں جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ فطری طور پر منسلک ہیں۔

فیدر۔ یہ علاج کے کون سے طریقے ہیں؟

ارکسمک۔ ان کی تعداد آٹھ ہے۔ گرمی، سردی، پرہیز اور بدپرہیزی، ہوا، پانی، آرام اور حرکت

بس' ان کے باہر اور کوئی علاج کا طریقہ نہیں ۔

سقراط۔ مگر روح کے علاج کے صرف دو طریقے ہیں ۔

فیدر۔ وہ کیا ہیں ۔

سقراط۔ سچ اور جھوٹ ۔

فیدر۔ یہ کیونکر ؟

سقراط۔ سچ اور جھوٹ کی مثال بیداری اور نیند کی سی ہے ۔ جب تجھے کوئی بھیانک خواب دکھائی دیتا ہے تو کیا تو بیداری اور نور کی روشنی کا سخت آرزومند نہیں ہوتا ؟ سورج کا وجود ہمیں نئی زندگی بخشتا ہے اور جب ٹھوس اجسام کو ہم اپنے سامنے دیکھتے ہیں اس وقت ہمارے حواس ٹھکانے آتے ہیں ۔ پھر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ نیند اور خواب کے ذریعہ سے ہم اپنی کلفتوں کو رفع کرلیتے ہیں ۔ اُن کی بدولت زندگی کے اُن دُکھوں سے تھوڑی دیر کے لئے ہمیں نجات ملجاتی ہے جو دن کی روشنی میں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ اور ہم سب کی حالت یہ ہے کہ ہمیں قرار نہیں ۔ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے ہیں ۔ ہماری خلقت کچھ ایسی ہے کہ ہم رات کے وقت دن اور روشنی کے وقت تاریکی کے متمنی رہتے ہیں ۔ ایک طرف ہمارا ذوق آگہی ہے اور دوسری طرف نشاط بے خبری ۔ موجود میں ہمیں لاموجود کی تلاش رہتی ہے اور لاموجود کا تخیل ہماری موجودہ حالت کے لئے باعث تسکین ہوتا ہے ۔ کبھی ہمیں حقیقت کی دُھن ہوتی ہے اور کبھی ہم مایا کے پھندے میں گرفتار ہوتے ہیں ۔ غرضکہ اس ساری تگ و دو میں روح کے لئے صرف ایک سرچشمہ تسکین ہے اور وہ حقیقت ہے ۔ یہی اس کا ہتیار ہے اور غیر حقیقت اس کی زرہ بکتر ۔

ارکسمک۔ پیارے سقراط' بہت خوب ! .... مگر کیا تجھے ان نتائج کا خوف نہیں جو تیرے اس خیال کے ساتھ وابستہ ہیں ۔

سقراط۔ وہ کونسے نتائج ہیں ۔

ارکسمک۔ تیری باتوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ تیرے نزدیک سچ اور جھوٹ دونوں کا منتہا ایک ہی ہے ...... دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی شے اپنی الگ الگ نوعیتوں کے اعتبار سے کبھی ہمیں جھوٹا بنا دیتی ہے اور کبھی سچا۔ سچ اور جھوٹ کی اور ان مختلف انسانی ارادوں کی مثال جو ان سے پیدا ہوتے ہیں گرمی اور سردی سے ملتی جلتی ہے۔ کہ یہ ممد حیات بھی ہیں اور مہلک بھی۔

سقراط۔ تو نے جو کچھ کہا بالکل ٹھیک ہے۔ میں اسمیں مطلق مزید اضافہ نہیں کر سکتا۔ خود زندگی کا یہ منشا ہے کہ سچ اور جھوٹ دونوں پہلو بہ پہلو رہیں۔ تو طبیب ہونے کی حیثیت سے مجھ سے زیادہ واقف ہے کہ زندگی اپنے وجود کی خاطر ہر چیز سے استفادہ کرتی ہے۔ اسے ہر چیز بھاتی ہے اگر اسے کسی بات سے چڑ ہے تو قطعی نتیجے پر پہونچنے سے ہے۔ اپنی ہستی کے سوا وہ اور کسی نتیجہ کو نہیں جانتی۔ یہ زندگی کی حرکت بھی کیسی پُر اسرار چیز ہے! اس حرکت کا ان واقعات کے چکر سے گہرا تعلق ہے جو اندر ہی اندر ہم میں پیہم تبدیلیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس چکر میں معاً مجھے اسکا احساس ہوتا ہے کہ میں وہی ہوں جو در اصل میں ہوں، یعنی سقراط یہی احساس میری خودی کا ضامن ہے۔ اصل میں زندگی کی مثال اس رقاصہ کی سی ہے جو رقص کر رہی ہو۔ وہ اپنی بے پناہ برہنگی سے ہمیں اپنی بزرت تھرک دکھاتی ہے۔ اسوقت وہ ایک ملکوتی ہستی معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ انسان کی یہ بے بسی ہے کہ ہم محدود تک اسکی پہونچ نہیں، نہ عالم خواب میں اور نہ بیداری کی حالت میں، اسی واسطے یہ رقاصہ روپ بدلکر بھی وہی ہستی ہے جو وہ در اصل ہے۔ اُس نے حباب' چڑیا اور خیال کے روپ بھرنا چھوڑ دیا۔ اب اُس نے بس اپنی وہی صورت رکھی ہے جو بانسری (موسیقی) کے دل کو بھائے۔ اس لئے کہ وہی زہن جس نے اسے ہمارے پاس بھیجا تھا اب اسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ وہ آتی ہے مگر اس حالت میں کہ اپنی نسوانی فطرت اور اپنے یار کے خیال سے اس کی سانس اکھڑی ہوئی ہے۔

فیدرر۔ اس شخص کی ہر بات ایک معجزہ ہے! سقراط تو آدمی نہیں ایک عجیب پُر اسرار ہستی ہے تو نے

بس ذرا اپنی زبان ہلائی اور وہ سب کچھ پیدا ہوگیا جس کی ہم سبھوں کو ضرورت ہے! ...... تیرے تصورات خالی تصورات ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کی حیثیت اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہوتی ہے! اگر میں انہیں ٹھیک ٹھیک بیان کروں تو یوں کہونگا کہ تیرے تخلیقی منہ سے ایک شہد کی مکھی نکلتی ہے۔ وہ دیکھو، شہد کی مکھی آئی شہد کی مکھی آئی، شہد کی مکھی! وہ دیکھو، ناچنے والیوں کی سنگت آرہی ہے۔ انیں سے ہر ایک کے پر بھی ہیں۔ ان کی آمد آمد سے ساری فضا میں بھنبھناہٹ رگمنج پیدا ہوگئی۔ شعلیں جل رہی ہیں۔ سونے والوں کی بڑبڑاہٹ بھی اب ویسی نہیں رہی جیسے پہلے تھی۔ متحرک شعلوں کی دیواروں کو دیکھکر دُھت بہ ستون کے سائے حیران و پریشان ہیں! ...... اس سنگت کو ذرا دیکھو جو ادھر آرہی ہے۔ اُن کے انداز میں ظرافت اور متانت دونوں گھلی ملی ہیں۔۔۔ سب اسطرح آرہی ہیں جیسے ارواح آتی ہوں۔

سقراط۔ دیوتاؤں کی قسم ان ناچنے والیوں کے جسم کیسے نورانی ہیں! .... ان کی صورت میں اعلیٰ ترین تخیلات نہایت دلکش انداز میں ہم سے اپنا تعارف کرارہے ہیں! .... ان کے ہاتھ بولتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاؤں کچھ لکھ رہے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے جسم کی لچک والی قوتوں کو کس صحت و خوبی سے استعمال کرنا سیکھا ہے! ...... اُنہیں دیکھکر میرے ذہن کی ساری اُلجھنیں دور ہوگئیں۔ میں ان بولتی تصویروں کے لوچ اور بہاؤ میں خود ایسا بہا چلا جارہا ہوں کہ اسوقت کوئی ایسا مسئلہ مجھے یاد نہیں پڑتا جس کا حال مجھے معلوم نہو میں اس عالم میں ہوں جہاں یقین بچوں کا کھیل ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہ ناچنے والیاں نہیں بلکہ علم و حکمت کی عملی تصویریں ہیں یا شعور حیات نے اپنی فطری جلوہ گری اور خوش ادائی کے لئے ان کا بھیس اختیار کیا ہے! ...... ذرا اسے دیکھو، وہ جو ادھر ہماری طرف آرہی ہے اوہ ان سبھوں میں سب سے زیادہ دُبلی پتلی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خود اپنے بے عیب پچھے تلے پن میں غرق ہوگئی ہے! ...... نہ معلوم اسکا کیا نام ہے؟ ...... اس کے جسم کی سختی میں ایک کیف ہے اور اس کی لچک اس بلاکی ہے کہ جس کے آگے بیان اپنی بے بسی کا اقرار کرتا ہے! ...... وہ کبھی جھکتی ہے کبھی تنتی ہے اور تال کو اُسنے ایسا قابو میں کرلیا ہے

کہ اگر میں آنکھیں موند بھی لوں تب بھی صرف آواز سنکر اُسے دیکھتا رہوں۔ اس کی آہٹ سے میں اُسے پا لوں
اور ایسا پاؤں کہ پھر وہ کبھی میرے پاس سے گم نہ ہو۔ اور اگر میرے کانوں میں ڈھٹے ٹھوس دیئے جائیں اور
صرف وہ میری آنکھوں کے سامنے ہو تو میں ستار کی دُھن سنتا رہوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بجائے خود
وہ ایک نشے اور وزن کی دنیا ہے۔

فیدر۔ جس نے تجھے مسحور کر رکھا ہے۔ اس کا نام میری دانست میں 'رہو دوپس' ہے۔

سقراط۔ اس کا نام رہو دوپس ہے خیر۔ اس کے کان اور ساز کی کھونٹی میں ایک عجیب پر اسرار رشتہ ہے۔
اس کی ہر جنبش کس قدر بچی تلی ہے اس نے عہد عتیق کے نغموں میں روح شباب پھونک دی ہے!

ارکسمک۔ فیدر، نہیں ایسا نہیں! رہو دوپس دوسری ہے۔ وہ تو ایسی گداز ہے کہ آنکھ تک کو اس سے
ہم کنار ہونے میں ایسا لطف آتا ہے کہ وہ اس پر سے ہٹنا ہی نہیں چاہتی۔

سقراط۔ پھر یہ پھرتیلی۔ دبلی سوکھی بلا کون ہے؟

ارکسمک۔ اس کا نام رہو دونیا ہے۔

سقراط۔ اس کا نام رہو دونیا ہی سہی۔ مگر اس کے کان اور ساز کی کھونٹی میں کیسا پر اسرار رشتہ قایم ہے۔

ارکسمک۔ میں تو ان میں سے ہر ایک کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کہو تو ابھی تمہیں ان سبھوں کے، ایک ایک کرکے
نام بتا دوں۔ ان کے نام یاد رکھنے کے لئے میں نے ان کے ناموں کا چھوٹا سا گیت بنا لیا ہے۔ وہ گیت یہ ہے

پنس، پھوٹے، نیما
نکترس، پنھلے، نکسس
رہو دوپس، رہو دونیا، پتیلے

اس گیت میں نتاریون کا نام رہ گیا۔ یہ وہی ہے جو ان ناچنے والیوں میں سب سے پستہ قد اور
بدصورت ہے! . . . . . . مگر اس سنگت کی رانی تو ابھی آئی ہی نہیں۔

فیدر۔ ان شہد کی مکھیوں کی رانی کا کیا نام ہے؟

ارکسمک۔ اس کا نام اتھتکے ہے۔ اس کے ناچ کو دیکھکر انسان کی عقل پر انتہائی استعجاب وحیرت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

فیدر۔ تو تو ان سبھوں سے خوب واقف نکلا!

ارکسمک۔ ان دلکش ہستیوں کے، ان ناموں کے علاوہ اور دوسرے نام بھی ہیں۔ ان ناموں میں سے بعض ان کے والدین کے رکھے ہوئے ہیں اور بعض ان کے یار آشناؤں نے رکھے ہیں۔

فیدر۔ معلوم ہوتا ہے تیرا بھی اس دوسرے زمرہ میں شمار ہے، اسی واسطے تو ان کے حالات سے استقدر باخبر ہے!

ارکسمک۔ ہاں، میں انہیں ایسا جانتا ہوں جسے جاننے کا حق کہتے ہیں۔ اور سچ تو یوں ہے کہ ایک لحاظ سے مجھے ان کی زندگی کا اس سے بھی زیادہ علم ہے جتنا کہ خود انہیں ہوگا۔

فیدر۔ کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ میں طبیب ہوں۔ میرے ہی توسط سے طبابت کے رموز اور اُن ناچنے والیوں کے رازوں کا باہمی تبادلہ ہوا کرتا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات کے لئے مجھے بلوا بھیجتی ہیں۔ موچ آجائے، جسم پر دانے نکل آئیں، کوئی وہم ہو، دل کی کسک ہو، انہیں مجھ سے مشورہ کرنا ضرور ہے۔ اس کے علاوہ وہ مختلف حوادث ہیں جنکا ان کے پیشے اور حرکت والی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ پھر ان حوادث سے بھی بڑھکر وہ پراسرار کلفتیں ہیں جیسے حسد، جس کا تعلق ممکن ہے کہ ان کی صناعی (art) سے ہو یا اُن کے جذبات سے یا خواب جو اُنھیں کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ غرضکہ ہر معاملہ میں وہ مجھ سے مشورہ ضرور کرلیتی ہیں۔ اور تجھے یہ سنکر تعجب ہوگا کہ جب کبھی اُن میں سے کوئی چپکے سے میرے کان میں اپنا خواب بیان کرتی ہے جس کے باعث اسے اک گونہ بے چینی ہے تو معاً میں اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہوں کہ اس کا فلاں دانت خراب ہے جسے نکلوانا چاہیئے۔

سقراط۔ بھئی، واہ! تو بھی عجب آدمی ہے کہ کسی کے خواب کا حال سنکر اس کے دانتوں کی کیفیت سمجھ جاتا ہے کیا تیرا یہ خیال نہیں کہ فلسفی لوگ تو اکثر اپنے سارے دانتوں کا ستیاناس مار دیتے ہیں۔

ارکسمک۔ دیوتاؤں سے میری یہ دعا ہے کہ وہ مجھے ہمیشہ سقراط کے دانت کے کاٹے سے محفوظ رکھیں۔

فیدر۔ ارے یار یہ کیا قصہ لے بیٹھے! ذرا ان بے شمار ہاتھوں اور ٹانگوں کی طرف تو دیکھو! . . . . . .
یہ چند عورتیں ہیں جو سیکڑوں صورتوں میں ہمارے سامنے ظاہر ہو رہی ہیں۔ کہیں وہ شمعیں اور ستون بن گئی ہیں اور کہیں وہ انگور کی ٹہنیوں اور کھمبوں سے مشابہ ہیں . . . . . . پھر آن کی آن میں یہ سب تصویریں فضا میں غائب ہو جاتی ہیں جیسے کسی نے انھیں گھلا کر ادھر اُدھر منتشر کر دیا ہو . . . . . یہ ساری سنگت ایسی معلوم پڑتی ہے جیسے خوشنما ٹہنیوں والے درختوں کا ایک جھنڈ ہے اور اُن ٹہنیوں کو نسیم نغمہ اپنے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہلا رہی ہو! اور ارکسمک! کیا ہم یہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں؟ یہ کس بلا کا خواب ہے، جس نے ہمارے دلوں میں اضطراب اور ہماری روحوں میں پُرخطر انقلابات پیدا کر دیئے ہیں۔

سقراط۔ پیارے فیدر! یہ خواب نہیں، خواب کا بالکل برعکس ہے۔

فیدر۔ کچھ بھی ہو، مگر میں تو یقیناً خواب دیکھ رہا ہوں، ایک ایسا خواب جس میں بے پایاں لطافتیں ہیں جو ان کنواریوں کے جسموں کے آپس میں ایک دوسرے سے ملنے اور اُن کی ہیئتیں بدلنے سے پیدا ہوتی ہیں میں خواب دیکھ رہا ہوں ایک ناقابل بیان کیفیت کا، جو تالوں اور اُن کے سفید سفید اعضا کی موزوں جنبشوں اور ان نغموں کی ہم آہنگی کے اُتار چڑھاؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات کے نہ صرف نقوش موجود ہیں بلکہ وہ خود کائنات کی حامل ہے! . . . . . . مجھے ان جادوگرنیوں کی طرف سے ایک خوشبو آرہی ہے اور یہ خوشبو ایسی ہے جیسے مشک میں کچھ اور خوشبوئیں کسی نے ملا دی ہوں۔ اس خوش ادائیوں کی بھول بھلیاں میں میرا اپنا وجود بالکل گم سا ہو گیا ہے دیکھو وہ سب کس رعنائی سے اپنے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ چھوڑ کر دوسرے رفیقوں سے جا ملتی ہیں۔

سقراط ۔ ارے بوالہوس! اس سنگت کو خواب کی طرح اتفاقی چیز نہ سمجھ۔ وہ بالکل اس کے برعکس ہے! ......

گر فیدر، تجھے شاید اس کا علم نہیں کہ خواب کی ضد بھی ایک دوسری طرح کا خواب ہے ...... انسانی عقل سوائے اس کے کیا ہے کہ وہ بیداری اور اعصابی تناؤ کا ایک خواب ہے! ۔ پھر عقل خود بھی خواب دیکھا کرتی ہے اس کے خواب کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں سختی اور چستی ہوتی ہے۔ اور خواب کی حالت میں بھی عقل کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور منہ بند رہتا ہے گویا کہ اسے اپنے ہونٹوں پر پورے طور پر قابو حاصل ہے۔ عقل کا خواب اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو اس وقت ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا اس وقت کا خواب ایک بالکل جداگانہ عالم ہے اس کی ساری قوتیں جسمی ہیں اور اس کے وہم بھی مدعا سے خالی نہیں۔ ہمارا خواب ایک ایسا خواب ہے جس کے تناسب و ترتیب اور اعمال و نتائج میں ایک ربط پنہانی موجود ہے۔! ...... ان جلیل القدر آئین حیات کا کسے علم ہے جو خود خواب دیکھا کرتے ہیں اور جنکا پرتو ان ناچنے والیوں کے روشن و تاباں چہروں سے اس وقت ظاہر ہو رہا ہے اور جن کی بدولت وہ ہم فانی انسانوں کو یہ بتانے پر آمادہ نظر آ رہی ہیں کہ کس طریقہ سے حقیقت غیر حقیقت اور قابل فہم کو موکلان صناعی (......) اپنی قدرت کاملہ سے گھلا ملا کر ایک بنا سکتے ہیں؟

ارکسمک ۔ بیشک سقراط تو نے یہ سچ کہا کہ ان چلتی پھرتی مورتوں میں جو خزانے پوشیدہ ہیں ان کا اندازہ تک ہماری عقل سے باہر ہے ...... تو بھی یقیناً اس کا قائل ہے کہ ان ناچنے والیوں کی بالکل وہی صلیت ہے جو قدیم دیوتاؤں کے تخیلات کی یہ جیتی جاگتی ابدی تمثیلیں ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہیں، الٹ پلٹ ہوتی رہتی ہیں، تاکہ اس طور پر ہماری آنکھوں کے سامنے ایک پُر معنی نظم پیش کریں۔ اُن کا یہ نظم ہمارے لیے ملکوتی حکمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

فیدر ۔ یہ جو انہوں نے اپنے جسموں کو ایک دوسرے سے ملاکر ایک سرخ رنگ کا گول منڈل بنا کھڑا کیا ہے کس قدر خوش وضع ہے! اس میں کس قدر خلوص ہے؟۔ وہ اس منڈل کو اس آہستگی سے گھما رہی ہیں جیسے رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی ہو! ...... لو، وہ سب کی سب منتشر ہو گئیں۔ اب پھر

وہ نوخیز لڑکیاں معلوم ہو رہی ہیں جنکی کرتیاں ہوا سے اُڑتی ہیں۔ غالباً ان دیویوں نے اپنا خیال کچھ بدل دیا!...

ارکسمک۔ اگر کسی کو ملکوتی خیال کی تلاش ہے تو وہ آئے اور ان ہنس مکھ چہروں کے جمگھٹ کی رنگا رنگی میں اسے تلاش کرے۔ ان کے کرتب کیسے پُرلطف ہیں جنھیں وہ بار بار کرتی ہیں۔ یہ آپس میں دو تین ملکر اپنے جسموں کو اسطرح پیچ دیکر ملالیتی ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ شاید اب وہ کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوسکیں گے۔ ان کے جسموں کے پیچ وتاب کس قدر ہوس انگیز ہیں؟ ان میں سے ایک ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے قید میں گرفتار ہو اور کبھی ان طلسمی بندشوں کی جکڑ بند سے رہا نہ ہوسکے گی۔

سقراط۔ دیکھو، وہ یکایک کیا کرنے لگیں؟ سب تتر بتر ہوگئیں۔ ایک ادہر بھاگتی ہے دوسری اُدھر۔

فیدر۔ وہ سب کی سب دروازوں کی جانب جھپٹی جا رہی ہیں۔ لو، وہ سب کسی کے استقبال کے لئے جھک رہی ہیں۔

ارکسمک۔ دیوتاؤں کی سوگند، یہ ہو نہ ہو اتھنکلے کی سواری ہے۔ وہ اتھنکلے جس کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے۔

سقراط۔ وہ مجھے تو کچھ یوں ہی سی معلوم ہوتی ہے۔

فیدر۔ ایسی ہے جیسے ننھی سی چڑیا ہو۔

سقراط۔ اس شئے کے مثل جو جسم سے بے نیاز ہو۔

ارکسمک۔ نہیں، اس شئے کے مثل جس کی کوئی قیمت نہ ہو۔

فیدر۔ اس کے پلٹ پھرت غیر مرئی صورتوں کے تابع معلوم ہوتی ہے۔

سقراط۔ یا یہ کہ وہ کسی اعلیٰ مشیت کے تابع فرمان ہے۔

ارکسمک۔ دیکھا! اس نے اپنا ناچ شروع کردیا، تم نے دیکھا! اس کی چال ملکویوں کی سی چال ہے۔ اُوپر بظاہر وہ سیدہے سادے طور پر ادہر اُدہر چکّر کاٹ رہی ہے مگر اسے اس کی صناعی کا شاہکار سمجھو۔ اپنی صناعی کی بلند ترین سطح پر وہ کس قدر بے تکلف نظر آرہی ہے۔ اس کی بشریت اس کی اصلی فطرت سے

بالکل مختلف ہے۔ اس نے دیدہ ودانستہ اس سے اپنی مشابہت اس واسطے باقی رکھی ہے کہ لوگوں کو دھوکا ہو

سقراط۔ اس سارے مجمع میں شاید میں ہی ایک ہوں جس کے ہوش وحواس باقی ہیں۔ دوسروں کی تو یہ کیفیت ہے جیسے کسی نے جادو کرکے گم صم کردیا ہو۔ جتنی گانے والیاں ہیں اس کی ہر حرکت کو کان لگاکر سن رہی ہیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی اُسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ ان سبھوں نے اپنے آپ کو اس تھتکے سے وربستہ کرلیا ہے۔ اور ان کی نظریں یہ بتارہی ہیں کہ انہیں اپنے ساتھ والی (رقاصہ) کے کمال پر کسقدر ناز ہے۔

نیسدر۔ ان میں سے ایک لال مونگے کو منہ سے لگائے مگر کوبل دے دیکر کس انداز سے ایک بڑی سیپ کو پھونک کر بجا رہی ہے۔

ارکسنک۔ ان میں سے ایک وہاں کھڑی ہوئی لمبی بانسری بجارہی ہے۔ اس کی رانیں کیسی گداز ہیں۔ وہ اس انداز سے کھڑی ہے کہ اس کی یہ دونوں رانیں ایک دوسرے میں پیوست معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے نازک پاؤں کو آگے کی جانب اس انداز سے اُٹھاتی ہے کہ اس کا انگوٹھا برابر تال کا ساتھ دیتا ہے۔ سقراط تو بتا تیری اس رقاصہ کی نسبت کیا رائے ہے؟

سقراط۔ اس رقاصہ کے ننھے سے وجود نے میرے خیالات میں ایک تلاطم برپا کردیا ہے .... اُسنے ساری کائنات کو اپنی خودی کے گرد مجتمع کرلیا ہے۔ اس کو وہ تمکین و وقار حاصل ہے جو اگرچہ ہم سبھوں میں بھی موجود تو تھا مگر حالت ہیولیٰ میں۔ یہ متاع اس تماشے کے غیر محتاط اور آوارہ نقالوں میں بدرجہ غایت ملتی ہے۔ .... اس کی سیدھی سادی چال ایسی ہے جیسے کوئی دیوی آرہی ہو۔ اس کی بدولت ہم سب لوگوں کی حالت بھی دیوتاؤں سے کچھ کم نہیں! .... وہ اپنی خوش خرامی سے ایک سادہ حلقہ ہماری نظروں کے سامنے بنادیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکان (space) کو اس کی وسعت کے بدلے میں وہ اپنی خوش اداییوں سے معاوضہ دے رہی ہے اور ساتھ ہی حرکت کے پُرنغمہ پتلوں کو اپنی ایڑی سے ٹھکا دیتی چلتی ہے وہ اپنا ہر قدم اس طرح اُٹھاتی ہے جیسے کوئی خالص سونے کے ٹکڑوں کو گن گن کر سینت سینت کر رکھتا ہو

بہ خلاف اس کے ہم ان خالص سونے کے ٹکڑوں کو ادنیٰ لوگوں کی طرح لاپروائی سے اڑا دیتے ہیں۔ جب ہم اپنے معمولی کاموں کے لئے چلتے پھرتے ہیں تو ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ ہمارا ہر قدم یک متاع ہے۔

ارکسمک۔ وہ ہمیں وہی باتیں سکھا رہی ہے جو ہم ہر وقت کیا کرتے ہیں۔ وہ ہماری روحوں کے سامنے ان اعمال کو روشن طور پر پیش کر رہی ہے جنھیں ہمارے جسم دُھندلے طور پر انجام دیتے ہیں۔ اس کی ٹانگوں سے ایک ایسی روشنی نکل رہی ہے جس کے باعث خود اپنے جسم کی حرکت ہمیں معجزہ معلوم ہوتی ہے غرضکہ ان معجزوں نے ہماری عقل کو عجب حیرانی میں ڈالدیا ہے!

فیدر۔ تیری ان باتوں سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ رقاصہ سقراط سے کم نہیں۔ وہ چال کے ذریعہ سے ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ کیونکر ہمیں اپنی حقیقت کے متعلق بہتر علم حاصل ہو سکتا ہے۔ تونے جو کچھ کہا لفظ بہ لفظ ٹھیک ہے ہم چلتے وقت اپنے قدموں کو اس قدر معمولی اور آسان سمجھتے ہیں کہ شاید اس سے پہلے کبھی ان کے وجود پر غور تک نہیں کیا۔ اس وقت تک ہم ان پر اپنی توجہ منعطف کرنے کی زحمت نہیں گوارا کرتے جب تک کہ ان سے غیر معمولی قسم کی حرکات سرزد نہ ہونے لگیں۔ ہمارے نزدیک صرف معذوروں اور ان لوگوں کے قدم قابل توجہ ہوتے ہیں جن کی ٹانگیں شل ہو گئیں ہیں۔ ان اپاہجوں کی بے چارگی دیکھ کر ہمدردی کے کلمات ہماری زبان سے نکل جاتے ہیں! . . . . یہ قدم اپنی بساط کے موافق ہمیں کشاں کشاں لئے لئے پھرتے ہیں اور ہماری بے پروائی ان کی طرف سے بدستور باقی رہتی ہے۔ ان کی رفتار کا انحصار اس قطعہ اراضی کی حالت پر ہوتا ہے جس پر ہم چل رہے ہیں یا خود ہماری حالت مزاج کی نوعیت اور راستہ کی روشنی پر ہوتا ہے جس پر ہم سرگرم رفتار ہیں۔ ان کی ہستی وہی رہتی ہے جو سے گر ہماری حالت پر افسوس ہے کہ بے سوچے سمجھے انہیں یوں اپنے ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔

تم نے انھلنتے کی سواری کو بھی دیکھا کیا خوب ہے؟ وہ زمین پر اس طرح سے آ رہی ہے جیسے اسے کہیں جنبش ہے ہی نہیں، کس قدر بے تکلف بے عیب اور نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ اپنی قوتوں کے

آئینہ پر کس تناسب کے ساتھ اول بدل کر اپنے قدموں کو رکھتی ہے۔ اس کی ایڑی اس کے جسم کو پیچھے کی جانب ہٹاتی ہے اور معاً دوسرا پاؤں آگے بڑھکر اس کا خیر مقدم کرتا ہے اور اُسے آگے کی طرف پھینک دیتا ہے۔ وہ برابر اس کی تکرار کر رہی ہے۔ اس کے سر کی قابل پرستش چوٹی زمان حاضر کی بے پایانی میں موج مضطرب کی پیشانی کے مانند اپنے نقوش بنا رہی ہے۔

اس نغمہ کو ایک لحاظ سے ہم مطلق کہہ سکتے ہیں۔ کسی نے بڑی کاوش سے غیر موسقیت اور عدم اعتماد کے سارے عناصر اس میں سے نکال لئے ہیں۔ اس کی رفتار کی مثال اس بت کی سی ہے جس کے وجود کا واحد مقصود خود اس کی ذات ہو اور مختلف صورتیں اختیار کرنے والی کثافتیں نام کو نہ باقی رہی ہوں۔

غرضکہ اس کا وجود نمونہ ہے ساری کائنات کے واسطے۔

ان پر شرافت قدموں کی وسعت سے کس قدر حسن اور کس قدر روحانی تیقّن پیدا ہو رہا ہے۔ ان قدموں کی لمبائی اور اُن کی تعداد میں ایک تناسب ہے جو نغمہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اس کے قد اور اس کے قدموں کی لمبائی اور تعداد میں بھی ایک ربط پنہانی موجود ہے۔

سقراط۔ فاضل ارکسمک! تو نے ان سب باتوں کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ میں مجبوراً اب اس سارے تماشے کو تیرے خیال کے مطابق دیکھونگا۔ اس وقت میرے تصور میں یہ عورت بسی ہوئی ہے جو اگرچہ محو خرام ہے مگر مجھے بالکل غیر متحرک نظر آتی ہے۔ میں نے اپنے تصور کا رشتہ اس کی تال کی موزونیت سے جوڑ لیا ہے۔

فیدر۔ وہ اپنی خوش ادائیاں دکھاتے ہوئے اکدم سے ٹھٹک سی گئی! . . . .

ارکسمک۔ ذرا ابھی دیکھتے جاؤ۔

فیدر۔ لو اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔

سقراط۔ اس کا پورا وجود اسوقت اس کی آنکھوں میں بند ہے۔ وہ اب اپنی توجہ کی گہرائیوں میں پہونچکر اپنی روح کے ساتھ تنہا ہے . . . . اسے اس بات کا احساس ہوگیا ہے کہ عنقریب اس کی ذات سے

ایک اہم باشان واقعہ وجود میں آنے والا ہے۔

ارکسمک۔ تم نے سنا! ...... خاموش، خاموش ہو۔

فیدر۔ یہ لمحہ بھی کسقدر باکیف ہے۔ یہ خاموشی اپنی آپ نفی کر رہی ہے۔ اسوقت چیخ نہ اُٹھنے کے لئے کسقدر ضبط درکار ہے! خاموش!

سقراط۔ یہ اپنے کیف اور بے لوثی کے اعتبار سے دوشیزہ لڑکی کے مثل ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس لمحہ نے ہماری روح، عالم انتظار اور اس مجمع میں ایک رخنہ سا ڈال دیا ہو۔ بس یوں سمجھو جیسے کوئی چیز چٹک گئی پھر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اس لمحہ کو ہم اس ٹانکے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس سے رخنے بند کئے جاتے ہیں۔

ارکسمک۔ ارے اتھکلے! تو اپنی بے پایانی میں کیا خوب نظر آتی ہے!

فیدر۔ موسیقی اسپر چپکے چپکے اپنا اثر کر رہی ہے۔ اور اسے ملکوتی بلندیوں میں پہونچا دیتی ہے۔

ارکسمک۔ موسیقی سے اس کی روح میں تغیر پیدا ہوگیا۔

سقراط۔ اے خدایان حسن! اس لمحہ، یہ لمحہ جسکی ہستی ہم نفس عدم ہے، ساری کائنات تمہارے اختیار و قدرت میں ہے۔ جو چاہو کرو۔

کس قدر باکیف ہے سانسوں اور دلوں کی حرکت کا رکنا! ...... اسوقت ساری دنیا کی تمام تعلقات اس کے پیروں کے تلے ہے۔ یہ جو آہستہ سے نقاب نیچے آ پڑتا ہے اس سے بھی اس کا کچھ منشا ہوگا! شاید وہ ہمیں اشارتاً یہ کہہ رہی ہے کہ اس کے جسم کو سوائے حرکت کے ہم اور کسی حالت میں تصور نہ کریں۔

ارکسمک۔ اس کی آنکھیں پھر روشنی سے دمکنے لگیں۔

فیدر۔ دوستو! اس نازک لمحے سے خوب لطف اُٹھا لو۔ یہ وہ لمحہ ہے جبکہ وہ اپنا ارادہ بدل ہی رہی ہو وہ اسوقت اس چڑیا کی طرح ہے جو اپنے اڑنے پر پہونچنے سے پہلے خوشنما مرمریں کنگرے سے ٹکرا کر اسی اڑان کی حالت میں گر پڑتی ہے! ......

ارکسمک ۔ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ وہ چیز محبوب ہے جو عنقریب وجود میں آنے والی ہو ۔ محبت میں مجھے عشق کے وہ ابتدائی جذبات سب سے زیادہ بھاتے ہیں جن سے بڑھکر انسانی دل کی کوئی آرزو نہیں ہوسکتی ۔ دان کے سارے وقتوں میں مجھے صبح تڑکے کی گھڑیاں سب سے زیادہ پسند ہیں ۔ اسی واسطے تو میں اس رقاصہ کے جسم کی ابتدائی حرکتوں کو مشتاقانہ نظروں سے دیکھنے کا منتظر ہوں ۔ وہ دیکھو! .... اسکی دز دیدہ نظر کس فاتحانہ انداز میں اس کے با کیف نتھنوں اور اس کے پر نور شانوں کو متحرک بنا رہی ہے ۔ اسکے جسم کا ریشہ ریشہ حسن میں ڈوبا ہوا ہے یہ جسم گردن سے لیکر ایڑی تک کس قدر روشن اور گٹھا ہوا ہے اور کس طرح اپنے اظہار کے لئے آہستہ آہستہ بل کھا رہا ہے! .... یکدم سے اس کے جسم میں تھرتھری سی کیسی پیدا ہوگئی! اصل میں وہ ایک زقند کی تیاری کا ڈول ڈال رہی ہے ۔ ساتھ ہی وہ ہمیں یہ کہہ رہی کہ ہم اسوقت تک اپنی سانسیں روکے کھڑے رہیں جب تک کہ وہ اس کام کو پورا نہ کرلے ۔ اس نے اپنے اس مطلب کو مجیرون کی گونج اور عمل میں بڑی تیزی سے ایک اشارہ میں ظاہر کر دیا ۔

سقراط ۔ اُف! اب وہ اس عالم میں پہونچ چکی ہے جس کا تخیل بھی ہم دنیا والوں کے لئے ناممکن ہے! اسوقت اس تمکنت و جلال کی دیوی کے کمال سے ہم سب کی روحیں مساوی طور پر فیض حاصل کر رہی ہیں اور کس طرح وہ سب دوش بدوش اس سرچشمۂ حسن سے اپنی پیاس بجھا رہی ہیں ۔

ارکسمک ۔ اب اس کا مقدس وجود سوائے رقص و حرکت کے کچھ نہیں ۔

فیدر ۔ وہ اپنی سبک رفتاری سے زمین کی ساری تھکن اور دنیا والوں کی بدسلیقگی کو دور کئے دیتی ہے ۔ اس کا نشیمن کسقدر بلند ہے جسے وہ اپنی سفید سفید بانہوں سے تعمیر کر رہی ہے! .... اسوقت تو بالکل وہ اپنے پاؤں سے احساسات کا ایک ناقابل بیان قالین بن رہی ہے ۔ اس پاؤں کو کبھی ادھر لاتی ہے کبھی اُدھر لے جاتی ہے اور اس کی اس بناوٹ میں زمین و زمان تانے بانے کا کام کر رہے ہیں! .... کسقدر انمول اور دلفریب ہے اس کے پاؤں کی چنر انگلیوں کا یہ کام ۔ ان انگلیوں کو کبھی وہ آگے بڑھاتی ہے

کبھی پیچھے ہٹاتی ہے، کبھی ان سے گرہ لگاتی ہے اور کبھی اس گرہ کو کھولتی ہے، کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی کا پیچھا کر رہی ہیں اور کبھی یوں کہ جیسے بھاگ رہی ہوں۔ یہ انگلیاں نہیں ہمارے بے چین کارندے ہیں جو اس زمانہ کی مسرتوں کو ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں جو ہمارے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لئے نکل چکا۔

! . . . . . . اس کے دونوں پاؤں آپس میں ایکدوسرے سے گفتگو کر رہے ہیں اور کبھی کبھی آپس میں دو قمریوں کیطرح لڑنے لگتے ہیں! . . . جسطرح سے یہ قمریاں ایک دانہ کیواسطے لڑتی ہیں اسیطرح یہ دونوں پاؤں ایک نقطۂ زمین کیواسطے آپس میں جھگڑا کرتے نظر آتے ہیں پھر دونوں قمریاں ساتھ ساتھ ہوا میں اڑتی ہیں اور لڑتی جاتی ہیں خدایان حسن کی قسم! آج تک کبھی ان پاؤوں کیطرح میرے ہونٹوں کے اشتیاق قدم بوسی کو کسی نے برانگیختہ نہیں کیا! . . . . . .

سقراط۔ شاید ان پاؤوں کی عجیب وغریب تیز گفتاری کے باعث تیرے ہونٹوں کو یہ خواہش پیدا ہوئی! . . تو چاہتا ہے کہ اپنے نطق کو ان پاؤوں کے پرواز سے ہم کنار کرے تاکہ تیرے استعاروں میں بھی ویسی ہی چستی پیدا ہوجائے جیسی کہ ان کی زغندوں میں! . . . .

فیدرس!

ارکسمک۔ وہ بھی اسوقت اس کبک خوش خرام کے ہر قدم کو چومنے میں محو معلوم ہوتا ہے! . . . . . اس لئے کہ وہ اس ناچ کے تماشے کو اپنی توجہ کی پوری سرگرمی سے دیکھ رہا تھا۔ سقراط تیری جو حالت ہے وہ سمجھ میں آتی ہے اگرچہ وہ پراسرار ضرور ہے . . . . . ہمارے دوست فیدرس کی آنکھیں تو اس ناچ کی روشنی میں بالکل چکاچوند ہوگئی ہیں۔ اتھنکتے کے چکر والے ناچ نے جو اپنے پیر کی انگلیوں کے سروں پر ناچتی ہے اسے حیرانی میں ڈال دیا۔ اس نام کو بھی اس کے پیر کی انگلیوں پر بجا طور پر ناز ہے۔ فیدرس کی حالت یہ ہے کہ وہ ان انگلیوں کو اپنی نظروں سے نگل جانا چاہتا ہے اور اپنا چہرہ ان کے سامنے بچھا بچھا دیتا ہے۔ اسے پورا یقین ہے کہ اس کے ہونٹ اتھنکتے کے پیر کے ناخنوں کو چھو رہے ہیں! . . . . پیارے فیدرس! بھلا اپنی صفائی پیش کرنے سے کیا حاصل اور بیکار پریشانی میں پڑنے کا کیا نتیجہ؟ تیرا احساس جائز اور پوشیدہ ہے

اور انسانوں کے رواج کے عین مطابق ہے :....... ہم سبھوں کا وجود ایک منظم وہم سے زیادہ کچھ نہیں :....... ہمارا نظم حیات، جسے جسم سے تعبیر کرتے ہیں، انتشار اور بے ترتیبوں کا مجموعہ ہے جس میں عمل و حرکت کی کارفرمائی ہے :......... ہماری زندگی میں واقعات، خواہشیں اور خیالات بعض ضرورتوں سے مجبور ہو کر عجیب و غریب شکلیں اختیار کر لیتے ہیں جنہیں ہم سمجھنے سے بھی قاصر ہیں غرضکہ ہماری ساری زندگی علت و معلول کی ایک پر اسرار بے آہنگی ہے :.........

فیدر۔ تو نے بڑے سلیقہ سے اس پوری کیفیت کو ظاہر کر دیا جسے میں نے نہایت معصومانہ طور پر محسوس کیا تھا۔

سقراط۔ پیارے فیدر، تیرا احساس بے وجہ نہ تھا۔ خود میرا یہ حال ہے کہ جتنا زیادہ میں اس ناقابل بیان رقاصہ کی طرف دیکھتا ہوں اس قدر میرے دل میں گوناگوں خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے خود یہ بات حیرانی میں ڈالے ہوئے ہے کہ کیونکر فطرت نے اس نحیف اور نازک لڑکی کے کالبد خاکی میں قوت و چستی کا دیو پوشیدہ کر دیا ہے؟ کیا کسی نے کوئی ایسی کہانی سنی ہے جس میں ہرکلیز جیسے سورما نے ابابیل کا جنم لیا ہے؟ اور اس ننھے سے سر میں جو اننتاس سے بڑا نہیں، کیونکر وہ سارے سوال و جواب پیدا ہو جاتے ہیں جن کے مطابق اس کے اعضا حرکت کرتے ہیں؟ اور وہ کیونکر اپنی ایڑی سے بار بار ٹھیکا دیکر ایسی کھنکنے والی آواز پیدا کرتی ہے جسے نغمہ سے مستعار لیکر وہ فوراً روشنی کے نذر کر دیتی ہے۔

(باقی)

حُسن

جناب مولوی عزیز احمد صاحب عزیزؔ متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

ازل کا نُور، نظر کا غبار ہو کے اُٹھا　　　نقابِ حُسن میں پھر آشکار ہو کے اُٹھا
دلوں کو منزلِ ہستی کی راہ بتلانے　　　عدم کے راز کا اِک پردہ دار ہو کے اُٹھا

کبھی یہ برق دلِ بے قرار ہو کے رہا　　　کسی کی آہ و فغاں کا شکار ہو کے رہا
کبھی زمین سے پرواز کی فلک کیطرف　　　کبھی جہان میں رُسوا و خوار ہو کے رہا

کسی کی قبر پہ شمعِ مزار ہو کے جلا　　　کہیں چراغِ سرِ رہگذار ہو کے جلا
تپش سے پہلے ہزاروں کو خاک کر ڈالا　　　پھر اپنے سوز سے خود دلفگار ہو کے جلا

دلوں سے طاقتِ صبر و قرار ہو کے ہٹا　　　شہیدِ سوزِ دلِ بیقرار ہو کے ہٹا
جگا چکا جو محبت کو خوابِ غفلت سے　　　تو پھر جہاں سے نشانِ مزار ہو کے ہٹا

ادبی شاہکار اور متحرک تصاویر

جناب مولوی عزیز احمد صاحب عزیز متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۱)

متحرک تصاویر کی روز افزوں مقبولیت کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہو رہا ہے کہ معاشری اور انسانی زندگی کے ہر شعبے پر اس کا بہت کافی اثر پڑ رہا ہے متحرک تصاویر اب صرف ایک ذریعۂ تفریح نہیں رہیں بلکہ انہوں نے فنون لطیفہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے، جس کا مدعا تفریح کرنے سے زیادہ محسوس کرنا ہے۔

تھیٹر نے معمولی تفریح گاہوں سے ترقی کر کے حسن کارانہ تماش کاری کے شاہکار پیش کرنا شروع کئے جب یونانیوں کے یہاں مذہبی قصے تمثیل کئے جاتے تھے تو خواب وخیال میں بھی نہ آسکتا تھا کہ اس میدان میں سارا برنرڈ (Sarh Bernhardt) ڈیوڈ گیرک (David Garrick) سر ہنری ارونگ، (Sir Henry Irving) اور ایلین ٹیری (Elleu Tery) جیسے باکمال پیدا ہونگے، اور خود شہنشاہ فرانس، مولیئر (Molier) کی ایک کامیڈی میں پارٹ کریگا۔ لیکن انسان کا دماغ ہر بیکار سی بیکار چیز میں بھی حسن کارانہ کمال پیدا کر سکتا ہے۔

چند سال ... عرصے میں متحرک تصاویر نے سیریلوں سے ترقی کر کے بلند پایہ شاہکار، جن میں تماش کاری سنہ گئی تھی ... کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیئے ... متحرک تصاویر کی ابتدا ہوئی تو ڈرامیائی نقادوں

(Dramatic Critics) کو خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں سنیما، بہت جلد تھیٹر کو خاک میں نہ ملادے۔ متحرک تصاویر اُن کے نزدیک نہایت ادنیٰ درجے کے پنٹو مائم (Pantomime) میں شمار کئے جانیکے قابل تھیں۔ اور اُن کا دعویٰ تھا کہ متحرک تصاویر سے ادبیات کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

مگر اُن کو بہت جلد اپنی رائے میں ترمیم کرنا پڑی۔ ہالی وڈ (Hollywood) نے زر کے زور سے باکمال تماش کاروں کو اسٹیج سے کھینچ بلایا۔ پکاڈلی (Picc Adilly) اور براڈوے (Broadway) ویران نظر آنے لگے۔ اور پردہ سینما پر حُسن کارانہ تماش کاری کے بہترین نمونے نظر آنے لگے۔ بہت سے ادبی شاہکاروں کو بھی متحرک تصاویر کی شکل میں پیش کیا گیا۔

۱۹۲۷ء سے بلند پایہ بولتی ہوئی متحرک تصویریں، بنائی جانے لگیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوتی حُسن کاری اور موسیقی میں بھی سنیما نے تھیٹر کو مات کر دیا اور اس کے بعد سے بلند نظر نقادوں نے بھی اس کی طرف باقاعدہ توجہ کرنی شروع کی۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور علمی وادبی مجلے "لندن مرکری" (London Mercury) میں (جس کے اڈیٹر مسٹر جے۔ سی۔ اسکوائر (J. C. Squire) انگلستان کے موجودہ نقادوں میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں) ایک مستقل باب "متحرک اور گویا تصاویر" کا بھی ہے جس میں مہینے کی فنی یا ادبی اہمیت رکھنے والی تصاویر پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

کئی لحاظ سے متحرک تصاویر کو تھیٹر پر فوقیت حاصل ہے۔ متحرک تصاویر میں نقل و حرکت کا بہت زیادہ موقع رہتا ہے۔ جذبات کے اظہار میں چہرے کے آثار چڑھاؤ اور حرکات و سکنات کو انفرادی طور پر بہت زیادہ واضح کرکے دکھا سکتے ہیں۔ اور قدرتی اور مدنی مناظر، فطری طور پر دکھائے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ تھیٹر میں یہ کام رنگین پردوں سے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ تھیٹر کو صرف ایک محدود طبقہ دیکھ سکتا ہے۔ لیکن متحرک تصاویر دنیا بھر میں ہر جگہ دکھائی جا سکتی ہیں اور سب یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔ سوسائٹی کی نظروں میں جو وقعت متحرک تصاویر کی ہو سکتی ہے، تھیٹر کی نہیں ہو سکتی۔

(۲)

آسکر وائلڈ نے فنون لطیفہ میں، تماش کاری اور موسیقی کو سب سے زیادہ مشکل قرار دیا ہے۔ یہ دونوں متحرک تصویریں نمایاں ہیں۔ کرداری تماش کاری Character Acting میں ایمل جے ننگس (Emil Janings) اور لان چینی (Lon Chaney) کو یقینی طور پر سر ہنری ارونگ اور میک ریڈ (Mac ready) پر جو انگریزی اسٹیج کی بہترین پیداوار سمجھے جاتے ہیں، فوقیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جس زمانے میں صرف خاموش متحرک تصاویر کا رواج تھا اور گویا تصاویر وجود میں نہ آئی تھیں، جذبات اور احساسات کا اظہار صرف چہرے کے اتار چڑھاؤ، حرکات اور سکنات سے کیا جاتا تھا، گویا تصاویر کی ایجاد کے بعد اس خصوصیت میں صوتی خوبیاں بھی پیدا کی گئیں۔ یعنی چہرے کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ آواز کا اُتار چڑھاؤ بھی شامل ہوگیا۔ چارلی چپلن کا خیال ہے کہ گویا تصاویر نے اس خصوصیت کو بہت نقصان پہنچایا ہے، اُس کے نزدیک صرف خاموش تصاویر ہی میں حرکات وسکنات سے جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں اکثر نقاد، چارلی چپلن کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ بہت سی گویا متحرک تصاویر ایسی تیار ہو چکی ہیں۔ جن میں حرکات وسکنات اور آواز یکساں طور پر جذبات کے اظہار کا کام دے رہے ہیں۔ مثلاً نارما شیرر (Norma Sharear) کا شاہکار ڈائی ورسی (Divorcee) ایمل جاننگس کی چلتی گویا متحرک تصویر "نیلا فرشتہ" (Blue Angel) اور لان چینی کی پہلی اور آخری گویا متحرک تصویر "غیر مقدس تین" (Uhholy Three) اس کے باوجود ہالی وڈ کی مشہور فلم ساز کمپنی یونائیٹڈ آرٹسٹس کارپوریشن (United Artists) کے ڈائرکٹر سیموئیل گولڈون (Samuel Goldwyn) کا یہ ارادہ ہے کہ وہ خاموش متحرک تصاویر اور گویا متحرک تصاویر برابر ساتھ ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں۔

لیکن موسیقی صرف گویا متحرک تصاویر ہی کے ذریعے پیش کی جا سکتی ہے موسیقی کو فنون لطیفہ میں جو حیثیت حاصل ہے۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے، گویا متحرک تصاویر کے موسیقیانہ عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ تنخواہ پانے والا تماش کار جان مک کارمک (John McCormic) بھی ایک مغنی ہی ہے

اور فرانس کا ہر دلعزیز ایکٹر مارس شویلیر (Maurice Chevelaire) مُغنّی ہی ہے موسیقی ہی نہیں بلکہ مکالموں کے لیئے بھی گویا متحرک تصاویر ہی ضروری ہیں۔

ہمیں یہاں نہ کرداری تماش کاری پر زیادہ بحث کرنا ہے نہ موسیقی پر۔ دیکھنا یہ ہے کہ ادبی شاہکاروں کو پردۂ سینما پر کیوں پیش کیا جانا چاہیئے۔ اور ان کو متحرک تصاویر میں تمثیل کرتے وقت کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اور اب تک جتنے بلند پایہ ادبی شاہکار، پردہ سینما پر پیش کیئے گئے ان میں کس حد تک اس کا خیال رکھا گیا کہ ادبی روح فنا ہونے پائے بلکہ صرف دوسرا قالب اختیار کرلے۔

(۳)

ڈراموں اور افسانوں کا ایک خاص مُدعا یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کی تمدنی ترقی، کا خاکہ کھینچا جائے یا اُس کے افعال و جذبات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے۔ حیات کی سچی تصویریں کھینچی جائیں۔ چنانچہ جب ہم کوئی ناول یا افسانہ یا ڈرامہ پڑھتے ہیں تو اس ماحول، اور اُن واقعات کی ایک خیالی تصویر ہماری نظروں کے سامنے کھنچ جاتی ہے، پردۂ سنما پر اُس ماحول، اور ان واقعات کو تمثیل ہوتے ہوئے دیکھکر ہم کو اپنی خیالی تصویریں مجسم نظر آتی ہیں۔ اگر ہماری خیالی تصویروں میں کوئی خامی تھی تو وہ اب رفع ہوجاتی ہے۔ آپ نے روما کی عیش و عشرت سے لبریز زندگی کو تاریخوں میں، افسانوں میں ادبی کتابوں میں پڑھا ہوگا تو ایک دھندلا سا نقش آپ کی آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا ہوگا۔ لیکن جب آپ روما کی زندگی کو بن ہرا (Ben Hur) اور کوآدے ڈس ؟ (Quo Vadis ?) جیسی متحرک تصاویر میں دیکھتے ہیں، تب آپ حقیقی معنوں میں اُن کی زندگی کو اپنی اصلی صورت میں موجود پاتے ہیں، اور اُس کی عظمت آپ کو مجسم اور متشکل نظر آتی ہے۔ ادب میں زندگی کی تصویروں کا آپ اُسوقت تک صحیح طور پر مطالعہ نہیں کرسکتے جب تک آپ ان کو مجسم نہ دیکھ لیں۔ متحرک تصویروں میں ہم یونان، روما، اور مصر کی زندگی کو تقریباً اسی خوبی سے مجسم دیکھ سکتے ہیں جس خوبی سے اُس زمانے میں دیکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے کی خواہشات کا خیال رکھتے ہوئے کوئی شاہکاروں کو پردۂ سینما پر پیش کرنیکی بہت سخت ضرورت ہے۔

متحرک تصاویر میں ادبی شاہکار تمثیل کرتے وقت چند نہایت اہم ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ یعنی متحرک تصویر جس زمانے کا قصہ پیش کر رہی ہے۔ اس زمانے کی اجتماعی زندگی تمدنی حالت اور تہذیب کا خاص خیال رکھنا چاہئے تاکہ متحرک تصویر انسانی زندگی کی سچی تصویر بھی ثابت ہو۔ چنانچہ امریکہ کی فلم سازکمپنیوں میں اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے اور بعض تاریخی ناولوں کو تمثیل کرنے میں لاکھوں روپیے صرف کئے جاتے ہیں۔ میٹروگولڈون میئر کمپنی Metro-Goldwyn-Mayor نے جب وکٹر ہوگو کے مشہور تاریخی ناول ناتردم دپیرس Noterdame de Paris کو تمثیل کرنے کے لئے مصنوعی کلیسائے ناتردم بنایا تو اصلی کلیسا کے بعض راہبوں کو بلاکر دکھایا اور وہ لوگ سوا اس کے کوئی فرق نہ بتا سکے کہ وہ اصلی قلعہ تھا۔ اور یہ مصنوعی قلعہ عارضی طور پر لکڑی وغیرہ سے بنایا گیا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ ساز و سامان اور لباس وغیرہ اس سوسائٹی کا مظہر ہو، جس کی متحرک تصویر نقاشی کر رہی ہے، بلکہ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ افعال اور حرکات سے بھی اس سوسائٹی کی، یا اس تمدن کی خصوصیات ظاہر کیجائیں۔

جو کام مصنف یا افسانہ نگار نفسیاتی تجزیے سے لیتا ہے تماشہ کار کو اپنے چہرے، بشرے، حرکات اور سکنات سے لینا چاہیے تماشہ کار کا چہرہ، ان جذبات کی تصویر ہو، جنکو وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ یہ بہت ہی مشکل چیز ہے، اور آسکر وائلڈ، اس کو اس وجہ سے مشکل ترین حسن کاری قرار دیتا ہے کہ اس میں ذاتی جذبات اکثر بالکل مفقود ہوتے ہیں۔ شاعری، سنگتراشی، اور مصوری میں حسن کار کی روح، اور جذبات اس کی رہنمائی کرتے ہیں، لیکن یہاں صرف خداداد اہلیت مددگار ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔

تماشہ کار اگر پورے حسن کارانہ کمال سے کام کرے تو وہ اس کمی کو پوری کر دیتا ہے، جو مصنف کے محیر العقول نفسیاتی تجزیے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے۔ برنرڈ شا Bernaro Shaw نے بجا طور پر اعتراف کیا ہے "نہیں، کو لکھنے کا تو صرف ایک ہی طریقہ ہے مگر تمثیل کرنے وقت ادا کرنے کے ہزار طریقے ہیں"۔

ادبی شاہکار، خاموش متحرک تصاویر سے زیادہ حقیقی طور پر گویا متحرک تصاویر میں دکھائے جاسکتے ہیں کیونکہ

گویا تصاویر میں لہجے اور آواز سے اس کیفیت کا اظہار ہو سکتا ہے، جس سے متاثر ہو کر متکلم بات کرتا ہے۔ اور ہر ملک کے ہر حصے کی بولی بھی حقیقی طور پر سنائی جا سکتی ہے۔

ڈراموں کے لئے آواز کی بہت ضرورت ہے تاکہ مکالمہ پورا، حسن کارانہ کمال سے سنایا جا سکے۔ لیکن یہ عجیب و غریب بات ہے کہ اکثر نامی گرامی ڈرامہ نویسوں کے ڈرامے جب گویا متحرک تصاویر کی شکل میں پیش کئے گئے تو عام طور پر پسند نہیں کئے گئے۔ برنرڈشا کے ایک ڈرامہ کو گویا متحرک تصویر میں تمثیل کیا گیا لیکن سخت ناکامی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ڈراما نویسوں کے یہاں حرکت (Motion) بہت کم ہوتی ہے اور مکالمہ (Dialogus) نہایت فلسفیانہ اور بہت زیادہ۔ تھیٹر میں تو یہ ڈرامے اچھے خاصے کامیاب رہتے ہیں کیونکہ وہاں حرکت کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ مگر متحرک تصاویر میں حرکت کا موقع بہت زیادہ ہے۔ اسلئے بغیر حرکت کے تصویر بہت غیر دلچسپ ہو جاتی ہے اور مکالمہ سنتے سنتے عوام الناس اُکتا جاتے ہیں۔ لیکن بعض ڈرامے بڑی خوبی سے خاموش متحرک تصاویر میں تمثیل کئے جا چکے ہیں۔

ناولوں میں بھی آواز ایک حد تک ضروری ہے۔ بعض ناولوں میں تو بہت ضروری ہے اور بعض میں چنداں قابل لحاظ نہیں۔ مثلاً ہنرک سنکی وز (Haryk Sienkewicz) کے ناول "کوآ وسے ڈس" کی خاموش متحرک تصویر کو اگر گویا متحرک تصویر کی شکل میں منقلب کر دیا جائے تو شاید زندگی کی صحیح نقاشی میں زیادہ اضافہ نہ ہو۔

ذیل میں ہم چند متحرک تصویروں پر ایک اجمالی نظر ڈالیں گے جو ادبی شاہکاروں سے ماخوذ ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کس حد تک متحرک تصاویر ادبیات سے شوق رکھنے والوں کے لئے مفید ہیں۔ اور کس حد تک متحرک تصاویر میں منفعت کی حقیقی روح عمل باقی رہتی ہے۔

(۴)

طوفان ( ) شیکسپیر کے اس مشہور ڈرامے کو متحرک تصویر میں تمثیل کرنے میں بہت زیادہ آسانیاں نہیں۔ یعنی قدرتی مناظر اس میں فطری طور پر دکھائے جا سکے۔ تماش کاروں میں جہاں بےری مور

(John Barrymore) خاص طور پر قابل ذکر ہے جو عاشقانہ اور کرداری تماش کاری میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

جان بیری مور کو وارنر برادرس (Warne Bros) نے ہیلمٹ کا پارٹ کرنے کے لئے بھی منتخب کیا ہے۔ شکسپیر کا یہ حزنیہ شاہکار عنقریب بڑے اہتمام سے ایک گویا متحرک تصویر میں تمثیل کیا جانے والا ہے۔

شکسپیر کے ایک اور ڈرامے (Taming of Shrew) کو بھی گذشتہ سال ایک گویا متحرک تصویر میں تمثیل کیا گیا۔ تماش کاروں میں ڈگلس فیربنکس اور میری پکفورڈ بھی شامل ہیں۔ یہ متحرک تصویر بہت زیادہ پسند نہیں کی گئی۔ مکالمہ شکسپیر کے مکالمے سے ماخوذ ہے۔

شکسپیر کے بہت کم ڈرامے پردۂ سینما پر پیش کئے گئے ہیں۔ اب ممکن ہے کچھ اور ڈرامے پیش کئے جائیں۔ اور سر ہنری اروِنگ، ڈیوڈ گیرک، میک ریڈی اور ایڈمنڈ کین (Edmund Kean) کی صف میں ہالی وڈ کے مشہور تماش کار بھی شامل ہو جائیں۔

اس کے بعد خاص طور پر قابل ذکر ڈراما گوئٹے کا شاہکار فاسٹ ( ) ہے اس کی خاموش متحرک تصویر مشہور جرمن فلم ساز یوفا کمپنی (Ufa) نے تیار کرائی ہے۔ جس میں اِمل جاننگس نے میفسٹوفلس (Maphestofeles) اور کیملا ہارن (Camilla Horn) نے مارگرٹ (Margaret) کا پارٹ کیا ہے یہ متحرک تصویر اِمل جاننگس کا شاہکار تصور کی جاتی ہے۔ لندن کے اسٹیج پر بھی فاسٹ کو تمثیل کیا گیا تھا، یہ تمثیل، اسٹیج کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی تھی میفسٹوفلس کا پارٹ ہنری اروِنگ اور مارگرٹ کا ایلن ٹیری نے کیا تھا میفسٹوفلس دنیا کے چند مشہور کرداروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ گوئٹے کے قلم نے کرداری نگاری کا حق ادا کر دیا ہے، اور اِمل جاننگس نے بھی انتہائے کمال سے اس خاموش متحرک تصویر میں اس کو ایکٹ کیا ہے۔ غالباً اس کے سوا اور کوئی متحرک تصاویر میں کام کرنے والا ایکٹر اس خوبی سے ایکٹ نہ کر سکتا۔

آسکر وائلڈ کے مشہور ڈرامے "لیڈی ونڈرمیرس فین (Lady Windemere's Fan) کو بھی تمثیل کیا گیا۔ رونالڈ کالمن

(Ronald Colman) آئرین رچ (Irene Rich) اور مے میک اوائے (May McAvoy)
تماش کاروں میں شامل ہے۔ یہ متحرک تصویر خاموش ہے اگر گویا ہوتی تو آسکر وائلڈ کے پُر لطف مکالے کو پیش کرسکتی۔
پھر بھی جہانتک تماش کاری کا تعلق ہے تصویر اچھی خاصی ہے۔

طالسطائی کے ڈرامے زندہ نعش (Living Corpse) کو (Redeption) کے نام سے ایک گویا
متحرک تصویر میں تمثیل کیا گیا ہے۔ تماش کاروں میں جان گلبرٹ John Gilbert ایلینر بورڈمین (Eleanor
Boardman) رینا اڈوری (Renee Adoree) اور کونرڈ نیگل (Conrad Nagel) شامل ہیں۔ فلم ہر لحاظ سے
کافی اچھی ہے۔

ہندوستان میں متحرک تصاویر اس قدر پسماندہ حالت میں ہیں کہ کہا نہیں جا سکتا۔ تماش کاروں میں حسن کارانہ
خوبیاں بہت کم ہیں۔ اس کے علاوہ نہ اہل ہے، اور نہ مذاق سلیم۔ پھر بھی چند ہندوستانی متحرک تصاویر خاص اہمیت
رکھتی ہیں۔ ان میں سے قربانی ( ) خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ٹیگور کے ڈرامے سے ماخوذ ہے۔
اس میں سب کے سب مشہور ہندوستانی تماش کار موجود ہیں۔ ہندوستان کو دیکھتے ہوئے یہ متحرک تصویر غنیمت ہے۔
گر مغربی متحرک تصویروں کو دیکھتے ہوئے بالکل فضول۔

سر تھامس مور کی ( ) "لالہ رخ" کو بھی تمثیل کیا جارہا ہے۔ یہ پہلی قابل قدر ہندوستانی
گویا متحرک تصویر ہوگی اس میں تمامتر ہندوستانی تماش کار اور مغنی موجود ہیں۔

(۵)

ڈراموں کے دیکھتے ہوئے بہت زیادہ ناول اور افسانے پردۂ سینما پر دکھائے جا چکے ہیں۔ وجہ یہ کہ ناولوں
کی طرح متحرک تصاویر میں بھی زمان و مکان کی قید نہیں رہتی اور تمثیل میں نسبتاً آسانی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر متمدن زبان
کے اکثر ناول اور افسانے متحرک تصاویر میں تمثیل کیے جا چکے ہیں۔

چارلس ڈکنز ( ) مشہور انگریز افسانہ نگار کا ایک ناول آلیور ٹوسٹ (

تمثیل کیا جا چکا ہے۔ اس میں امریکہ کے مشہور کرداری تماش کار لان چینی کی ایکٹنگ، ڈکنز کی کردار نگاری کا باکمال مرقع ہے۔

ڈکنز کے ہمعصر تھیکرے (   ) کا ناول (Vanity Fair) بھی تمثیل کیا جا چکا ہے۔ پولا نیگری (Pola Nagri) کی تماش کاری حقیقت سے اسقدر قریب ہے کہ تعریف نہیں کیجا سکتی۔ ان دونوں باکمالوں کے یہ شاہکار پڑھنے کے بعد اگر کوئی ان کو پردۂ سینما پر بھی دیکھ لے تو غالباً دو مصنفین کے مدعا کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکے گا۔ کیونکہ جو چیز ڈکنز اور تھیکرے الفاظ کے پیکر میں ظاہر کرنے سے قاصر تھے۔ لان چینی اور پولا نیگری نے سینما کے پردے پر ظاہر کردی۔

اسکارلٹ لیٹر (Scarlet Letter) امریکن افسانہ نگار نتھیل ہاتھارن (Natheniel Hawthorn) کا شاہکار کو تمثیل کیا گیا۔ لیلین گش (Lilian Gish) نے ہسٹر پرن (Hyster Pyrne) کا پارٹ کیا ہے اور لارس ہین سن (Lars Hanson) نے اسقف کا تماش کاری کی تعریف نہیں کیجا سکتی۔ اس افسانے کی ادبی اہمیت تو ظاہر ہوئی ہے مگر متحرک تصویر میں زندگی، زندگی معلوم ہوتی ہے۔

رومولا (Romola) جارج ایلیٹ (George Eliot) کے ناول کو تمثیل کیا گیا ہے لیلین گش نے رومولا اور رونالڈ کالمن نے مصور کا پارٹ کیا ہے۔ متحرک تصویر ہر لحاظ سے ایک شاہکار ہے۔

ٹس آف دی ڈربرولز (Tess of the D'Urbervells) ہارڈی کے اس ناول کی برابری شاید ہی انگریزی دنیا کے افسانہ میں کوئی اور ناول کر سکے۔ اس ناول میں مصنف کے قلم نے وہ کمال دکھایا ہے کہ متحرک تصویر میں اس کی عکاسی کرنا بہت مشکل ہے۔ متحرک تصویر تیار تو کی گئی مگر ہارڈی کی روح کی عظمت کو بھلا کہاں پہنچ سکتی۔ متحرک تصویر میں زندگی اس قدر حقیقی نہیں معلوم ہوتی، جس کے کتاب میں۔ متحرک تصاویر کے ایک نقاد نے بالکل ٹھیک کہا ہے "ٹس آف دی ڈربرولز کو تمثیل کیا ہی نہیں جا سکتا"۔

مے نن لکار (Manon Lescaut) کا وہ ناول ہے جس نے وہاں کی سوسائٹی میں ایک انقلاب پیدا

کر دیا تھا۔ اور اُس کے مصنف ایب پری وو (Abbe Prevost) کو بدمعاش اسقف (Wicked Priest) کا خطاب ملا تھا۔ اس کو یوفا کمپنی نے تمثیل کیا۔ لیا ڈی پٹی (Lya de Puti) نے منن لسکا کا پارٹ کیا ہے۔ متحرک تصویر اس کمال کی مظہر نہیں، جس کی توقع کیجا سکتی تھی۔

وکٹر ہیوگو کے دو شاہکار 'بدنصیب (Les Mise rables) اور نا تردم دیپیری (Noterdamo de Paris) بھی تمثیل کئے گئے۔ ان میں سے آخر الذکر کی تمثیل بڑے اہتمام سے ہوئی۔ قدیم پیرس کی مصنوعی تعمیر میں کئی لاکھ روپے صرف ہوئے۔ کوزہ پشت کو ئیک سے میڈو (Quasimedo) کا پارٹ لان چینی نے کیا ہے۔ ہر لحاظ سے یہ تصویر ایک بلند پایہ شاہکار ہے۔

الگزینڈر ڈوما کے تین ناولوں کو تمثیل کیا گیا۔ ان میں سے (Monte Cristo) میں جان گلبرٹ اور نھری میکشیرز اور آئرن ماسک (IRON MOSK) میں ڈگلس فیربنکس نے پارٹ کیا ہے۔ تماش کاری سے زیادہ قابل تعریف متحرک تصاویر کی اس زمانے کی زندگی کی عکاسی ہے۔ پھر بھی ڈگلس فیربنکس نے ڈی آرٹگ نان (D'Artagnon) کا پارٹ بہت اچھا کیا ہے۔

پولینڈ کے افسانہ نگار ہنرک سیکی وزکا ناول کو آدے ڈس (Quo Yadis) تمثیل کیا گیا۔ متحرک تصویر ہر لحاظ سے خود ناول سے افضل ہے۔ ظالم وجابر قیصر نیرو کا پارٹ ایمل جانگس نے کیا ہے۔ اس فلم میں اہل روما کی زندگی کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔

روسی افسانہ نگار پشکن (Pushkin) کے ایک افسانے دوبروفسکی (Dovbroyesky) کو ایگل (Eagle) کے نام سے تمثیل کیا گیا۔ روڈالف والینٹو (Rodalph Valentiin) ، ولما بنکی (Vilma Banky) تماشگاروں میں شامل ہیں۔ روڈالف والینٹو کی شخصیت، اور اصل پلاٹ کو توڑ مروڑ دینے کی وجہ سے اس تصویر میں ادبی حیثیت تو بالکل باقی نہیں رہی۔ اِں فلم بجائے خود بہت بہتر ہے۔

طالسطائی کے تین ناول بھی تمثیل کئے جا چکے ہیں۔ اور تینوں متحرک تصاویر کی صورت میں بھی بہت کافی

اہمیت رکھتے ہیں۔ اینا کارے نینا Anna Karenina میں گرٹا گاربو نے، ری سرکشن (Resurrection) میں ڈولورس ڈل ریو (Dolores Del Rio) نے اور کاساک (Cossacks) میں جان گلبرٹ اور رینی اڈوری نے پارٹ کیا ہے۔ ان تینوں تصویروں میں مقابلتاً ری سرکشن زیادہ بہتر ہے۔

لیکن ناولوں میں تمثیل کی خوبیاں "آل کوائٹ آن دی وسٹرن فرنٹ (All Quiet on the Western Front) میں کمال کو پہنچ گئی ہیں۔ اس ناول پر اس کے مصنف ایرچ میرایا ری مارک Erich Maria Remarque) کو نوبل پرائز ملا تھا۔ یہ ناول جو جنگ عظیم کا مرقع ہے۔ جب پردہ سینما پر منعکس کیا گیا تو ۱۹۳۰ء کی بہترین متحرک تصویر قرار پایا۔

قصہ مختصر یہ کہ متحرک تصاویر ادبیات کی گراں قدر خدمت انجام دے رہی ہیں۔ ان کو صرف ایک ذریعہ تفریح سمجھ کر نظر انداز نہ کر دینا چاہیے بلکہ ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ان میں کتاب زندگی کی تفسیریں مل سکتی ہیں۔

گاؤں کی شام

مولوی عبدالقیوم صاحب باقی۔ ایم۔ اے

خرامِ ناز سے دم لے رہا ہے مہرِ مبین
وہ گھاٹیوں سے جھکتا ہے اُس کا نورِ جبیں
شفق کے خون سے گلنار ہو رہی ہے زمیں
چمن چمن نظر آتا ہے رنگِ خلد بریں
ہلال چرخ سرِ شام مسکراتا ہے
چراغ انجم تاباں یہی جھلملاتا ہے

صبا نے برگِ گل تر کا جالیا آغوش
ہے عندلیب چمن زیر آشیاں خاموش
اِدھر گلاب ہے جوشِ شباب سے مدہوش
اُدھر ہے بادۂ شبنم کا یاسمن مے نوش
سکوت شام ہے یا مستی شباب ہے یہ
الٰہی کونسے عالم کا نیم خواب ہے یہ

ہیں پھول، نہر کے پانی پہ سر جھکائے ہوئے

ہیں غنچے جذب محبت سے تلملائے ہوئے
درخت جھیل کے دامن میں سر اُٹھائے ہوئے
چھپے ہوئے زرِ مہتاب کو چھپائے ہوئے
زمیں پہ امن و سکون کے فرشتے آئے ہیں   پیام رحمت پروردگار لاتے ہیں

کسان بانسری میٹھی بجاتا آتا ہے
جہان کو عیش کے نغمے سناتا آتا ہے
وہ گھاٹیوں سے مویشی چراتا آتا ہے
گھنے درختوں میں جلوے دکھاتا آتا ہے
الٰہی خلد میں تیرے بھی ایسا شور ہے کیا   چمن چمن طرب کبک و رقص حور ہے کیا

الٰہی کیا تری جنت میں ایسی جنت ہے
یہ حسن و عشق یہ امن و سکون یہ راحت ہے
جو محنتوں سے میسر ہو ایسی دولت ہے
جو قسمتوں سے ملے ایسی بزم فطرت ہے
جہاں میں تیرے بھی کیا صبح و شام ہوتی ہے   بشر کی عمر بھی یونہی تمام ہوتی ہے

شاہنامہ کا جنم بھوم

(سلسلہ گذشتہ)

از جناب سید محی الدین بادشاہ صاحب متعلم ایم۔ اے کلیہ جامعہ عثمانیہ

دیگر پہلوی کتابوں کے چند اور عربی مترجمین

آل نوبخت۔ خدا نیامہ کے مترجمین کے علاوہ جنکا ذکر اوپر گذر چکا دوسرے پہلوی کتابوں کے چند عربی مترجمین کا ذکر کتاب الفہرست میں آیا ہے اور ان میں آل نوبخت ممتاز ہیں۔ کیونکہ اس خاندان کے اکثر افراد نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ نوبخت خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ میں منجم تھا اور اسی نے سنہ ۱۴۵ھ میں شہر بغداد کی بنیاد رکھنے کی نیک ساعت نجوم کے ذریعہ تبلائی تھی۔ اس کا لڑکا ابو سہل فضل بن نوبخت، ہارون الرشید کے خزانتہ الحکمتہ میں مامور تھا اور علم موالید و نجوم میں کتاب نہمطان[1] اور اس کے علاوہ کئی اور مختلف کتابیں اسکی تالیف سے ہیں جنکا ماخذ ایرانی کتابیں رہی ہیں۔ اس کا بھائی علی بن نوبخت اور خصوصاً اس کا بھتیجا ابو سہل

---

[1] نہمطان ایرانی الاصل لفظ معلوم ہوتا ہے اور کتاب الفہرست میں جن ابواب کا ذکر اس سے منقول ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کا ماخذ قدیم ایرانی نجوم کی کتابیں رہی ہیں۔

اسمٰعیل بن علی بن نوبخت علماء وقت میں سے تھے۔ اس کے دوسرے بھتیجے حسن بن سہل کا ذکر پہلوی مترجمین صاحب علیحدہ مستقل طور پر کیا گیا ہے۔

آل نوبخت کے بعد موسیٰ بن خالد اور یحییٰ بن خالد ہیں جو بقول صاحب کتاب الفہرست داؤد بن عبد اللہ بن حمید بن قحطبہ کی خدمت میں تھے اور اس کے لئے پہلوی سے ترجمہ کرتے تھے جب حمید بن قحطبہ نے سنہ ۱۵۹ھ میں وفات پائی ہے اور اس کا بیٹا عبد اللہ سنہ ۱۹۷ھ میں زندہ تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ ان مترجمین کا زمانہ تیسری صدی کے اوائل کا ہے۔

پھر ابو الحسن بن زیاد التمیمی کا ذکر ہے جنکی تمام ترجمہ کردہ کتابوں میں "زیج ایرانی" مشہور ہے اور جس کو "زیج شہریار" بھی کہتے ہیں۔ چونکہ اس زیج کا ترجمہ بظاہر دوسری صدی کے اواخر میں یا تیسری صدی کی ابتدا میں ہوا ہے تو پھر آسانی کے ساتھ مؤلف کی زندگی کے عہد کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد ابو جعفر (یا ابو حفص) عمر فرخان طبری کا ذکر آتا ہے جو منجمین میں سے تھا اور یحییٰ بن خالد بن برمک اور فضل بن سہل کی خدمتوں میں اور مامون عباسی کے دربار میں رہا ہے۔ دوسرے اہم مترجمین کے نام یہ ہیں۔ اسحق بن یزید اور اسحق بن علی بن سلیمان اور سلم۔ سلم مامون عباسی کے کتب خانہ (بیت الحکمتہ) کا ناظم اور پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ ان مترجمین کے علاوہ اور بھی علماء تھے جنہیں ایرانی کتابوں پر براہ راست کافی عبور حاصل تھا اور جنکی تالیفات ایرانی ماخذوں کے اقتباسات سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح عرب مورخین اور نسب نویس جو نہایت ہی اہتمام کے ساتھ عرب کی تاریخ اور انساب کی تدوین کر رہے تھے اور انہیں پردیسی قوموں کے نسب و تاریخ کی کھوج لگی ہوئی تھی انہوں نے بھی ایران کی تاریخ کے ضبط کرنے میں بے حد جانفشانی کی ہے اور ایران کے متعلق نہایت مفید مواد جمع کیا ہے۔

فرقہ شعوبیہ۔ علماء کی ایک اور بھی جماعت تھی جو شعوبیہ یا ایرانی ملت پرستوں کے نام سے موسوم تھی اور جب ان کا مقابلہ عرب کو ایران پر ترجیح دینے والوں اور عرب کے طرفداروں سے ہوتا تو یہ جماعت

(شعوبیہ) محض اپنے دعویٰ کی تقویت میں تازہ دلیلیں پیش کرنے کے لئے ایرانی تمدن کے مختلف آثار کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور ایران کی عظمت ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس شعوبیہ طبقہ کے اقوال بہت کم مستند ہیں کیونکہ یہ ایک خاص اثر کے تحت میں پیدا ہوئے ہیں۔ نیز حقیقت جو اور بے غرض مورخین کی طرح ہم ان کے اقوال پر کامل اعتماد نہیں کرسکتے۔ لیکن دوسرے طرف ایران کی ملی اور قومی روح اور خصوصاً پچھلے زمانہ کی عظمت اور آثار کو زندہ اور نمایاں کرنے کا شدید خیال اور اپنے آباو اجداد کی شجاعت اور کارناموں کو روشن کرنے کا انتہائی جذبہ عربوں کے مقابلہ میں مفاخرت اور مناظرت، کا باعث ہوا اور ایران کی شاعری اور رزمی روح کو ابھارنے کے اسباب میں سے ایک سبب واقع ہوا۔ اس عرب و عجم کی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلہ میں کئی ایک طبقہ واری تصنیفیں ہوئیں جنمیں عرب کی عجم پر اور عجم کی عرب پر علی الترتیب فضلیت ثابت کرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی۔ اور یہی اختلافات شعوبیہ ادب کی جان ہیں۔

راقم[1] کا عقیدہ یہ ہے کہ فارسی زبان میں خصوصاً تمام قسم کی عمدہ ادبیات یہاں تک کہ خود شعر عروض، قصیدے مدحیہ، ہجائیہ، بزمیہ و رزمیہ اور اسلامی زمانہ کی تمام قسم کی شاعری اور طرز کتابت اور قسم قسم کے علوم و فنون کی تدوین اور آداب کلام وغیرہ عرب سے ایران میں آئے اور اس ملت فاتح یعنی عرب کا جو تمدن کے مختلف شعبوں اور علوم معقولہ میں بہت پیچھے تھی سب سے بڑا تحفہ اس کی بے نظیر عامی اور وسیع زبان تھی۔ اس زبان میں ہزاروں علوم و فنون اور صنایع و بدایع اور لاکھوں اشعار، خطبے، حکمتیں اور امثال اور سیر و روایات و منقولات اور فطری عشقیہ شاعری اور تاریخ و نسب کی محقق کتابیں موجود تھیں (بدقسمتی سے اس کے برعکس ایرانی ادب ان خوبیوں سے بالکل معرا تھا بلکہ تاریخ گوئی اور داستان گوئی کی وجہ سے قدیم سے بدنام چلا آرہا تھا) یا دوسرے الفاظ میں عربوں کا کرشمہ یہ تھا کہ انہیں علوم منقولہ میں (مثلاً تاریخ، انساب، روایات، اشعار، لغات، نحو و صرف و امثال و وقایع ایام مشہورہ وغیرہ) میں کامل دستگاہ اور تفوق حاصل تھا۔ اس کے برخلاف دوسری متمدن قومیں علوم فلسفہ و طبیعات، حساب اور ہندسہ

---

[1] آقائی سید حسن تقی زادہ۔

وغیرہ میں ترقی کر چکی تہیں۔ اور ایرانی بھی ہندیوں کی طرح زیادہ تر روحانی اور اخلاقی فلسفہ اور حکمت و موعظت پر مائل تھے۔ ہماری کتابوں میں اسکی بہت ساری مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اور بہت ساری ایسی حکاتیں اور روایتیں بھی ملتی ہیں، جنمیں فلسفیانہ رنگ تو غالب ہے۔ مگر تاریخی حیثیت سے ان کہانیوں کی بنیاد نہایت کمزور واقع ہوئی ہے مثلاً گویا ہارون الرشید بود یا یکی از سلاطین صفویہ در دمشق یا نیشاپور در سنہ ۲۰۰ ہجری یا سنہ ۱۰۰ ہجری یہ یکی از ملوک اطراف یا وزیر خود چنیں نوشت . . . . حکایت کی ابتدا تو اسطرح بے سروپا ہوتی ہے مگر اس میں کوئی نہ کوئی فلسفی نکتہ ضرور مضمر ہوتا ہے۔

عرب کی شجاعت کے افسانون کا ایرانیوں پر اثر۔ واضح ہو کہ گذشتہ تاریخ کو جمع کرنے اور اس کی تدوین کرنے کی طرف توجہ اور خصوصاً سلاطین کی عظمت کے آثار اور اون کے مشہور واقعات کا قلمبند کرنا اور ایرانی بزرگوں کے نسب نامے لکھنے اور آبا و اجداد پر فخر و مباہات کی داستانیں یہ سب عربی اثرات کا طفیل تہیں۔ اور قبیلوں یا عرب کے مختلف نسلوں کے فخر و مباہات کی ترتیب اور اشعار، اولئک آبائی فجئنی بمثلہم" اور عرب کا تفاخر ایرانیوں کے اشتعالک کا باعث ہوا اور ایرانیوں نے بھی عربوں کی تقلید میں عربی نظم و نثر میں اپنے آبا و اجداد کی مفاخرت کی بنا ڈالی۔ اور رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی ملکی زبان (اسلامی فارسی) میں بھی اس قدر سخن سرائی کی ہے کہ کئی شاندار داستانیں وجود میں آئیں مثلاً رستم و اسفندیار وسہراب برزو بیژن۔ منیژہ۔ سیاوش و مرام رزو گرشاسپ و بہمن و گودرز و سام و نریمان اور زال وغیرہ اور خصوصاً ان پہلوانوں کے قصے اور سرگزشتیں جو داستان گوؤں اور نقالوں کے ذریعہ رواج پائے تھے۔ عرب کے قومی پہلوانوں کے قصے اور کثیر الاشاعت داستانوں کی تقلید اور اثر سے خالی نہیں تھے۔ اس بات کا قوی احتمال ہے کہ عنترہ بن شداد عبسی عمرو بن معدیکرب۔ بنی ہلال وغیرہ کی داستانیں (جو زمانہ مابعد میں مستقل افسانون اور ناولوں کی حیثیت اختیار کیں مثلاً سیرۃ عنترہ۔ سیرۃ ابو زید و بنی ہلال کے نام سے مشہور ہوین اور ان پر مبسوط کتابین لکھی گئیں) در اصل اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عرب کے قصہ گوؤں کے زبان پر جاری تھین۔ ابتدا میں یعنے اسی پہلی صدی ہجری میں جبکہ عربوں نے اپنے انساب کے جمع اور تدوین کرنے میں اہتمام کیا۔ اور اس قوم میں بڑے بڑے نسابین

پیدا ہوئے تو انہوں نے اپنی نسب کی کتابوں میں ہمسایہ اقوام کے سلاطین کا نسب بھی درج کیا اور خصوصاً کلبی (محمد بن سائب) اور اوس کا بیٹا ہشام جنکا کہ ذکر گزرچکا مشہور ترین عربی انساب کے جاننے والوں میں سے تھے اور انہوں نے بہت ساری بے تحقیق روایتیں اور افواہیں بھی جو ایران کے متعلق مشہور تھیں ان کو اپنی کتابوں میں منضبط کر دیا ہے۔ ہشام بن محمد کی روایات تاریخ ایران کے باب میں طبری کے نہایت اہم ماخذ ہیں۔ اس نسب نویس اور تاریخ عرب کے مورخ کا زیادہ تر سروکار تاریخ عرب سے رہا ہے اگر دوسری قوموں کی تاریخ کی طرف اشارہ کیا ہے تو وہ محض ضمنی ہے عرب کے تمام مشہور نسابین نے بھی بظاہر ایرانی سلاطین کے نسب کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے مجمل التواریخ کی فصل میں جو طبقہ کیانیان سے متعلق ہے کہتا ہے "ان کا پہلا بادشاہ کیقباد تھا اور نسب کی کتابوں کے مطالعہ سے جو ابن المقسم۔ عطا۔ شعبی اور دغفل عرب نسب نویسوں کی تالیف ہیں میں نے معلوم کیا ہے کذا قال صاحب النسخة قال کان کیقباد ابن الزاب الذی یقال له المجوس (؟) اور دوسرے روایت یہ ہے کہ کیکامہ کا لڑکا تھا .... "دغفل نسابہ (حجر بن الحارث کنانی) ۶۵ھ میں تھا یہاں تک کہ حضرت رسول صلعم کا زمانہ دیکھا ہے۔ باقی ۳ اشخاص بھی اسلام کی ابتدائی صدیوں میں سے تھے۔

فرقۂ شعوبیہ کے ممتاز افراد۔ ان لوگوں کے علاوہ علان مشہور شعوبی ہے جو ایرانی الاصل تھا۔ لیکن عرب کے نسبوں میں خصوصیت رکھتا ہے اور ہارون و مامون کے کتابخانہ میں مامور تھا۔ اس نے عربوں کے نسب کی چھان بین میں بہت ساری کتابیں لکھی ہیں۔ محمد بن القاسم التیمی جو ابوالحسن النسابہ کے نام سے مشہور تھا بصرہ کا رہنے والا تھا یہ بھی علمائے نسب میں سب سے زیادہ معلومات رکھنے والا شخص تھا۔ اور یہ تیسری صدی کے آخر میں یا چوتھی صدی کی ابتدا میں زندہ تھا اس نے ایک کتاب موسوم بہ "اخبار الفرس وانسابھا" لکھی ہے۔ عمر کسری کا سابق میں ہم ذکر کرچکے ہیں۔ مسعودی نے مروج الذہب میں ایران کے متعلق ابوعبیدہ محمد بن المثنی کی کتاب سے مختلف روایات نقل کیا ہے۔ یہ شخص بھی اگر اس کے نام کی وضع سے قیاس کریں تو ممکن ہے کہ عرب ہو لیکن ایرانی خبروں کی اسقدر کامل واقفیت رکھتا تھا کہ اسکو کسری کے ساتھ ملقب کیا گیا یہ دوسری صدی کی ابتدا میں تھا۔ خود ابوعبیدہ بھی جس نے ۲۱۱ھ میں وفات پائی ہے مشہور مولفین سے تھا اور اس کی تمام کتابوں میں سے ایک کتاب موسوم بہ فضائل الفرس بھی ہے۔ دوسرا شخص سعید بن حمید کا نب طوسی ہے جس نے

مثالب میں عربوں کی مذمت اور ایرانیوں کی تعریف اور فضیلت میں لکھی ہیں۔ ابو الحسن علی بن عبیدۃ الریحانی بھی
مامون عباسی کے زمانہ کے بڑے مولفین اور علماء میں سے تھا۔ اور اس نے بھی ایرانی روایتیں لکھی ہیں۔ ابو عبد اللہ
محمد بن عمران بن موسیٰ بن سعید بن عبد اللہ خراسانی معروف بہ مرزبانی (متولد ۲۹۶ھ متوفی ۳۸۴ھ) نے بھی ایک کتاب
موسوم بہ "کتاب الاوایل" قدیم ایرانیوں کے حالات میں لکھی ہے۔ ابو الفضل احمد بن ابی طاہر طیفور خراسانی الاصل
و بغدادی المولد (۲۰۴ھ تا ۲۸۰ھ) نے بھی ایک کتاب ہرمز بن کسریٰ و نوشیروان کے حالات میں لکھی ہے۔
اسحق بن سلمہ ایرانی الاصل ہے جو کتاب "فضل العجم علی العرب" کا مولف ہے داود بن الجراح نے جو تیسری صدی
کے وسط میں زندہ تھا۔ مسعودی صاحب مروج الذہب کے قول کے مطابق ایرانی اور دوسری قوموں کی تاریخ میں
ایک جامع اور عمدہ کتاب لکھی ہے۔ ابن خرداذبہ (ابو القاسم عبید اللہ بن عبد اللہ) نے جس کی مشہور تالیف "کتاب
المسالک والممالک" اب بھی موجود ہے ایک تاریخی کتاب بھی لکھی تھی جس کا دنیا سے ناپید ہونا باعث تالیف ہے۔
کیونکہ مشار الیہ ایران کی قدیم کتابوں پر اچھی قدرت رکھتا تھا اور یہ کتاب تاریخ ایران کی نہایت مستند ماخذ تصور کیجاسکتی
تھی۔ ثعالبی "کتاب غرر" میں اس کتاب سے نقل کرتا ہے اور مسعودی مروج الذہب میں نہایت ہی مبالغہ
آمیز الفاظ میں اس کی تعریف کرتا ہے۔

ایران کے متعلق دیگر عربی تالیفات اور منظوم قصے | ان اشخاص کے سوا جنکا ذکر اسلام کی ابتدائی صدیوں کے ان علماء اور
مصنفین اور مورخین کے نمونہ کے طور پر جنھوں نے ایران اور اس کی تاریخ و ادب کے متعلق عربی میں لکھا تھا اور برگزیدہ ہے
اور بھی کئی علماء اور مولفین کے نام اور ان کی کتابوں کے نام موجودہ کتابوں میں پائے جاتے ہیں جنہوں نے ابتدائی
تین چار صدیوں میں جبکہ ایرانی آثار اور آداب و اخبار کا بڑا سرمایہ موجود تھا۔ بقدر امکان تدوین و تالیف میں حصہ
لیا تھا۔ بدقسمتی سے ان کا ایک بڑا حصہ تلف ہوگیا ہے اس قسم کی کتابوں اور مولفین کے ناموں سے واقف ہونیکے
لئے ابن الندیم کی کتاب الفہرست اور حاجی خلیفہ کی "کشف الظنون" بحد مدد دیتی ہیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ اسلام
کی ابتدائی تین صدیوں میں مسلمان ایرانیوں کی تحریری زبان عربی تھی خود ان لوگوں نے بھی بہت کچھ ایران اور

اس کی تاریخ اور آداب میں لکھا ہے لیکن تحقیق و تالیف کا ذریعہ عربی تھا۔

قدیم ایرانی کتابوں کا موضوع بالکل تاریخ نہیں تھا بلکہ ہر قسم کے رسوم و آداب و سیاست و اخلاق اور علم نجوم وغیرہ ان کا موضوع رہا ہے۔ خصوصاً بہت ساری کتابیں ایرانی جشنوں اور اُن میں بھی خاص کر نوروز اور مہرجان پر موجود تھیں۔ اُن کتابوں میں سے جو دستیاب ہوتی ہیں اور اون قدیم ایرانی خبروں سے جو ان کتابوں کے واسطے ہم تک پہنچی ہیں۔ سب میں عمدہ کتاب عربی میں ابن قتیبہ کی "عیون الاخبار" ہے۔ اور دوسرے کتابوں کے نام یہ ہیں۔ کتاب تاریخ یعقوبی دینوری کی "الاخبار الطوال" اور کتاب "نظم الجواہر" اور ابن بطریق کی کتاب "التاریخ المجموع علی التحقیق والتصدیق" "تاریخ طبری" "کتاب حمزۃ اصفہانی اور مسعودی بغدادی کی کتابیں۔ مقدسی کی "کتاب البدء والتاریخ" اور جاحظ، بیرونی، مسکویہ، اور ثعالبی کی کتابیں۔ خوارزمی کی کتاب" مفاتیح العلوم" عرب کی جغرافی کتابیں اور کتاب گمنام جس کا نسخہ معروف بہ اشپرنگر[1] ہے۔ فارسی میں بلعمی کا ترجمہ تاریخ طبری اور مجمل التواریخ شہرستانی کی کتاب الملل والنحل اور بلاذری کی "فتوح البلدان" میں بھی بہت کچھ مواد قدیم ایران کے متعلق ہے۔

ابان لاحقی و بلاذری۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں کے مترجمین و مؤلفین کی کتابوں کے متعلق لکھا جا چکا ہے جنھوں نے ایران کی تاریخ مستقل طور پر لکھی ہے یا اپنی تالیفات کی ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے ان میں اکثر کتابیں مفقود ہو چکی ہیں اور ان کتابوں کا بھی ذکر ہو چکا ہے۔ جن میں اس قسم کا مواد ہے اور وہ اب دستیاب بھی ہو سکتی ہیں اس لئے اس موضوع کو مختصر کر کے صرف دو مؤلفوں اور مترجموں کے متعلق لکھا جاتا ہے۔ ان کا تفصیل کے ساتھ اس موقع پر

---

[1] برلن کے ملی کتب خانہ میں ایک عربی نسخہ محفوظ ہے۔ مصنف اور تصنیف کا کہیں سے کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔ مگر مواد کے لحاظ سے کتاب نہایت اہم واقع ہوئی ہے۔ اس کا موضوع مختلف ممالک کی تاریخ ہے جس میں ایران کا ذکر بھی مندرج ہے۔ یہ کتاب ۱۱۲۸ھ میں تالیف ہوئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کوئی یہودی تھا یا عبرانی زبان کا جاننے والا تھا۔ اس کتاب کے گمنام ہونیکی وجہ سے اس کو اسکے

ذکر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے ہم نے کنارہ کشی کی اور اب اپنے موضوع کے لحاظ سے ان کی اہمیت کے مدنظر علٰحدہ بیان کرنا چاہتے ہیں ان دونوں کی خصوصی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے ایرانی داستانوں کو براہ راست پہلوی سے یا ایک واسطہ سے عربی نظم میں ترجمہ یا نقل کی ہے۔ اور یہ بات راقم[1] کی نظر میں فارسی زبان میں تخیل اور داستان کی تدوین کا ضرور باعث ہوئی ہے۔ (اگرچہ کہ یہ ایک تنہا سبب نہیں)۔

پہلا شخص ابان بن عبد الحمید بن لاحق بن عفیر رقاشی المتوفی سنہ ۲۰۰ھ ہے جو اہل بصرہ سے تھا اور عرب کا بڑا پرگو شاعر تھا۔ اس کے اکثر اشعار مثنوی اور مسمط ہیں۔ اس نے مدح اور ہجو اور مراثی کے علاوہ بہت سی کتابیں نظم میں لکھی ہیں۔ ابان لاحقی ایرانی اور ہندی کتابوں کو عربی میں نظم کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے کلیلہ و دمنہ برمکیوں کے لئے نظم کی اس کے علاوہ کتاب سیرۃ اردشیر۔ سیرۃ نوشیروان۔ بلوہر و بوذرسف۔ کتاب سندباد۔ کتاب مزدک۔ کتاب الصیام والاعتکاف اور کتاب حلم الہند وغیرہ بھی عربی میں نظم کی گئیں ایک اور بھی منظومہ کتاب تھی جو عوام میں "ذات الحلل" سے موسوم ہے۔ مشارٌ الیہ نے اپنے ایک قصیدہ کے صلہ میں ہارون الرشید سے بیس ہزار درہم حاصل کئے تھے۔ دوسرا مؤلف بلاذری ہے۔ یہ بھی پہلوی مترجم تھا اور اس نے عہد اردشیر کو نظم کیا تھا۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ عربوں میں منظوم شاعری (عربی عروض میں) اس قدر کثرت سے رائج تھی کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملسکتی حقیقت میں محاورہ و کلام منثور طبیعی اسقدر سہل ہوگیا تھا کہ اکثر عرب کے بدوی فصحا بھی اپنے ہر قسم کے قلبی اور روحی احساسات مثلاً حدی۔ حزن۔ فرح۔ ہیجان۔ جنگ۔ فخر۔ عشق۔ استغاثہ۔ طعن، ہجا۔ مرثیہ۔ طلب و شکایت کے موقعوں پر زیادہ تر منظوم ابیات میں بیان کرتے تھے اور یہ ابیات بہت جلد زبان پر جاری ہوجاتے تھے اور ان کو اشعار کے راوی اور حفاظ جو بیشمار تھے امرار و مشایخین کی بارگاہ میں اور قبیلوں کے سرداروں کے روبرو پڑہتے تھے اور اسلاح عرب کے اشعار یمن سے جرہ تک گشت لگاتے تھے اور حافظہ قلم کا کام دیتا تھا۔ اور تحریر کے محتاج نہیں تھے۔ جس وقت خلیل بن احمد المتوفی ۱۷۰ھ نے علم عروض کو وضع

---

[1] آقای سید حسین تقی زادہ۔

اور مدون کیا ہے۔ تو اوس وقت قواعد عروض کی بنا پر کلام کا موزوں کرنا اور بھی آسان ہوگیا ایران کے موزوں طبع لوگ اور بھی جو اس سے پیشتر یقینی طور پر فطری طور پر موسیقی شعر سے واقف تھے۔ وہ بھی عروض کو یاد رکھنے لگے۔ اور اسی کی تقلید میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور اس قسم کی کوشش کا سب سے پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیلہ و دمنہ کی عربی منظوم نسخہ نے رودکی کے دل میں فارسی مثنوی میں کلیلہ و دمنہ منظوم کرنے کا شوق پیدا کیا اور اسی طرح سندبادنامہ بھی منظوم ہوا۔ اور مسعودی مروزی کے اشعار بھی اسی ماحول کی پیداوار ہیں جس کا ذکر آگے آئیگا۔

معیار زندگی

عمرانیاتی تشریح و توضیح

از جناب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی معلم عمرانیات کلیہ جامعہ عثمانیہ

(مسئلہ معیار زندگی کی نوعیت، اعلیٰ معیار زندگی کے مختلف تصورات۔ اصلی معیار زندگی کا مفہوم۔ اعلیٰ معیار زندگی اور مسئلہ ترقی۔ پس اندازی اور مسئلہ معیار زندگی۔ معیار آسائش اور معیار زندگی)

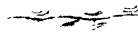
معیار زندگی کا مسئلہ عمرانیات متعلقہ کے اُن اہم و دشوار مسائل میں شمار ہوتا ہے جس کی خاطر خواہ مکمل تحلیل ابتک خود ماہرین عمرانیات سے نہو سکی۔ شروع ہی میں اس کا اعتراف اس لئے لازم ہے تاکہ ان لوگوں کو جو اس مضمون کے پڑھنے کی زحمت گوارا کریں مایوسی نہو اور وہ یہ نہ کہیں کہ مضمون تشنہ ہی رہا۔ جدید ہونیکی وجہ سے عمرانیات میں بہت سے مسائل اب بھی ایسے ہیں جنکے متعلق کافی تحقیق نہیں ہوئی۔ ان ہی میں معیار زندگی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔

مسئلہ معیار زندگی کی نوعیت۔ یہ حقیقت ہمیشہ ذی شعور لوگوں کے لئے باعث حیرت و استعجاب رہی ہے کہ تقریباً ہر ملک و زمانہ میں اگر ایکطرف ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو باوجود کثیر آمدنی کے پست معیار کی زندگی بسر کرتے ہیں تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو قلیل آمدنی کے باوجود بھی اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معیار زندگی کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونیسے کیا مراد ہے؟ اعلیٰ معیار زندگی کے کیا آثار ہیں؟ اور اعلیٰ معیار زندگی کے صنعت و حرفت، زراعت و تجارت پر کیا اثرات پڑتے ہیں؟۔

<u>اعلیٰ معیار زندگی کے مختلف تصورات۔</u> معیار زندگی کے مختلف تصورات ہیں۔ اخلاقی، مذہبی، معاشی و عمرانی۔ مذہبی، اخلاقی نقطہ ہائے نظر سے معیار زندگی کے پست یا اعلیٰ ہونیکا دارو مدار صداقت پسندی، خلوص، زہد و تقویٰ، پرہیزگاری، نفس کشی اور احکام مذہب و شریعت کی پابندی پر ہے۔ برخلاف اسکے معاشیین اور بالخصوص عمرانیین کے زاویۂ نگاہ سے معیار زندگی کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونیکا انحصار اسی پر نہیں کہ ہم چند "روحانی طاقتوں" کا اظہار کریں بلکہ اُن کی دانست میں وہی معیار زندگی اور طریق زندگی بہترین ہے جس سے خود انسان کو سکھ پہنچے اور دوسروں کے لئے بھی چین و اطمینان کے اسباب فراہم ہوں، خود بھی راحت و آرام میں زندگی بسر کریں اور دوسروں کیلئے بھی فلاح و بہبود کے ذرائع بہم پہنچائیں۔

معیار زندگی کا مسئلہ اسقدر پیچیدہ ہے کہ اسکی تحلیل کے وقت گوناگوں ضمنی مسائل نمودار ہونے لگتے ہیں جہانتک اِس مضمون میں ممکن ہوگا ہم سہولت تفہیم کی غرض سے مکمل مختصر مگر جامع استدلال پیش کرینگے۔



<u>اقسام احتیاجات اور مسئلہ معیار زندگی۔</u> واقعہ یہ ہے کہ انسانی احتیاجات بوجہ اپنی اہمیت و ضرورت کے ایک ہی طرح کی نہیں ہوتیں۔ بعض احتیاجات تو لازمی ہیں جنکا پورا کرنا بقائے حیات کے لئے قطعی طور پر ضروری ہے (مثلاً بھوک، پیاس، خواہش، پناہ) بعض ایسی ہیں جنکا پورا کرنا کسیقدر چین و اطمینان سے زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے (مثلاً اسباب خانہ داری کی خواہش) اور بعض ایسی ہیں جو ہمارے نفس کو بہلانے والی ہیں (مثلاً شراب، سگریٹ، افیون کی خواہش)۔ یہ آخرالذکر احتیاجات ایسی ہیں جنکا پورا ہونا نہ تو بقائے حیات کے لئے ضروری ہے۔ اور نہ فلاح نسل کے لئے بلکہ یہ ان دونوں کے لئے ایک حد تک مضر ہے۔

بعض ماہرین نفسیات کو اس میں شبہ ہے کہ یہ احتیاجات فطرت کے تقاضے سے پیدا ہوتی ہیں اور یہ کہ وہ طبعی ہیں کیونکہ تعیشاتی چیزوں کے عادی ہونیکے بعد ہی اس قسم کی "احتیاجات" محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھوک کو چھوٹے بڑے بچے بوڑھے سب محسوس کرتے ہیں مگر شراب، سگریٹ، افیون وغیرہ کی خواہش

صرف انہیں کو ہوتی ہے جو ان چیزوں کے عادی ہوں۔ ایک شرابی شراب کے لئے اسی طرح بیقرار رہتا ہے جیسے کوئی بھوکا غذا کے لئے اور وہ لوگ جو اس کے عادی نہوں شراب کی "احتیاج" کو مطلق محسوس نہیں کرتے پس ثابت ہوا کہ یہ فطری ضروریات نہیں ہیں۔

بہر طور احتیاجات تین قسم کی ہیں جنہیں ہم لازمی، تمدنی اور آسائشی احتیاجات یا احتیاجات درجہ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ کہسکتے ہیں۔

مادی مرفہ الحالی کی تعریف۔ اس لحاظ سے جب انسانی احتیاجات اپنی اہمیت کی مناسبت سے (وہ اسطرح کہ اہم ترین احتیاجات سب سے پہلے، پھر متوسط درجہ کی اور بالآخر ادنیٰ درجہ کی) پوری ہوں تو ہم اس حالت کو مادی مرفہ الحالی سے تعبیر کرینگے۔

معیار زندگی کا مفہوم۔ مادی مرفہ الحالی کا مفہوم سمجھنے کے بعد یہ کہنا ایک حد تک درست ہے کہ جب انسانی احتیاجات اسطرح سے پوری ہوتی ہوں جس سے ادنیٰ کی خاطر متوسط درجہ کی احتیاجات اور متوسط درجہ کی احتیاجات کی خاطر اعلیٰ درجہ کی احتیاجات قربان نہ ہوں تو ہم اس قسم کی زندگی کو جس میں جملہ احتیاجات بہ نسبت اپنی اہمیت کے پوری ہوتی ہوں اعلیٰ معیار کی زندگی تصور کرسکتے ہیں۔

گر صرف مادی مرفہ الحالی ہی سے معیار زندگی بڑھ نہیں سکتا۔ ابتدا میں عام طور پر معاشیئن اس غلط فہمی میں تھے کہ معیار زندگی کے بلند یا پست ہونے کا انحصار مادی مرفہ الحالی پر ہے اور جس قدر زیادہ مادی مرفہ الحالی ہوتی ہے اسیقدر بلند معیار زندگی بھی ہوتا ہے۔ اس غلطی کا احساس خود معاشیئن ہی کو ہوا اور جس طرح پروفیسر الفریڈ مارشل جیسے محقق نظری معاشیات نے اقرار کیا ہے "بلندی معیار زندگی کے لئے اضافہ عقل اور خودداری لازمی ہیں جنکی بدولت اخراجات میں زیادہ احتیاط سے کام لیا جاتا ہے، ایسی شراب اور غذائیں ترک کیجاتی ہیں جنسے نفس کو تو حظ پہنچتا ہو مگر جنسے طاقت و توانائی نہ بڑھتی ہو اور ایسے طریقے زندگی بھی ترک کئے جاتے ہیں جو جسمانی یا اخلاقی نقطۂ نظر سے مضر ہوں"[1]

ہر ملک و زمانہ میں ایک طرف ایسے گھرانے نظر آتے ہیں جنکا معیار زندگی باوجود کثیر مادی دولت و آمدنی کے اسقدر ادنیٰ ہے کہ وہ بمشکل انسانوں کے شایان شان تصور کیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف بعض متوسط الحال لوگ ایسے ہوتے ہیں جنکا معیار زندگی باوجود محدود دولت و آمدنی کے اسقدر اعلیٰ ہوتا ہے کہ دنیا کا ہر مہذب شخص اسپر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ ان متضاد صورتوں کی کیا وجہ ہے؟ اس ظاہر امعمہ کا کیا حل ہے۔

اعلیٰ معیار زندگی کی سب سے زیادہ قابل لحاظ خصوصیات میں نہ صرف مادی دولت داخل ہے بلکہ ذہنی قابلیت بھی شامل ہے؛ یعنی یہ کہ صرف معاشی دولت بھی معیار زندگی کو بلند نہیں بنا سکتی۔ معاشی دولت کو "عاقلانہ" طور پر استعمال میں لانے کے لئے اور جمالیات و افادہ دونوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے آمدنی کو خرچ کرنے کے لئے فہم و ادراک خوش مذاقی و سلیقہ مندی، ضبط نفس اور تسخیر دل کی ضرورت ہے تاکہ کوئی غیر اہم یا مضر صحت احتیاج پوری نہ ہونے پائے اور نہ کوئی آسائشی احتیاج کسی اہم تر احتیاج کی قربانی سے پوری ہو سکے۔

لہذا ہم یہ کہہ سکتے کہ جسقدر آمدنی کا استعمال عقلی ضروریات و تمدنی احتیاجات کی مطابقت سے ہوگا اور ہمارے اخراجات و آمدنی میں یکرنگی و ہم آہنگی ہوگی اتنا ہی معیار زندگی اعلیٰ ہوگا۔ بالفاظ دیگر اخراجات جسقدر زیادہ تہذیب و تمدن اور جمالیاتی مذاق صحیحہ سے اتفاق کرینگے اسیقدر معیار زندگی بلند ہوگا۔

محض اسلئے کہ اعلیٰ معیار زندگی کا دارومدار صرف مادی دولت و آمدنی ہی پر نہیں بلکہ خوش مذاقی و سلیقہ مندی پر بھی ہے، بیشترین مصارف کا معیار زندگی ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا۔ مصارف کے زیادہ و کم ہونے اور معیار زندگی کے اعلیٰ و ادنیٰ ہونے میں کوئی مقررہ و معینہ تناسب نہیں، یہ نظریہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

ہم اپنے گرد و پیش بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں جنکی طرز زندگی باوجود کثیر مصارف کے نہ انسانوں کے شایاں ہے نہ وہ خود انہیں کے لئے آرام دہ یا راحت رساں ہے۔ کہنے کو تو یہ لوگ ہزاروں روپیہ خرچ کرتے ہیں مگر

لہ ۔ ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ (۱۴۴)۔ اصل عبارت کے لئے دیکھئے۔

بمقام لندن ۱۸۹۱ء صفحہ ۳۰۶

حقیقت یہ ہے کہ ایک غلیظ محلہ میں ایک بے ڈھنگے سے مکان میں پڑے رہتے ہیں، نہ سلیقہ کے نوکر نہ سلیقہ کا گھر بار، چمن بے رونق، صحن ویران، کہیں دالان میں چارپائی پڑی ہے، کہیں ہر قسم کی چھوٹی بڑی، نئی پرانی، ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی ہیں۔ ڈرائینگ روم میں تو چند قیمتی گر بدنما سونے رکھے ہوئے ہیں مگر دیواروں پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ برسوں سے رنگ نہیں ہوا۔ روشن دانیاں بند پڑے ہیں، کونوں میں جالے لٹکے ہوئے ہیں، میز کرسیوں پر گرد جمی ہوئی ہے، فرنیچر بے ترتیبی سے رکھا ہوا ہے، غرض یہ کہ مکان کا ہر حصہ مکین کے ادنے معیار زندگی کا ثبوت دیرہا ہے۔

رہائش کا حال یہ ہے، اس سے بدتر طعام کا ہے۔ روز آنہ کے کھانوں کا تو کیا ذکر ان گھرانوں کی دعوتوں ہی کی حالت دیکھیئے بالخصوص اسوقت کی جبکہ شادی یا بیاہ کی کوئی تقریب ہو۔ قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے ہیں مگر مزیدار ایک بھی نہیں، کسی میں مرچ زیادہ ہے تو کسی میں نمک کم، سالن ٹھنڈے ہیں تو پانی گرم، نہ کھلانے والے کو خوشی نہ کھانے والے کو مسرت۔

برخلاف ان کے آپ یہاں بھی ایسے لوگ پائینگے جن کے مکانوں کے در و دیوار ہی سے خوش سلیقگی برستی ہے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مکان صاف و شفاف۔ نظر آتا ہے کوڑے کرکٹ کا کہیں نام نہیں، گھر صاف، کمرے صاف، لباس صاف خود صاف ۔

جس حیثیت سے رہتے ہیں اسی طرح کا کھاتے ہیں چھ چھ قسم کے سالن نہ سہی دو ایک ہی ہوتے ہیں مگر صحت بخش اور ذائقہ دار۔ کھانوں کے ساتھ کبھی میٹھا ہے تو کبھی پھل ہنسی خوشی سے سب نے ملکر وقت پر تھوڑا تھوڑا کھایا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ نہیں کہ جہاں کھایا وہیں لیٹ رہے یا جہاں بیٹھے ہیں وہیں کھانا منگالیا۔

غرض کہ مصارف کی کمی و بیشی سے معیار زندگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اور یہی عمرانیاتی تحقیقات کا پہلا ثمر اور نتیجہ ہے کہ اعلیٰ معیار زندگی کو امارت سے کوئی خصوصیت نہیں۔ اعلیٰ معیار کی زندگی کے لیے سلیقہ، تنظیم، خوش مذاقی، ہنرمندی لازمی ہیں اور صاف ظاہر ہے کہ یہ چیزیں روپیہ خرچ کرنے سے نہیں آتیں۔

اعلیٰ معیار زندگی کی امتیازی خصوصیت۔ یہ پرکھنے کے لئے کہ معیار زندگی اعلیٰ ہے یا نہیں اس روپیہ کا ماخذ معلوم کرنا بھی ضروری ہے جو تہذیب و تمدن، آرائش و آسائش پر خرچ کرنے کے لئے آتا ہو۔ اگر یہ روپیہ آمدنی سے حاصل ہوتا ہے تو معیار زندگی اعلیٰ ہے اور اگر اس کا ماخذ جمع شدہ دولت یعنی پونجی ہے تو وہی زندگی پست ترین معیار پر پہنچ جاتی ہے کیونکہ پونجی کا صحیح مصرف یہ ہے کہ وہ بطور سرمایہ کے استعمال کیجائے یعنے یہ کہ نئی دولت پیدا کرنے میں مدد کرے نہ یہ کہ راست صرف کیجائے کیونکہ جب گذارے کا دار و مدار آمدنی پر نہیں بلکہ پونجی پر ہوتا ہے تو ادبار کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور انحطاط لازمی ہے۔ جب تہذیب و شائستگی جونک بنکر گذشتہ زمانوں کی جمع کردہ دولت پر گذر کرتی ہے تو وہ طفیلی تہذیب ( ) بنجاتی ہے۔

آمدنی کو بیدریغ لٹانا بھی قابل معافی ہوسکتا ہے مگر وہ اخراجات جو خواہ مہذب چیزوں اور کاموں کے لئے ہی برداشت کئے جاتے ہوں مگر جن کے لئے پونجی صرف کرنی پڑتی ہو یا یہ کہ قرض لینا پڑتا ہو اعلیٰ معیار زندگی کے سراسر منافی ہیں بالفاظ دیگر وہ جو کہ اپنی آمدنی پر گذر کرتے ہیں بشرطیکہ وہ دیگر شرائط پورے کرتے ہوں اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کرتے ہیں اور وہ جو کہ پونجی پر بسر اوقات کرتے ہیں اور گذشتہ نسلوں کے جمع کردہ مال و دولت کے برتے پر ظاہرہ شان قائم کئے ہوئے ہیں چاہے وہ دیگر شرائط پورے بھی کرتے ہوں اسکا معیار زندگی ادنیٰ ہے۔ سب سے بہترین اور اعلیٰ ترین معیار کی زندگی وہ جس میں آمدنی ہی صرف میں آتی ہو اور ہر احتیاج اپنی اپنی اہمیت کے مطابق دانشمندانہ طور پر افادیت و جمالیت کے دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پوری کیجاتی ہو۔

مختلف اقسام احتیاجات پر آمدنی کس طرح صرف کیجائے؟ اسکے متعلق کوئی صحیح نسبت اول ہی سے نہیں مقرر کیجاسکتی ان مختلف النوع ضرورتوں مثلاً غذا، مکان و لباس، معالجہ و ادویات رہائش و آسائش، چندہ اور خیرات، سیر و تفریح، سواری، نوکر، کتب و اخبار، پر ہر شخص کو اپنی آمدنی کے مطابق کم و بیش خرچ کرنا چاہیئے اسی وجہ سے مختلف اوقات اور مختلف مقامات، مختلف اشخاص اور مختلف طبقوں، مختلف حالات اور مختلف ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے اخراجات کے مختلف مدوں پر نسبت مصارف جداگانہ رہیگی۔ مگر بجز چند صورتوں کے

اعلیٰ معیار زندگی کا تقاضا یہی رہیگا کہ آمدنی ہی صرف ہو۔

یہیں پر یہ معرکتہ آرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اعلیٰ معیار زندگی قرض لینے کو روا رکھتا ہے یا نہیں یعنے یہ کہ اصول اعلیٰ معیار زندگی کے مطابق قرض لینا درست ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو کس حدتک اور کن شرائط کے تحت۔

اعلیٰ معیار زندگی اور مسئلہ قرض

قرض کے متعلق اعلیٰ معیار زندگی کا صرف ایک ہی صحیح نظریہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ قرض کی لین دین فی نفسہ بری نہیں اور ذاتی اغراض کے لئے بھی قرضہ کا لینا اعلیٰ معیار زندگی کا تقاضا ہوسکتا ہے۔ شرط البتہ قرض کی غرض وغایت ہے۔

نظری معاشیات کا یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ قرض اگر پیدا آور اغراض کے لئے لیا جائے تو کوئی قباحت نہیں۔ اور جس طرح کسی محقق معاشیات نے سچ کہا ہے وہ قرضہ قرضہ ہی نہیں جو پیدا آور اغراض کے لئے لیا جائے۔

جس طرح پونجی کو سرمایہ یا اصل بنانا معاشی نقطہ نظر سے ملک کی فلاح وبہبود کا ایک ذریعہ ہے اسیطرح پیدا آور اغراض کے لئے قرض لینا ذاتی مرفہ الحالی کا ایک وسیلہ ہے۔ مثال کے طور پر وہ لوگ جو صنعتی وزراعتی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے سرکار یا با اقتدار انجمنوں سے قرض لیکر بیرونی ممالک جاتے ہیں اور واپسی پر محض اس اعلیٰ تعلیم کے طفیل سے بڑی بڑی تنخواہ پاکر اصل وسود کی ادائی کرسکتے ہیں صحیح اصول زندگی پہ عمل کرتے ہیں۔

اسیطرح بالعموم جو مکانوں کی تعمیر کے لئے قرض لیا جاتا ہے وہ بھی پیدا آور قرض ہوتا ہے۔ بد وضع بے رونق کرایہ کے مکانوں میں رہنے والے اگر خوشنما، روشن، ہوادار، جدید وضع کے آرام دہ مکان بنانے کے لئے اتنا قرض لیں جسکے بار کی متحمل اُن کی آمدنی ہوسکے تو یہ قرضہ کسی صورت میں اعلیٰ معیاری زندگی کے خلاف نہوگا۔ دانشمندی ومعاملہ فہمی کی تلقین کرنیوالے معیار زندگی ہی کا یہ تقاضہ ہے کہ انسان ایسے محلوں کو چھوڑکر جوکہ دار المرض ودار الوباء ہو

ایسی پہاڑیوں میں جا بسے جہاں امراض اور وباؤں سے نجات ہوجاتی ہے وہاں مکانات بنانے کے لئے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے!!!

برخلاف اسکے اگر یہی رقم فضول پر صرف کرنے یا آرائش و زینت مکان کے لئے بطور قرض لیجائے تو یہ اعلیٰ معیار کی زندگی کے اصول کے سراسر منافی ہوگا کیونکہ مسلمات معاشیات سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ قرض لینا فی نفسہ نہ اچھا ہے نہ برا کیونکہ قرض کی غرض و غایت ہی قرض کو اچھا یا برا بناتی ہے۔

پس اندازی اور مسئلہ معیار زندگی

جدید اصول معاشیات و عمرانیات نے اگر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرض کی لین دین فی نفسہ بری نہیں تو کیا یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ قرض لینے کی نوبت ہی کیوں آنے پائے اور انسان شروع ہی سے پس اندازی کیوں نہ کرے تاکہ وقت پر خرچ کرسکے اور اسطرح قرض کی "نحوست" اور سود کے بار سے بچے؟

یہ بیشک درست ہے کہ انسان کو پس انداز کرنا چاہئیے مگر پس اندازی کا وہی طریقہ لائق تحسین ہے جس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے واقعہ یہ ہے کہ پس اندازی کے دو طریقے ہیں جنکو ہم پیدا آور اور غیر پیدا آور پس اندازی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

جب بچت سے انسان کو کسی قسم کا مزید فائدہ نہو یعنے یہ کہ پس انداز کی ہوئی رقم سے انسان کو مزید آمدنی حاصل نہوتی ہو تو اس قسم کی بچت کو غیر پیدا آور بچت اور اس طریق کو غیر پیدا آور طریق پس اندازی کہتے ہیں غیر ترقی یافتہ ممالک میں غیر پیدا آور طریق پس اندازی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں اندوختوں کو گھروں میں بیکار رکھنا، دفینوں کی شکل میں زر زیور پڑا رہنے دینا، دور از کار کاموں (مثلاً پاندان کھانے کے برتن، چاء کے سیٹ، بھدے زیور، پلنگ کے پائے، اگالدان کے بنانے کے لئے) سونے چاندی کا استعمال کرنا۔

برخلاف اس کے بچت سے جب فائدہ ہوتا ہے یعنے یہ کہ پس انداز کی ہوئی رقم سے مزید آمدنی بھی حاصل

ہوتی ہے تو ہم اس قسم کی بچت کو پیدا آور اور اس طریق کو پیدا آور طریق پس اندازی کہتے ہیں۔ بیمہ کے مختلف النوع طریقے بھی پیدا آور پس اندازی میں شمار کئے جاتے ہیں۔

بیمہ کا تعلق معیار زندگی سے بہت قریبی ہے۔ یورپ و امریکہ میں بیمہ کے جتنے طریقے رائج ہیں وہ سب نہایت ضروری اور اُن کی اعلیٰ معیار زندگی کا ثبوت ہیں۔ لڑکے، لڑکیوں کی پرورش کے لئے، نوجوان فرزندوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے نوجوان لڑکیوں کے جہیز کے لئے، بیمہ کرانے کے طریقے ترقی یافتہ ممالک میں عرصہ سے رائج ہیں اور تیز رفتار سے عام ہوتے جارہے ہیں۔ جان و مال کے بیمہ کے علاوہ صحت کی حفاظت بھی بہت لازمی ہے۔ ہندوستان میں خاص طور پر بیماریوں اور وباؤں کی کثرت کیوجہ سے جو پریشانیاں اُٹھانی پڑتی ہیں وہ سب اسی نادانی کا نتیجہ ہے کہ ہم قبل از وقت معالجہ وادویات کے لئے کچھ رقم پس انداز نہیں کرتے۔ اب اگر پس اندازی کی یہ صورت اختیار کیجائے کہ گھروں میں دفینوں یا زیور کی شکل میں دولت محفوظ رکھی جائے تو یہ طریقہ ہمارے اُصول کے سراسر خلاف ہوگا کیونکہ عمرانیات وسعاشیات غیر پیدا آور پس اندازی کے خلاف ہیں لہٰذا اس کے لئے بھی وہی تجویز اختیار کرنی چاہیئے جو جرمانیہ میں اختیار کی گئی ہے اور جو تجربہ سے درست ثابت ہوئی ہے۔ یہ طریقہ صحت کے بیمہ کا ہے جسے ( ) کرامکن کاسے ( ) کہتے ہیں۔ اس کے مطابق ہر شخص کو جو اپنی اور اپنے خاندان کی صحت کا بیمہ کراتا ہے تھوڑی سی رقم ہر ماہ ( ) میں داخل کرنی پڑتی ہے اور جب کبھی وہ یا اسکے خاندان کا کوئی فرد بیمار پڑے تو اسکا علاج مفت کیا جائے اور ڈاکٹر کو بھی کوئی فیس نہیں دینی پڑتی۔

اسی طرح معتبر بنکوں میں یا ڈاک خانوں کے سیونگ بنک میں پیسہ رکھنا، قابل اعتبار کمپنیوں کے حصے خریدنا، سرکار کو قرض دینا، پیدا آور پس اندازی کے مختلف طریقے ہیں۔ اعلیٰ معیار زندگی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ ہم کسقدر پیدا آور پس اندازی کرتے ہیں۔

بہر طور اعلیٰ معیار زندگی پس اندازی کی ضرور تلقین کرتا ہے مگر غیر پیدا آور پس اندازی کی نہیں بلکہ نفع بخش

بحث کی اور ساتھ ہی یہ شرط عائد کرتا ہے کہ پس اندازی کی غرض وغائت عقلیت و افادیت کے مطابق ہو۔

جس طرح قرض کی غرض وغائت قرض کو اچھا یا برا بناتی ہے اسیطرح پس اندازی کی غرض وغائت بھی پس اندازی کو اچھا یا برا بناتی ہے۔ جدید عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب پس اندازی کی خاطر پس اندازی کرنا، خواہ مخواہ دولت اکھٹی کرنا، بلا وجہ پیسہ جمع کرنا بیسود ہے۔ پس اندازی کی بھی کوئی غرض وغائت ہونی چاہیئے اور اُسکے اچھے یا برے ہونے سے معیار زندگی کے اعلیٰ یا ادنی ہونیکا ثبوت ملتا ہے۔

ایسی پس اندازی سے کیا فائدہ کہ انسان برسوں جوڑتا رہے اور جمع شدہ مال وزر سے اُسے کوئی فیض نہ پہنچے اور بیوی بچے مصیبت میں رہیں اسی طرح وہ پس اندازی بھی بیکار ہے کہ تھوڑا تھوڑا کرکے جمع ہوا اور پھر کسی بیاہ شادی کی تقریب میں بیکار رسوم پر لٹا دیا جائے لٹانے کی خاطر پیسہ بچانا ایسے ہی فضول ہے جیسے کمانا اور کماتے ہی لٹانا۔[1]

الغرض عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب اعلیٰ معیار زندگی کا ثبوت اسیوقت ملتا ہے جبکہ دولت کسی عمدہ غرض وغائت کے لئے پیدا اور پس انداز کی جائے۔ خواہ مخواہ پس اندازی کرنے کی تلقین عمرانیات نہیں کرتی کیونکہ بلا وجہ کفایت شعاری اور بے موقع قناعت پسندی معاشی جد وجہد کی سد راہ ہیں اور قومی ترقی کے لئے نئی ایجادات واختراعات کے لئے نئے کارخانوں اور نئے کاروبار کے لئے سم قاتل کا کام کرتی ہیں اسلیئے اعلیٰ معیار زندگی کا یہ تقاضہ ہے کہ

---

[1] اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا جو ایک معزز گھرانے سے متعلق ہے۔ بزرگ خاندان کی اہلیہ محترمہ ایام روزگار کی شکایت کر رہی تھیں کہ شوہر نے، بیٹوں نے اور دامادوں نے گھر ۔ ب بٹا دیا اور اب کہ اُن کے نواسہ کی سلمانی ہوئی ہے، محلہ والوں اور خاندان والوں کی دعوت کرنے کے لئے ان کے ہاں کچھ بھی نہیں ۔ جب انہیں سمجھایا گیا کہ یہ بھی تو آخر فضول خرچی ہے اسر سلمانی کی تقریب میں آپ بیکار پیسہ لٹائیں تو انہوں نے بکمال متانت وسنجیدگی یہ جواب دیا۔ "واہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم اپنے ارمان نہ نکالیں اور پوتوں اور نواسوں کی خوشی نہ کریں!" یہ بھلا اُنکی کس طرح سمجھ میں آتا کہ دوسروں نے اپنے دل کے ارمان نکالے ہیں تب ہی تو آپ کو یہ موقع نہیں کہ اپنے دل کی خوشی کریں اور اگر دل کے ارمان نکالنے کے لئے روپیہ پیسہ ہوتا ہے تو اگر آپ سے قبل ہی دوسروں نے روپیہ پیسہ اپنے ارمانوں میں ختم کر دیا تو کیا برا کیا۔

جس رفتار سے ہماری آمدنی میں اضافہ ہوتا جائے اسی رفتار سے ہماری احتیاجات بھی بڑھتی جائیں اور بیمہ فنڈ اور پیداآور پس اندازی کی رقم کو علحدہ کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ خرچ کردی جائے کیونکہ احتیاجات کو بڑھانا بھی اعلیٰ معیار زندگی کی ایک نشانی ہے۔

اضافہ احتیاجات اور مسئلہ معیار زندگی

معیار زندگی کے متعلق معاشیات وعمرانیات کی یہ تلقین ہے کہ ہر شخص کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ حتی المقدور اپنی احتیاجات میں اضافہ کرے اور ان احتیاجات کو پورا کرنے کی ذاتی طور پر ایمانداری سے کوشش کرے کیونکہ بقدر ہم اپنی احتیاجات میں اضافہ کرینگے اسیقدر بیوپار میں ترقی ہوگی، نئے کارخانوں کے قیام کا موقع آئیگا، پرانے کارخانوں کو وسعت دیجاسکیگی، نئے نئے پیشے جاری ہونگے، بیکار لوگ برسرکار ہونگے، تعلیم یافتہ اور ہنرمند آدمیوں کو (جو آج بیکاری کیوجہ سے بے سروسامان پھر رہے ہیں) نوکریاں ملینگیں، مزدوروں اور کسانوں کی زائد آبادی[1] کی کھپت کا موقع ملیگا۔

اسی لئے جرمانیہ کے ایک قابل محقق معاشیات، فرڈینلنڈ لزال ( ) نے کہا ہے کہ "انتہائے قناعت پسندی ہندوستانی سنیاسیوں اور عیسائی درویشوں کی نگاہ میں وصف ہو تو ہو مگر معاشیات اسکی تلقین نہیں کرتی۔ کسی قوم کیلئے بدترین بدبختی کیا ہے؟ یہی کہ اسکی احتیاجات بہت کم ہوں۔ کیونکہ احساس احتیاجات معاشی جد وجہد کے لئے ضروری اور ترقی کا اصلی منبع ہے۔ زیادہ سے زیادہ احتیاجات

---

[1] یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ زراعت پر بالخصوص ہندوستان اور دیگر ایشیائی ممالک میں بیحد بار پڑرہا ہے۔ یعنے یہ کہ موجودہ زراعت کے معاشی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پیشہ میں بہت لوگ مصروف ہیں اور جس رفتار سے وہی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اسکا بار کیسطرح صرف زراعت نہیں برداشت کرسکتی۔ ر د زا فسرد ن آبادی کی کھپت کی صورت سوائے صنعت وحرفت کو فروغ دینے کے یا اُن کے لئے نئے نئے پیشے جاری کرنے کے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

محسوس کرنا اور ساتھ ہی انہیں ایمانداری اور صحیح طریقوں پر پورا کرنے کی کوشش کرنا موجودہ معاشی عہدہ میں وصف تصور کیا جاتا ہے۔[۱]

یہ اسی لئے کہ جسقدر ہم اپنی احتیاجات میں اضافہ کرینگے اسیقدر کاروبار کو ترقی ہوگی، کارخانوں اور پیشہ وروں کو فروغ کا موقع ملیگا، ملک مرفہ الحال ہوگا، بیکاری مٹیگی، سب برسرکار ہونگے، طفیلی (کم ہوتے ہوتے مفقود ہوجائینگے، کنبہ پروری (جو ہندوستان میں اکثر کماؤ پوت کے لئے سدراہ ہوتی ہے) کی ضرورت باقی نہ رہیگی، ہم پر دوسروں کا بار نہ رہیگا۔ ہر شخص اور اس کی اولاد کے لئے مختلف شاہراہ ترقی نظر آئینگی، اور سوائے غیر محنتیوں، سُستوں، اپاہجوں اور مخبوط الحواس لوگوں کے ہر ایک کو زندگی کا سہارا ملیگا، قوم ترقی کریگی، ملک مرفہ الحال ہوگا، بین الاقوامی بہبودی میں اضافہ ہوگا، اور موجودہ عہد کی سب سے بڑی نحوست، جو طاعون اور ہیضہ، جنگ اور فساد سے زیادہ نقصان دہ ہے یعنے بیکاری دور ہوگی ہر محنتی شخص خوشحال ہوگا، انسان خود چین اور راحت کی زندگی بسر کرسکیگا اور دوسروں کے لئے چین وراحت کے اسباب فراہم کریگا۔

اضافہ احتیاجات اور اعلٰی معیار زندگی۔ جس کلیہ کو ہم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنی احتیاجات میں اضافہ کرنا بھی اعلٰی معیار زندگی کا تقاضہ ہے اور احتیاجات میں اضافہ کرنے سے عام خوشحالی و مرفہ الحالی بھی بڑھتی ہے بشرطیکہ ان احتیاجات کو پورا کرنے کے لئے انسان ایمانداری سے ذاتی طور پر کوشش کرے۔

دیگر ممالک کیطرح بلکہ انسے بھی بہت زیادہ شدت و وسعت سے بے روزگاری کی شکایت ہندوستان موجود ہے۔ اس شکایت کے دور کرنے کے جہاں اور طریقے ہیں وہاں سب سے زیادہ اہم یہ اصول ہے کہ معیار زندگی بلند کیا جائے، لوگ اپنی احتیاجات بڑھائیں، زیادہ چیزیں خریدیں، زیادہ چیزیں استعمال کریں، بہتر طریقے پر رہیں، آرام وہ زندگی بسر کریں، جسمانی راحت کے اسباب فراہم کریں، علم و جمالیت (

[۱] دیکھئے Reden von Ferdinand Lassalle مطبوعہ Naur Denloecher Verlog بمقام برلن سنہ ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۲

کے لئے شوق پیدا کریں تا کہ تجارت کو فروغ ہو، پیدائش دولت کی لوگوں کو ترغیب ہو، پیدا شدہ مال کی نکاسی میں آسانیاں ہوں، کسانوں، صناعوں، تاجروں اور مزدوروں کی اوسط آمدنی میں اضافہ ہو اور یہ لوگ بھی مرفہ الحال ہوں کیا یہ ممکن نہیں ہے؟۔

اعلیٰ معیار زندگی اور امداد باہمی۔ بین الاقوامی معاشی عالم میں ایک دوسرے کی باہمی امداد پر جس طرح ذاتی فلاح و بہبودی کا دارومدار ہے اسی طرح قومی معاشی جد وجہد میں دوسروں کی ترقی اور غیروں کی مرفہ الحالی پر ذاتی خوشحالی کا انحصار ہے امداد باہمی کے جو آثار نمودار ہو رہے ہیں اس سے یہ حقیقت بتدریج لوگوں پر آشکار ہوتی جاتی ہے کہ ہماری ترقی اور خوشحالی کا راز دوسروں کی ترقی و خوشحالی میں مضمر ہے۔ (Live and let live) خود زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو ہمارے زمانہ کا نصب العین ہونا چاہیئے کیونکہ یہ وہی درخشاں ستارہ ہے جو ہم راہ رووں کو منزل مقصود پر پہنچائیگا اور ہمیں گمراہی سے بچائیگا۔

جس طرح ملک میں وباؤں کے پھیلنے سے قوم کی صحت خراب ہوتی ہے اور قوم کی جان و مال کا نقصان ہوتا ہے، جس طرح شہر میں طاعون وہیضہ کے ظاہر ہونیسے ہر شہری کی جان خطرہ میں آتی ہے اسیطرح ملک کی غربت اور شہر کے افلاس سے ہر باشندہ کو افلاس کا خطرہ لگ جاتا ہے جس طرح محلہ کے پاک وصاف رہنے سے محلہ کے ہر فرد کی وبا سے حفاظت ہوتی ہے۔ اسیطرح دوسروں کی مرفہ الحالی سے ذاتی خوشحالی کی بھی توقع ہوتی ہے۔

مسئلہ معیار ہائے زندگی پر ذی شعور انسان جس قدر زیادہ غور کرتے ہیں یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہوتی ہے کہ ذاتی فلاح کی امید اور انفرادی ترقی کی توقع اسیوقت صحیح طور پر کیجا سکتی ہے جبکہ ہم دوسروں کی فلاح و ترقی کے ذرائع فراہم کریں۔ اس خیال کی تائید میں کہ ہماری فلاح و بہبودی کا راز دوسروں کی فلاح و بہبودی میں مضمر ہے ہم کثرت مثالیں تاریخی اور عہد حاضرہ کی پیش کر سکتے ہیں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ ہندوستان میں سینکڑوں بلکہ ہزارہا آدمی ایسے ہیں جنکی آمدنی اچھی خاصی ہے۔ اور جو اچھی طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ مگر اس قدیم عادت اور پس اندازی کے غلط اصول پر عمل کر کے یہ لوگ خرچ کرنا

پسند نہیں کرتے اپنی احتیاجات کو خواہ مخواہ کم کرتے ہیں، معمولی دال چپاتی موٹے کپڑے، چھوٹا مکان اور اسی طرح کی چند لابدی ضروریات پر اکتفا کرتے ہیں اور اپنی آمدنی کا صرف چوتھائی بلکہ دسواں حصہ ہی خرچ کرتے ہیں اور باقی بچت کو سونے چاندی کی شکل میں محفوظ رکھتے ہیں۔

معاشی حالات حاضرہ سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں ہر سال لاکھوں روپیہ کی قیمت کا سونا چاندی جو بیرونی ممالک سے آتا ہے یا ہندوستانی کانوں سے دستیاب ہوتا ہے "لاپتہ" ہوجاتا ہے تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہندوستانیوں میں اب تک دفینوں اور زیورات کی شکل میں سونا چاندی گھروں میں چھپا کے رکھنے کی بدعادت کسی طرح کم نہیں ہوئی۔

ہندوستان ہی میں زیادہ تر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنی آمدنی کی حیثیت سے خرچ نہیں کرتے مثل اور امور کے ہندوستان کی خرچ اور بچت کے معاملہ میں بھی انتہائیت کی طرف مائل ہیں۔ ایک طرف مسرفوں اور لیٹروں کی کثرت ہے تو دوسری طرف کنجوسوں، زر پرستوں، زیور پسندوں کی بہتات ہے اور ان دونوں کا وجود قوم وملت کے حق میں یکساں مضر ہے۔ مسرف اور زر پرست دونوں سے قوم کی معاشی حالت کو یکساں نقصان پہنچتا ہے منجملہ اور وجوہ کے ہندوستان کی انتہائی غربت میں اسراف اور زر پرستی جیسی متضاد خصوصیتیں بھی داخل ہیں اور جیسا کہ ہم نے معیار زندگی کے مفہوم کی تشریح میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اسراف اور زر پرستی دونوں اعلیٰ معیار زندگی کے اصول کے منافی ہیں۔

بالعموم ہندوستانیوں کے ادنیٰ معیار زندگی کا اس سے زیادہ واضح ثبوت اور کیا ملیگا کہ ہم ایک طرف ان مسرفوں کو پاتے ہیں جو گھر پھونک کر نمایش دیکھتے ہیں، شادی بیاہ کی فضول رسوم میں ہزاروں روپیہ بیدریغ لٹاتے ہیں اور دوسرے طرف ایسے لکھ پتیوں کو بھی دیکھتے ہیں جو نہ میوہ کھاتے ہیں نہ عمدہ پوشاک پہنتے ہیں جو نہ عمدہ سواریاں رکھتے ہیں نہ گھر کی صفائی کراتے ہیں بلکہ ادنیٰ ترین غذا کھا کر اور میلے کچیلے کپڑے پہنکر غلیظ گندے مکانوں میں آیا سودخوار و نکی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں، نہ وہ کتابیں خریدتے ہیں نہ رسائل پڑھتے ہیں، نہ سیر و

تفریح کرتے ہیں، نہ آرائش و آسائش کی چیزیں خریدتے ہیں۔

یورپ و امریکہ میں لاکھوں آدمی ایسے ہیں جو محض انشا پردازی، شاعری، مقالہ نویسی، قصہ بیانی، ڈرامہ نویسی اور صحافت کے ذریعہ گذر اوقات کرتے ہیں اور ان میں سے ہزاروں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جو ہمارے یہاں کے سرکاری عہدہ داروں کو بھی نصیب نہیں۔ کئی نفوس تو محض اپنی کتابوں کیوجہ سے یا اخبارات جاری کرکے لکھ پتی ہو گئے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ عوام جاہل و غافل نہیں اور قوم کا معیار زندگی ادنیٰ نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ دوسروں کی مرفہ الحالی ہماری مرفہ الحالی کی ضامن ہے۔ وہ بلا وجہ احتیاجات کم کرکے کتب خریدنے سے دریغ نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب ہم دوسروں کی چیزیں خریدینگے تو دوسرے بھی ہماری چیزیں خرید سکینگے پانی میں جبتک بہاؤ رہتا ہے پانی پاک و صاف رہتا ہے اور پانی میں ٹھیراؤ ہونے سے وہ بدبودار اور نقصان دہ ہوجاتا ہے تقریباً یہی حال روپیہ پیسہ اور سونے چاندی کا ہے، ایک ہموار رفتار سے روپیہ پیسہ کو بھی قوم کے معاشی جسم میں گردش کرتے رہنا چاہیئے یعنے یہ کہ قوم کے ہر فرد کا یہ فریضہ ہونا چاہیئے کہ اپنی احتیاجات کو (جہانتک اس کی آمدنی گوارا کرے) بڑھائے۔

اگر بچت کا خبط اور پس اندازی کی دھن ہم لوگوں کی طرح انگریزوں، جرمنوں اور امریکوں کو بھی ہوتی تو یہ اقوام بھی کبھی ترقی نہ کرسکتیں اگر وہاں بھی "بچت اور کفایت شعاری" کی غرض سے ہر شخص یہی خیال کرتا کہ "کتابیں اور اخبار اور رسائل خریدنے سے کیا فائدہ ایسی کوئی ضرورت ہوگی تو کسی سے مانگ لائینگے یا کسی کتب خانہ میں دیکھ آئینگے" تو آج یہ علم پرور علم دوست تحقیق پسند طبقہ یورپ و امریکہ میں اسی طرح کس مپرسی کی وجہ سے معاشی تنگ دستی اور فقر و فاقے میں گذر کرتا جیساکہ ہندوستان کا علمی طبقہ (بجز ان صورتوں کے جبکہ سرکار سے امداد ملتی ہو) غربت و ناداری میں گذر کر رہا ہے۔ ہمارے ادنیٰ معیار زندگی کی وجہ سے خواہ مخواہ احتیاجات کو کم کرنے کی وجہ سے اور بلا وجہ پس اندازی کرنے کی وجہ سے ہندوستان کے شریف و معزز پیشے والے ترقی نہیں کرسکتے برخلاف اس کے یورپ و امریکہ میں جو لوگ صحافت و انشا پردازی کے ذریعہ لاکھوں روپیہ کماتے ہیں اتنا ہی خرچ بھی کرتے ہیں اور ان کے دم قدم سے صنعت و حرفت کو ترقی ہوتی ہے، تجار کو فائدہ ہوتا ہے، ہوٹل والوں اور گھر والوں کو آمدنی وصول ہوتی ہے غرضکہ

یہی طبقہ ہے جسے ہزار ہا لوگ پاتے ہیں اور جو خود ہزار ہا لوگوں کو پالتا ہے۔ ہم لوگوں کا معیار زندگی بھی مثل انگریزوں اور جرمنوں کے بلند ہوتا تو آج نہ اقبال کو وکالت کرنے کی ضرورت ہوتی نہ اُردو کے بہترین انشا پردازوں کو سرکاری نوکریوں کی ضرورت ہوتی اور نہ راشد الخیری کی مالی حالت اس قدر گری ہوئی ہوتی وہ اپنی پوری طاقت علم وادب کی خدمت میں صرف کرسکتے جس سے ہمارے ادب کی ترقی کی رفتار بھی تیز تر ہو جاتی۔

خیال تو کیجئے کہ ملک میں کتنے ایسے انشا پرداز اور شاعر ہیں جو انشا پردازی اور شاعری کیوجہ سے اچھی خاصی کمائی حاصل کرتے ہوں اور جنکی زندگی کا سہارا صرف تصنیف و تالیف ہو؟ یہاں کے علم دوست حضرات وقت اور مال کی قربانیاں کرتے ہوئے تحقیق میں مصروف ہیں اور انہیں کسی قسم کے صلہ کی توقع نہیں۔ شعرا قصیدے اور اور تاریخیں لکھکر اخبارات گورنمنٹ سے، معزز خریداروں سے، والیان شہر سے، امرا، درو بار سے خیراتی چندے لیکر بُرے بھلے طریقہ پر گذر اوقات کرنے پر مجبور ہیں۔ برخلاف یہاں کے یورپ و امریکہ میں دیکھئے کہ سرکار اور امرا، کی سرپرستی سے نہیں بلکہ پبلک کی قدردانی کیوجہ سے کتنے انشا پرداز فارغ البالی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عریاں فحش قصے لکھنے والے ناول نویس نہیں بلکہ برنا ؤ شا اور ایچ لُدوِش ( ) جیسے بہترین ادیبوں کی لوگ قدر کرتے ہیں اور اُن کی کتابیں خریدتے ہیں جیسے لوگوں نے ان کی قدر کی وہ اوروں کی قدر کرتے ہیں، مصوروں سے تصویریں بنواتے ہیں، نمائشوں کی سیر کرتے ہیں، ہمہ قسم کا سامان خریدتے ہیں غرض یہ کہ خود جیتے ہیں اور دوسروں کو جینے کا موقع دیتے ہیں۔

معیار آرام اور معیار زندگی۔ علم مرفہ الحالی اور معاشیات عملی کا یہ منشا نہیں کہ ترقی ایک مخصوص طبقہ تک ہی محدود رہے چند لوگ لکھ پتی اور کروڑ پتی ہو جائیں، ایک محدود التعداد جماعت متوسط الحال لوگوں کی ہو اور بقیہ پریشان حال رہیں جنکی زندگی پریشانیوں اور مصیبتوں سے گذرے علوم معاشیات و عمرانیات یہ چاہتے ہیں کہ تمام طبقہ ہائے قوم کی معاشی و عمرانی زندگی ایک ترقی آمیز ارتقا ہو اور بقول پروفیسر بریکمان " نہ صرف دولت میں اضافہ ہو بلکہ انسان من حیثیت الانسان ترقی کرے "

مسرفین کیوجہ سے اگر عیاشی بڑھ رہی ہے، اور شراب نوشی اور لہو و لعب میں اضافہ ہو رہا ہے تو زر پرستوں کی وجہ سے ملک کا کاروبار ترقی نہیں کرنے پاتا۔ اس قسم کے ہزاروں آدمی ہندوستان میں موجود ہیں جو ادنیٰ معیار کی تکلیف دہ و بے چین زندگی بسر کر رہے ہیں اور اگرچہ وہ ہزاروں روپیہ کے مالک ہوتے ہیں مگر زندگی اس طرح گذارتے ہیں گویا وہ پیسہ پیسہ کو محتاج ہیں۔ انکی لاکھوں روپیہ کی دولت اُن کے لیئے ایک نحوست ہے اور ان کی سینکڑوں روپیہ کی آمدنی سے دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

وہی الفرڈ مارشل جس نے کہا تھا کہ اعلیٰ معیار زندگی کے لیئے ایسی غذاؤں اور شراب کا ترک کرنا اور ایسے عادات زندگی کو چھوڑنا ضروری ہے جنسے صرف نفس کو حظ حاصل ہوتا ہے مگر طاقت و توانائی گھٹتی ہے اور جسمانی و اخلاقی صحت کے لیئے مضر ہیں سادی درویشانہ زندگی کی تلقین نہیں کرتا بلکہ آرام دہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرتا ہے اگرچہ وہ عیش و عشرت کا قائل نہیں چنانچہ پروفیسر مارشل نے صاف صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ "معیار آرام میں اضافہ کرنے سے یقیناً ایک حد تک معیار زندگی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور جب عام آبادی کے معیار زندگی میں اضافہ ہوگا تو قوم کی اوسط آمدنی بھی بڑھیگی"[1]

قوم کی اوسط آمدنی میں جب اضافہ ہوگا تو اس سے فروخت اشیار میں بھی زیادتی ہوگی اور جب زیادہ چیزیں استعمال میں آئینگی "پیدائش دولت میں بھی اضافہ ہوگا یعنے زیادہ کارخانہ قائم ہونگے، نئے نئے پیشے کامیاب ثابت ہونگے زیادہ مزدور برسر کار ہونگے جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ بھی جو ابتک بیکاری کے باعث تنگدستی اور فاقہ کشی میں زندگی بسر کرتے تھے اب کمانے لگینگے انکی قوت خرید کے بڑھنے سے اور زیادہ اشیار کی مانگ ہوگی[2]

---

[1] اصل عبارت کے لئے دیکھئے THE PRINCIPLES OF ECNOMICS مطبوعہ MACMILLAN لندن ۱۸۹۱ء صفحہ ۱۳۷۔

[2] اشیار کی مانگ بڑھنے سے قیمتوں میں اضافہ ہونیکا مطلق اندیشہ نہیں کیونکہ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ چیزوں کی رسد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور یہ معاشیات نظری کا مسلمہ کلیہ ہے کہ "جب چیزوں کی طلب و رسد میں ساتھ ساتھ بتدریج ایک ہی رفتار سے اضافہ ہوتا ہے تو قیمتیں وہی رہتی ہیں"

جس کی بنا پر کارخانوں کو مزید وسعت دیجا سکیگی، پست کاروبار کے بجائے خرید و فروخت میں چہل پہل نظر آئیگی افراد کی حالت سنبھلیگی اور قوم مرفہ الحال ہوگی انسان خود پنپیگا اور دوسروں کو عمدہ زندگی گذارنے کا موقع دیگا۔

انہیں حالات کا بغور مطالعہ کرنیسے مختلف علماء و ماہرین معاشیات ہند نے ہندوستان کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کو معاشی ترقی کے غیر محدود امکانات حاصل ہیں[۵]

غرضکہ اعلیٰ معیار زندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان زیادہ چین اور آرام سے زندگی بسر کرے، اسے زیادہ لمحات ہنسی و مسرت نصیب ہوں، وہ سکھی ہو کر جیئے اور اس کی طرز زندگی میں تہذیب و شائستگی، صفائی اور خوبصورتی نظر آئے۔

اختتام

اس مضمون کو پڑھنے سے جو عام اصول و نظریے مترشح ہوتے ہیں وہ سہولت تفہیم کے لئے پیشکش ناظرین کئے جاتے ہیں۔

(۱) جس قدر زیادہ ہمارے عادات و افعال، خیالات اور احساسات پر وجدان کا نہیں بلکہ عقل کا، دل کا نہیں بلکہ دماغ کا تسلط ہوگا ہمارا معیار زندگی بلند ہوگا۔

(۲) جس قدر زیادہ ہماری روزانہ طرز زندگی میں تنظیم نظر آئیگی اسیقدر ہمارا معیار زندگی بلند ہوگا۔

(۳) جس قدر ہم فضول خرچی کم کرینگے اور پیداوار اور مہذب اغراض کے لئے اپنی آمدنی صرف کرینگے اسیقدر ہمارا معیار زندگی بلند تر ہوتا جائیگا۔

---

[۵] تفصیل کے لئے دیکھئے۔

(۴) "معیار زندگی کا انحصار تعیشات پر نہیں ہوتا بلکہ ضروریات زندگی پر ضروریات زندگی کو معینہ آمدنی کے حدود میں بہترین طریقہ پر مہیا کرنا معیار زندگی کو اونچا کرتا ہے" (ماخوذ از رسالہ "خرچ و بچت" مصنفہ احمد محی الدین صاحب)

(۵) سنیاسیوں کی سی زندگی بسر کرنا اور بلا وجہ احتیاجات کم کرنا اپنی خواہشوں کو مارنا اور نفس کشی کرنا اعلیٰ معیار زندگی کا تقاضہ نہیں۔

(۶) معیار زندگی کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم جس قدر زیادہ ہو سکے اپنی احتیاجات میں اضافہ کریں مگر ان احتیاجات کو پورا کرنے کے لئے خود ایمانداری سے محنت کریں" (فرڈیننڈ لزال)

(۷) معیار آرام میں اضافہ کرنا معیار زندگی کو بلند کرتا ہے" (الفریڈ مارشل)

(۸) نہ لٹاؤ نہ بچاؤ بلکہ دانشمندی سے صرف کرو۔

(۹) پس اندازی صرف اسی صورت میں صحیح ہے جبکہ ہم صرف کرنے کی خاطر پس انداز کریں۔ اجتماع زر کی خاطر پس انداز کرنا اپنے معیار آرام کو پست کرنا ہے۔

(۱۰) پس انداز نہ کرنے پر افسوس اسیوقت ہوتا ہے جبکہ انسان نے بیجا طور پر خرچ کیا ہو۔ صحیح طریقوں پر صرف کرنے سے اور خود کی جان وصحت کا بیمہ کرانے سے اور اولاد کے لئے تعلیمی بیمہ پالیسی لینے سے پس اندازی کی ضرورت بڑی حد تک گھٹ جاتی ہے۔ انسان کو ہر وقت یہ اطمینان رہتا ہے کہ اس کی ناگہانی موت سے اس کی بیوی بچوں پر کوئی مالی مصیبت نہیں آئیگی۔ سب کو رزق ملتا رہیگا۔ لڑکوں کے اعلیٰ تعلیم کے لئے اور لڑکیوں کی جہیز کے لئے بیمہ کمپنی ہر وقت انتظام کریگی۔ بیوی بچے نہ بھوکوں مرینگے نہ دوسروں پر بار بنکر طفیلی اور محتاجی زندگی گذارنے پر مجبور ہونگے۔ اس عاقبت اندیشی اور دوراندیشی کی تعلیم اعلیٰ معیار زندگی دیتا ہے اور ان اصول پر عمل کرنے سے پس اندازی کی ضرورت ہی بہت کم رہتی ہے"

(۱۱) قوم جس قدر زیادہ خرچ کریگی اسیقدر زیادہ پیشے ترقی کرینگے ہر شخص کو چاہیئے کہ دوسرونکے نفع کا بھی خیال کرے۔ دوسروں کو نقصان پہنچانا اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہے۔

(۱۲) ہر دوکاندار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی دوکان سے زیادہ سے زیادہ مال فروخت ہو تاکہ اسے منافع زیادہ ملے۔ اسکی یہ خواہش اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جبکہ اس کے گاہکوں کی مالی حالت بہتر ہوتی جائے، جس طرح دوکاندار کی ترقی کا دارومدار اس کے گاہکوں کی ترقی پر ہے اسیطرح ہر طبقہ و پیشہ کی ترقی کا دارومدار دوسرے طبقوں اور پیشوں کی ترقی پر ہے۔

(۱۳) "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" یہ قول صحیح اصول زندگی پر بھی کلیۃً عائد ہوتا ہے۔ پیسہ بیکار جمع کرنا، ضرورت سے زیادہ زیورات بنانا دوسروں کے ذرائع آمدنی کو مسدود کرنا گویا ان کی مرفہ الحالی تباہ کرنا ہے جب دوسرے تباہ ہوجائیں تو پھر ہماری تباہی میں کیا دیر لگتی ہے؟

(۱۴) لٹانے کے خاطر پیسہ بچانا ایسے ہی فضول ہے جیسے کمانا اور کماتے ہی لٹانا۔

(۱۵) پیدا آور اغراض کے لئے قرض لینا اور پیدا آور اغراض کے لیے پس اندازی کرنا درست ہے۔

(۱۶) بیشترین مصارف کا معیار زندگی لازماً بہترین نہیں ہوتا مصارف کی کمی و بیشی میں اور معیار زندگی کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہوتے ہیں کوئی مقررہ و معینہ نسبت نہیں۔

(۱۷) اعلیٰ ترین معیار کی زندگی وہ جس میں کسیقدر پیدا آور پس اندازی سے صرف آمدنی ہی صرف ہوتی ہو اور ہر احتیاج اپنی اپنی اہمیت کے مطابق دانشمندی سے افادیت و جمالیاتی مذاق صحیح کو ملحوظ رکھتے ہوئے پوری کیجاتی ہو۔

چاندنی رات

از
جناب میر حسن الدین صاحب بی۔ اے۔ ال۔ بی (عثمانیہ)

منظر یہ آسماں کا کیا جاذب نظر ہے
ظلمت کدہ میں شب کے ہنگامۂ سحر ہے

اے ماہ! یہ بھی تیرا اعجاز دلکشی ہے
موجوں میں بے کلی ہے تاروں میں خامشی ہے

عکس قمر سے دریا ہم رنگ آسماں ہے
گویا رواں زمیں پر انجم کا کارواں ہے

گرما رہی ہے دل کو تاثیر چاندنی کی
سینہ میں دوڑتی ہے اک لہر زندگی کی

اس ٹھنڈی روشنی میں اک کیف بیخودی ہے
جسکے اثر سے فطرت بے ہوش ہوگئی ہے

دلکش ہے گو شب سہ پر یاس آفریں ہے
حال دل حزیں کو یاں بھی سکوں نہیں ہے

اس جنت نظر میں دل محو اشکباری
اضداد پر ہے قائم یہ زندگی ہماری

تاروں کی انجمن میں حرکت بھی ہے سکوں بھی
شاعر کے ذہن میں ہے کچھ عقل بھی جنوں بھی

جاگتی جوت

از جناب مولوی نظام شاہ صاحب لبیب تیموری دہلوی

یہ نظم یوم جشن یوم کلیہ سنہ [illegible] ف کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی

نہ جانے کیا خواب تھا، جو دیکھا، بدیدۂ نیم خواب تو نے ۔۔۔ کہ جو نکلتے ہی کھلیں جو آنکھیں تو ڈال لی جھٹ نقاب تو نے

نہ گدگدا اور ولولوں کو، نہ چھیڑ سوتی ہوئی حسوں کو ۔۔۔ کہ سارے عالم میں ڈال رکھی ہے لرزش پیچ و تاب تو نے

وہ کون ہے، اے بہار ہستی! جو تیرا دمساز و ہم نشیں ہو ۔۔۔ حسین پیدا کیا تو ہوتا، کوئی بھی اپنا جواب تو نے

نہ کر کسی ہم نشین کی حسرت، خود ایک محفل ہے تیری خلوت ۔۔۔ اچھوتا رکھا ہے دسترس سے خود اپنا عہد شباب تو نے

تو ایک ہے نیر درخشاں مگر سراامتیاز کس کو ۔۔۔ کہ ذرے ذرے سے دو جہاں کے کھلائے آفتاب تو نے

وہ پردے ڈالے ہیں وہم و ظن کے، کہ خود شناسی ہے ناشناسی ۔۔۔ ہماری از خود فراموشی کو بنایا اپنی نقاب تو نے

دکھائے بھی آپ ہی کرشمے، اور آپ ہی داوری کھڑی کی ۔۔۔ ہمیں کو ناز آفریں کیا، اور ہمیں کو خانہ خراب تو نے

تری محبت بھی اے ستمگر! دلوں پہ بجلی گرا رہی ہے ۔۔۔ ملا دیا خاک میں اسی کو، جسے کیا انتخاب تو نے

تو اپنا لذت پرست ہو جا، تو آپ اپنے سے مست ہو جا ۔۔۔ کہ اپنے آپے میں بھر رکھا ہے، سدا سے کیف شراب تو نے

شباب توفیق بخش عالم ہے، جاگتی جوت جسم و جاں کا
کہ حسن کو دلکشی عطا کی، تو عشق کو اضطراب تو نے

خلیفہ معتصم باللہ[1]

از جناب مولوی جمیل الرحمن صاحب صام - ایم اے پروفیسر تاریخ اسلام کلیہ جامعہ عثمانیہ

فوج نے معتصم کو خلیفہ تسلیم کرنے سے اس وقت تک انکار کیا جب تک کہ عباس بن مامون نے اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرلی۔ طوانہ تباہ کیا گیا۔ قیصر تھیوفلوس (عربی: توفیل) سے صلح۔ خرمیہ کے خلاف جنگ۔ بازنطی سپہ سالار تھیوفوبوس عربوں کی فوج میں شامل ہوا۔ آذربائیجان میں بابک کے خلاف جنگ۔ افشین نے بابک کو البذ کی طرف بھاگنے پر مجبور کیا۔ البذ کا محاصرہ اور اس کی فتح۔ بابک کی گرفتاری اور ساہرہ میں اسکا مصلوب ہونا۔ معتصم کی مذہبی سختیاں۔ معتصم کا اجیر سپاہیوں اور مملوکوں کو ترجیح دینا۔ دارالخلافہ میں بے چینی۔ تعمیر سامرا۔ عربوں کی تلون المزاجی۔ زیرین علاقہ فرات میں زُط کا آباد ہونا۔ اس قوم کی ابتدا۔ عُجیف بن عنبسہ کی ان کے خلاف جنگ۔ زُط کا ایشیائے کوچک کی طرف نقل مکان۔ خراسان میں ایک علوی کا خراج۔ خلیفہ کے حکم سے اس کی گرفتاری اور انجام۔ قیصر تھیوفلوس نے دوبارہ جنگ شروع کی۔ دریائے فرات کی طرف ایک تباہی خیز مہم۔ معتصم نے عجیف کو زبطرہ کی طرف روانہ کیا۔ اس کے بعد

---

[1] ترجمہ از۔ مصنفہ ڈاکٹر ستاڈ وائل

خلیفہ خود ایشیائے کوچک گیا۔ معتصم کے سپہ سالار۔ افشین نے دزمون کے قریب تھیوفلوس کو شکست دی۔ معتصم عموریہ پہنچا۔ اس شہر کا محاصرہ۔ اُس کی فتح اور بربادی۔ قیصر تھیوفلوس نے صلح کی استدعا کی۔ معتصم نے قیدیوں کا تبادلہ نہیں کیا۔ معتصم اور اس کی اجنبی فوج کے خلاف سازش۔ عباس بن مامون نے خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ معتصم نے یہ سازش فرو کی۔ عباس اور اس کے ہمدردوں کی موت۔ افشین اور عبداللہ بن طاہر۔ طبرستان کے اسپہبد کی بغاوت۔ اس رئیس کے خلاف جنگ۔ اس کی فوج اور سپہ سالاروں کی غداری۔ اسپہبد کے بھائی نے اسے معتصم کے سپرد کر دیا اور اُسے موت کی سزا دی گئی۔ آذربائیجان میں شورش۔ افشین کی نکبت اور موت۔ کردوں کی موصل میں اور مبرقع کی فلسطین میں شورش۔ معتصم کے عہد کا عدالتی انتظام۔ احمد بن ابی داؤد کا اثر۔ افشین اور ابو دلف معتصم کی بے رحمیاں۔ اس کے وزراء اور علوم و فنون پر اس کا اثر۔ الکندی فلسفی۔ معتصم کی وفات۔

مامون کی وفات کے بعد اس کی آخری وصیت اور انتظام کے مطابق اس کے بھائی معتصم کے ہاتھ پر بیعت کی جانی چاہیئے تھی[1]۔ لیکن فوج نے، جو ایشیائے کوچک کی مہم میں مامون کے ساتھ تھی اُس پر اعتراض کیا، اور عباس بن مامون کو خلیفہ بنانا چاہا۔ عباس ۲۱۳ھ سے شمالی شام اور مسوپوتامیا کا حاکم تھا، اور بازنطینی سلطنت کے خلاف جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔ عباس کو اس کے باپ نے مقرر کیا تھا کہ وہ طوانہ کو آباد اور قلعبند کرنے کی نگرانی کرے[2]۔ لیکن اب معتصم نے اُسے بسرعت تمام واپس آنے کا حکم دیا چنانچہ عباس

---

[1] خلیفہ ہارون الرشید نے مامون کے بعد اس کے ایک اور بھائی موتمن کو جانشین مقرر کیا تھا تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ مامون نے اسے کیوں برطرف کیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن اثیر کے بیان کے مطابق وہ امین سے ملگیا تھا، اور امین کے قتل کے بعد اسی وجہ سے اسے ولی عہدی سے محروم کر دیا گیا۔ ابن جوزی (مراۃ الزمان) کی روایت کے مطابق مامون کا ایک اور بھائی ابو احمد تھا جسے ولی عہد مقرر کیا گیا تھا مگر اس نے ۲۰۹ھ میں وفات پائی۔ معتصم کا نام ابو اسحاق محمد تھا۔

[2] [ابن اثیر۔ مطبوعہ مصر۔ ج ۶۔ ص ۱۶۲۔ مترجم۔ اس قسم کی خطوط وحدانی میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی ذمہ داری مترجم پر ہے۔

اپنے چچا سے آملا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے معتصم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد فوج کو کوئی اعتراض نہ رہا۔ اور معتصم کی خلافت تسلیم کر لی گئی۔ اب معتصم کو یہ مناسب نہ معلوم ہوا کہ فوج دوبارہ عباس کے سپرد کی جائے۔ اس نے طوانہ کے قلعوں کو مسمار کرا دیا، اور عباس کو ساتھ لے کر بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ ماہ رمضان کے شروع میں یہ دونوں دار الخلافہ پہنچے[۵۱]۔ اس کے بعد قیصر تھیوفلوس نے صلح یا کم از کم عارضی صلح کی درخواست کی، اور یحییٰ[۵۲] نحوی کو نہایت بیش قیمت

[۵۱] ابن جوزی (مرآۃ الزمان) ورق ۱۶۸۔ [ابن اثیر ج ۶ ۔ ص ۱۶۱۔ طبری۔ مطبوعہ یورپ ج ۳۔ ص ۱۱۶۴]۔

[۵۲] مینوں کے فرار اور یحییٰ نحوی کی سفارت کے درمیان کا زمانہ۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے بازنطینی سلطنت میں کچھ ایسا گذرا کہ حکومت کوئی خاص طرز عمل اختیار نہ کرسکی اور بعض مرتبہ وہاں اختلاف برپا رہا۔ عربوں کی مدد سے ہم ان حالات کا کچھ پتہ لگا سکتے ہیں گو ان مورخوں نے اپنی عادت کے مطابق نہ تو یحییٰ نحوی کی سفارت، اور نہ ان خدمات کا جو مینوں نے انجام دی تھیں ذکر کیا ہے بہرکیف ہمیں معلوم ہے کہ ماموں نے اگست ۸۳۳ء کو اس وقت انتقال کیا، جب کہ وہ جنگ کو دوبارہ جاری کرنے اور طوانہ کو ایک عربی قلعہ کی صورت میں تبدیل کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ معتصم نے اس کی موت کے بعد فوجوں کو فوراً ایشیائے کوچک سے ہٹا کر بغداد کا راستہ لیا تھا۔ اس کے علاوہ عرب مورخوں کی تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسی سال خرمیہ نے عربوں سے شکست کھائی تھی۔ (ابن جوزی۔ ورق ۱۶۸۔ ابن اثیر [مطبوعہ مصر۔ ج ۶ ۔ ص ۱۶۲] ابن خلدون [؟]۔ [طبری۔ مطبوعہ یورپ ج ۳۔ ص ۱۱۶۵] اور بازنطینی ماخذوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مینوں کی فوجی استعداد اور یونانیوں کی مدد سے جو اس وقت اس کے ساتھ تھے یہ عظیم الشان فتح حاصل کی گئی تھی۔ مزید برآں اس زمانہ کے بطریقوں کی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ یحییٰ نحوی ۸۳۳ء کے آخر میں بغداد سے واپس جانے کے بعد بطریق بنایا گیا تھا۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے اس میں ذرا شبہ نہیں رہتا کہ بغداد کو یحییٰ نحوی کی سفارت، جہاں معتصم پہلے ہی ۲۰ ستمبر ۸۳۳ء کو پہنچ چکا تھا، یقیناً اس سال کے آخری مہینوں میں آئی ہوگی، اور مینوں خرمیہ کی شکست کے تھوڑے عرصہ بعد ہی قسطنطنیہ واپس چلا آیا ہوگا۔ بعض تحریروں کے مطابق یہ فتح یحییٰ کے دمشق آنے سے پہلے اور بعض کے نزدیک اس کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ سیمیوں مجسترا (SYMEON MAGISTER) مصححہ بکر (BEKKER) (ص ۶۳۲) بھی اس سے متفق ہے کہ یہ واقعہ قیصر تھیوفلوس (عربی۔ توفیل) کے پانچویں سنہ جلوس میں پیش آیا تھا۔ تھیوفلوس ۸۲۹ء میں قیصر بنایا گیا تھا۔

تحائف دے کر بغداد بھیجا۔ اس سفارت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قیدیوں کے تبادلہ کا انتظام کیا جائے اور بازنطینی سپہ سالار منئول کو، جو قیصر سے ناراض ہو کر عربوں سے مل گیا تھا، دوبارہ قسطنطنیہ لایا جائے۔

مذکورہ بالا واقعہ کے علاوہ دوسرے اسباب بھی تھے، جن کی بنا پر معتصم بازنطینی سلطنت کے خلاف جنگ ختم کرنا چاہتا تھا۔ مامون کے مذہبی خیالات نے جن کی اس نے اشاعت کی تھی، ایک عام بے چینی پیدا کر دی تھی جس کے سبب سے وہ خود بھی دار الخلافہ میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ دریائے فرات کے زیریں علاقہ میں زُط کی، اور خراسان میں علویوں کی شورشیں برپا تھیں، عراق عجم اور آذربائیجان میں بابک کے پیرو خرمیہ کی بغاوت اب تک جاری تھی۔ ۲۱۸ھ میں مامون نے بغداد کے حاکم اسحاق بن ابراہیم کو جو طاہر بن حسین کا چچازاد بھائی تھا، ایک زبردست فوج دے کر خرمیہ کے خلاف روانہ کیا تھا۔ اس فوج نے غالباً منئول اور یونانی طریق جنگ کی مدد سے ہمدان کی خطرناک بغاوت کا خاتمہ کیا تھا۔ اس لڑائی میں ساٹھ ہزار آدمی کام آئے تھے۔ بقیۃ السیف باغی کچھ تو بھاگ گئے اور بعض نے بازنطینی علاقہ میں پناہ لی تھی[۱]۔ اسی فتح کے بعد معتصم اس قابل ہوا کہ آذربائیجان میں خود بابک کے خلاف جو سولہ برس سے وہاں کا تقریباً مطلق العنان مالک بنا بیٹھا تھا۔ جنگ کی تیاری کرے۔ ۲۱۹ھ[۲] میں معتصم نے پہلے ابوسعید محمد بن یوسف کو اردبیل بھیجا تا کہ اس شہر اور زنجان کے درمیان جو قلعے تھے، ان پر دوبارہ قبضہ کرے، کیونکہ اس وقت ان سب پر بابک قابض تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ان دونوں مرکزوں کے درمیان قلعوں میں فوج مقرر کر کے سلسلۂ رسل ورسائل قائم رکھا جائے[۳]۔ اس کے علاوہ محمد ابن الاشعث[۴] کو بھی آذربائیجان بھیجا گیا۔ محمد نے اپنا فرض اس طرح ادا کیا کہ عصمہ نام ایک زمیندار کو بدعہدی سے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا۔ عصمہ زمیندار تھا، بابک سے ملا ہوا تھا، اور اس کی ایک فوج کا سپہ سالار بھی تھا۔ معتصم نے بابک کے خلاف تمام فوجی مہموں میں عصمہ کے مشوروں پر عمل کرنا شروع کیا

---

[۱] ابن اثیر (مطبوعہ مصر۔ ج ۶۔ ص ۱۶۲) نے اسے معتصم کے زمانہ کا واقعہ بتایا ہے۔ مترجم]۔ [۲] [ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۴) کے مطابق یہ واقعہ ۲۲۰ھ میں پیش آیا تھا۔ مترجم] [۳] [ابن اثیر [ج ۶۔ ص ۱۶۴] ابن خلدون (مطبوعہ بولاق ج ۳۔ ص ۲۵۸] [۴] [طبری (ج ۳۔ ص ۱۱۷۱] اور ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۴) نے اس سپہ سالار کا نام محمد بن بعیث لکھا ہے۔ مترجم]۔

اور اب اس کی مدد سے بابک جیسے خطرناک باغی سے لڑنا بہت آسان ہوگیا۔ اس کے بہت جلد بعد، یعنی ۲۲۰ھ میں خلیفہ نے حیدر بن کاؤس کو جبال کا حاکم مقرر کیا، اور بابک کے خلاف جو فوج لڑ رہی تھی اس کا افسر اعلیٰ بنایا۔ حیدر بن کاؤس عام طور پر افشین کے نام سے مشہور ہے، اور اس سے قبل مامون کے عہد میں وہ مصر کی ایک بغاوت فرو کرچکا تھا۔[۱] افشین کی کوشش خصوصاً یہ تھی کہ بابک کے جاسوسوں کو رشوتیں دے کر جہاں تک ہوسکے اسے کمزور کر دیا جائے۔ بہت جلد افشین کو اس کا موقع بھی مل گیا۔ تفصیل یہ ہے کہ معتصم نے ترک سپہ سالار بغا کو فوج کی تنخواہ اور دیگر اخراجات کے لئے بہت سامان دے کر افشین کی طرف روانہ کیا۔ بابک کے جاسوسوں نے اسکی اطلاع بابک کو دی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ بغا کا مال و اسباب لوٹ لیا جائے۔ مگر بابک کے ایک جاسوس نے، جو افشین سے ملا ہوا تھا، بابک کے قصد کی اطلاع افشین کو دے دی وہ فوراً تیار ہوگیا۔ اور مقررہ دن اچانک بابک کی فوج پر جو بغا کو لوٹنے آئی تھی حملہ کرکے اس کے بے شمار آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ بابک کو مجبوراً پہلے موغان[۲] یا موقان میں پناہ لینی پڑی، جہاں سے وہ بعد میں بھاگ کر آخر اپنے مستحکم قلعہ البذ[۳] کو آیا۔ بابک اب درحقیقت دو طرف سے خطروں سے

---

[۱] ابن اثیر [ج ۶۔ ص ۱۶۴] کے مطابق افشین نے برزید کے مقام پر چھاؤنی قائم کی تھی۔ غالباً یہ مقام درحقیقت برزند ہے، کیونکہ عربی زبان میں ی اور ن اور اسی طرح ب اور ت میں صرف نقطوں کے ذریعہ امتیاز پیدا کیا جاتا ہے۔ برزند، ادریسی (ج ۲۔ ص ۳۲۳) کی تحریر کے مطابق، اردبیل کے شمال مغرب میں صرف (۴۵) میل کے فاصلے پر تھا، اور اردبیل اور برزند کے درمیان بہت سے قلعہ بند مقامات تھے، جہاں فوجیں مقیم تھیں۔ [مصنف نے ابن اثیر کے قلمی نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ مطبوعہ نسخہ میں برزند ہی لکھا گیا ہے۔ مترجم]

[۲] موغان ایک صوبہ ہے، جو اردبیل سے شمال کی طرف دو دن کی مسافت پر بحیرۂ خزر کے کنارے واقع ہے۔ موغان میں بابک نے البذ سے اپنی فوج کے ایک حصہ کو وہاں آنے کا حکم دیا تھا، تاکہ اس کی زیر حفاظت دوبارہ البذ پہنچ سکے۔

[۳] ابن اثیر، ابن خلدون [اور طبری] نے اس کا بھی نام لکھا ہے۔ مگر رائسکے (REIZKE) نے اس میں شبہ ظاہر کیا ہے، کیونکہ ابوالفداء اسے بذس یا بذیا بدس پڑھتا ہے، اور مقدس بذ لکھتا ہے۔ ہربلوت (HERBELOT) نے اس کو بظاہر بُدیا بد پڑھا ہے، کیونکہ جب وہ بابک کے کشابد (CAZHABED) میں گرفتار ہونے کا ذکر کرتا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ

گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف افشین البذ سے صرف چھ میل کے فاصلے پر چھاؤنی ڈالے پڑا تھا۔ اور دوسری طرف بُغا، دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ ان پہاڑوں میں گھوم رہا تھا، جو البذ کے گرد واقع تھے۔ بہرکیف ۲۲۱ھ کے موسم سرما میں بابک نے ایک مرتبہ ان فوجوں کو نہ صرف شکست دی بلکہ انھیں مجبور کیا کہ البذ کا محاصرہ اٹھا لیں، اور مراغہ میں ٹھیر کر کمک کا انتظار کریں۔ اس کے بعد افشین کا سلسلہ رسل و رسائل اردبیل سے منقطع ہوگیا، اور اسے مراغہ سے رسد کا انتظام کرنا پڑا۔ لیکن اس سال افشین نے بابک کے ایک سپہ سالار طرخان کو، جو مراغہ کے قریب ایک گاؤں میں موسم سرما گذار رہا تھا، غداری سے قتل کرادیا[۱]۔ چونکہ خلیفہ معتصم نے دو سپہ سالاروں ایتاخ اور جعفر الخیاط کی سرکردگی میں تازہ دم فوج اس کی مدد کے لئے بھیج دی تھی۔ اس لئے اب ۲۲۲ھ کے آغاز میں افشین نہایت احتیاط سے آگے بڑھا۔ باغیوں نے تھوڑی سی مزاحمت کی، اور محصور فوج سے معمولی سی جنگ لڑنے کے بعد افشین نے اس پہاڑی تک جس پر البذ واقع تھا، تمام کوہستانی دروں پر قبضہ کرلیا[۲]۔ اور ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ اس پہاڑ پر، جو البذ پر چھایا ہوا تھا اپنے سپہ سالاروں کے ذریعہ قبضہ کرے۔ جعفر الخیاط نے متعدد مرتبہ کوشش کی کہ حملہ کرکے قلعہ پر قابض ہوجائے، لیکن ہر مرتبہ نقصان اٹھاکر پسپا ہوا۔ ایسی حالت میں جلدی ہی سپاہیوں نے شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا، اور مختلف تکالیف و مصائب اور رسد کی کمی کی بھی شکایت کی۔ افشین نے سرے سے البذ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، اور بابک نے، جس کے آدمی برابر اس کا ساتھ چھوڑتے چلے جارہے تھے، خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ افشین

ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل۔ اس سے اس کا مطلب قصبۂ بذ سے ہے میں اس امر میں بھی راڈسکے سے متفق نہیں ہوں کہ کشابد کے معنے قصبہ بذ کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ راڈسکے کی طرح میں بھی البذ کا صحیح محل وقوع نہیں بتا سکتا، لیکن دوسری باتوں کے علاوہ کوچ کے تفصیلی حالات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مقام اردبیل کے شمال مغرب میں تقریباً تین دن کی مسافت پر، ارمینیہ کی سرحد کے قریب کوہستان طارس کے شمال میں واقع تھا۔

[۱] ابن خلدون [ج ۳، ص ۲۶۰]۔ ابن اثیر [ج ۶، ص ۱۶۹]۔ [طبری، ج ۲، ص ۱۱۹۲]۔

[۲] ابن اثیر کی تحریر کے مطابق افشین نے پہلے کلان رود میں، اور پھر رود الرود میں چھاؤنی قائم کی تھی۔ ابن خلدون نے مرد الرود کا لیا ہے۔ یہ ایک دریا کا نام ہے جو مراغہ کے قریب بہتا ہے۔

چاہتا تھا کہ بابک کو مع اس کے اہل خاندان اور مال و متاع کے گرفتار کرے لیکن اس کی فوج کا ایک حصہ، جیسا کہ دمشق کے محاصرہ میں ہوچکا تھا، غداری سے ایک دوسری جانب سے البذ پر حملہ کر رہا تھا[1]۔ بابک قلعہ سے فرار ہوا[2] اور تھوڑی مدت کے لئے آذربائیجان اور ارمینیہ کے درمیان جنگلوں میں اور اس کے بعد ارمینیہ کے پہاڑوں میں سرگردان رہا۔ یہاں تک کہ شوال ۲۲۲ھ (ستمبر ۸۳۷ء) میں اس نے اپنے آپ کو خلیفہ کی فوج کے حوالہ کر دیا، جو برابر اس کا تعاقب کر رہی تھی[3]۔ معتصم کے حکم کے مطابق بابک کو نئے دار الخلافہ، سامرہ، میں زندہ لایا گیا، جہاں اُسے ہاتھی پر بٹھا کر شہر میں گشت کرایا گیا، اور پھر ہاتھ پیر کاٹنے کے بعد اس کا سر قلم کیا گیا۔ سر کو خراسان بھیجا گیا، اور جب سامرہ میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اہل بغداد نے بھی اس قسم کا ایک نظارہ دیکھا، کیونکہ بابک کا بھائی عبداللہ وہاں بھیجا گیا تھا اور

---

[1] قدرتی طور پر عرب مورخ اس غداری کا اعتراف نہیں کرتے وہ صرف یہ بیان کرتے ہیں کہ جب افشین بابک سے خط و کتابت کر رہا تھا اسے یہ اطلاع ملی کہ فوج کے ایک حصہ نے جو ایک پہاڑی پر البذ کے نیچے پڑی ہوئی تھی ایک طرف سے شہر پر حملہ کر دیا ہے اور قلعہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔

[2] اس اثنا میں کہ ایک اس جنگل میں جس کا نام ابن اثیر نے غداہ کہا ہے، آوارہ پھر رہا تھا، خلیفہ معتصم کا معافی نامہ وصول ہوا۔ افشین نے اسے بابک کے پاس بھیج دیا۔ مگر بابک نے دو قاصدوں میں ایک کو قتل کرا دیا، اور پھر اپنے آپ کو حوالہ کرنے سے انکار کر دیا اس کے علاوہ اس نے اپنے بیٹے کو، جسے عربوں نے گرفتار کر لیا تھا، اور جو اپنے باپ کو ترغیب دے رہا تھا کہ اپنے کو عربوں کے حوالہ کر دے لکھا کہ "اے ابن فاعلہ۔ اگر تو میرا بیٹا ہوتا تو میرے ساتھ رہتا۔ لیکن تو میرا بیٹا ہی نہیں اگر تو صاحب اقتدار ہو کر ایک دن زندہ رہتا اس سے بہتر تھا کہ ذلیل غلام کی حیثیت سے چالیس برس زندہ رہے" (ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۷۴)۔

[3] جس غدار نے بابک کو اپنے قلعہ میں پناہ لینے کی دعوت دی تھی، اور پھر اُسے عربوں کے حوالہ کر دیا تھا، اس کا نام سہل بن سنباط یا سینٹ مارٹن کی تاریخ کے مطابق سہل بن سمبد (SEMPAD) تھا اسی طرح بابک کے بھائی عبداللہ کو بیلقان کے رئیس عیسی بن یونس بن اصطفانوس نے اپنے ہاں دعوت دی، اور غداری سے اسے افشین کے حوالہ کر دیا۔ [ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶]۔

وہیں اُسے پھانسی دی گئی تھی۔ بابک نے بست سالہ شورش کے دوران میں (۲۵۵۰۰۰) مسلمان قتل کئے اور چھ سپہ سالار اس سے لڑنے کے لئے یکے بعد دیگرے بھیجے گئے۔ بابک کے ساتھ (۳۳۰۹) باغی گرفتار ہوئے، اور (۷۶۰۰) عورتیں اور بچے، جو اس کی قید میں تھے، آزاد کئے گئے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے اس میں تعجب کی گنجائش نہیں رہتی کہ کیوں افشین کی، جس نے اس خطرناک بغاوت کا خاتمہ کیا تھا، اس قدر عزت افزائی کی گئی۔ خود خلیفہ معتصم اور اس کے بیٹوں، خصوصاً اس بیٹے نے جو بعد میں واثق کے لقب سے خلیفہ ہوا، ہر طرح کے تحائف سے اُسے سرفراز فرمایا[1]۔

اس کے بعد اب وہ بے چینی شروع ہوئی جس کے فرو کرنے میں معتصم کا وقت صرف ہوا، اور اُسے تمام فوجی قوت خرچ کرنی پڑی۔ لیکن چونکہ ان معاملات کے متعلق ہماری معلومات بہت سطحی ہیں اس لئے ہم انہیں تفصیل سے بیان نہیں کر سکتے۔ اکثر مرتبہ بغداد کے دیندار مسلمانوں نے اس مذہبی ظلم وستم کی وجہ سے جو معتصم نے اپنے بھائی مامون کی وفات کے بعد جاری رکھا تھا، بدامنی پیدا کی۔ یہ مذہبی تعدی اور تعذیب اس قدر بڑھ گئی کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ جیسے پارسا اور برگزیدہ شخص بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ امام صاحب نے خلق قرآن کے مسئلہ کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا تھا، اور اس کی سزا میں انہیں تازیانے لگوائے گئے تھے[2]۔ بے چینی کا ایک دوسرا سبب وہ بے شمار غلام تھے، جنھیں خلیفہ نے ترکستان اور ماوراءالنہر سے خریدا تھا اور ان سے اپنی محافظ فوج مرتب کی تھی۔ ان اجنبی غلاموں کی وجہ سے عربوں کی توقیر وعزت میں کمی آگئی تھی، حالانکہ عربوں کو علم وفضل کے لحاظ سے ان غلاموں پر ہر طرح کی فضیلت حاصل تھی۔ اہل بغداد ان اجنبی سپاہیوں سے جن کا رسوخ اور اثر برابر بڑھتا جا رہا تھا

---

[1] سامرہ کے راستے میں جہاں کہیں افشین قیام کرتا، خلیفہ کا ہرکارہ اسے ملتا اور خلیفہ کی طرف سے ایک خلعت اور ایک گھوڑا تحفہ میں دیتا۔ واثق نے راستہ میں اسے تحائف دئے چنانچہ اس نے ایک تاج اور دو کمربندوں کے علاوہ (۲۰۰۰۰۰۰) درہم خود افشین کے لئے اور (۱۰۰۰۰۰۰۰) درہم اس کی فوج کے لئے بھیجے [دیکھو ابن خلدون ج ۳۔ ص ۲۶۱۔ ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۷۶]۔

[2] ابن اثیر۔ ج ۱ ص ۱۱۲]۔

ناراض تھے۔ یہ ناراضی رفتہ رفتہ اس نوبت کو پہنچی کہ اگر اکا دُکا سپاہی شہر کے بازاروں میں نکلتا تو اسے جان کا خطرہ ہوتا
ان وجوہ کی بنا پر آخر معتصم نے فیصلہ کیا کہ اس بدامن اور بے چین دارالخلافہ کو خیرباد کہے اور ایک نیا دارالخلافہ تعمیر کرائے
یہ نیا دارالخلافہ بغداد کے شمال میں تین منزل کے فاصلے پر بنایا گیا اور سُرَّ مَن رائ اس کا نام رکھا گیا۔ یہی نام آخر میں
سامرہ یا سامّرہ بن گیا۔[۵] معتصم اپنے پیشرو خلفاء کی حکمت عملی کو ترک کر کے اس اجنبی فوج کو لے کر نئے شہر میں منتقل ہو گیا

---

[۵] ابن خلدون [ج ۳ - ص ۲۵۰] نے اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔ "معتصم نے مصر اور مغرب کے سپاہیوں کی ایک بڑی
تعداد جمع کی جو مغاربہ کہلاتی تھی، اس کے بعد اس نے سمرقند اشروسنہ اور فرغانہ سے ایک فوج مرتب کی جو الفراغنہ کے نام سے
مشہور ہیں۔ ان نوجوان سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور وہ اپنے گھوڑے شہر کی سڑکوں پر اس قدر تیزی سے بھگاتے تھے
کہ بہت سی عورتیں اور بچے ان کے پیروں میں روندے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کبھی ان سپاہیوں میں سے کوئی اکیلا ملتا تو
اہل شہر اسے قتل کر دیتے۔ شہر میں ان واقعات کی وجہ سے سخت ناراضگی پھیلی ہوئی تھی۔ اور بعض مرتبہ لوگ علانیہ طور پر معتصم کو
برا بھلا کہہ دیتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر آخر معتصم نے القاطول کو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ ایک شہر تھا، جسے اس سے قبل خلیفہ ہارون الرشید
نے تعمیر کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی، اور آبادی بھی ویران ہو گئی تھی۔ معتصم نے ۲۲۱ھ میں اسے دوبارہ بسانے کا
حکم دیا، اور اس کا نام سُرَّ مَن رائ رکھا، لیکن عوام نے اسے بگاڑ کر سامرہ کر لیا۔ یہ شہر معتصم اور اس کے جانشینوں کا دارالخلافہ رہا۔"
اسی قسم کے حالات ابن اثیر [ج ۶ - ص ۱۶۶] نے بھی لکھے ہیں، اور طبری بڑی حد تک اس سے متفق ہے۔ لیکن (C، olllOTH)
کے بیان کے مطابق ایک زاہد و عابد شخص معتصم کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ اے امیرالمومنین مجھے خوف ہے کہ عوام تجھے مار ڈالیں گے۔
معتصم نے جواب دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے جب کہ میرے پاس فوج موجود ہے جو میرے حکم کی تعمیل کے لئے ہر وقت حاضر ہے۔ زاہد نے
کہا کہ وہ تجھے اپنی بددعاؤں سے مار ڈالیں گے، جو ہر رات کو مسجدوں سے بلند ہو کر آسمان پر جاتی ہیں۔ یہ سن کر معتصم نے جگہ تلاش کی
اور آخر سُرَّ مَن رائ کی جار د توع کو پسند کر کے جو دجلہ کے کنارے تھی حکم دیا کہ وہاں بسرعت تمام ایک شہر بسایا جائے"۔ مذکورہ بالا
تمام اسناد، مثلاً طبری، ابن اثیر اور دوسرے مورخوں کے مطابق سب سے پہلے ہارون الرشید ہی نے قاطول پر ایک شہر بسانا شروع
کیا تھا، اور یہ وہی مقام تھا جہاں بعد میں معتصم نے سُرَّ مَن رائ آباد کیا ادریسی (مسیو جوبرٹ JAUBERT ج ۲ ص.

عام طور پر اس نقل مکان کو ایک فاش غلطی تصور کیا جاتا ہے، اور ان تمام خرابیوں کا جو آئندہ اس اجنبی فوج کی وجہ سے خلافت اور خاندان خلافت میں پیدا ہوئیں، معتصم ہی کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عباسیوں نے خراسانیوں کی مدد سے بنی امیہ کو خلافت سے برطرف کیا تھا، اور ان کی جگہ لی تھی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر مامون نے ایرانیوں کی مدد ہی سے اپنے بھائی امین کو جو عربوں کا ہمدرد تھا، شکست دے کر خلافت سے برطرف کیا تھا۔ اس کے علاوہ مشہور ترین سپہ سالاروں اور والیوں میں بھی حقیقی عربوں کا نام دکھائی نہیں دیتا خود ترک غلاموں کی خریداری بھی مامون کے عہد میں شروع ہوئی تھی، کیونکہ عربوں کی سیاسی تلون المزاجی کے سبب یہ لوگ اسے کو پسند نہ تھے، اور ایرانیوں پر بھی وہ پورا بھروسہ نہ کرسکتا تھا یہی سبب تھا کہ اس نے ترک غلام خرید کران سے خدمت لینی شروع کی تھی[1]

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) نے غلطی سے لکھ دیا ہے کہ خلیفہ منصور بانی بغداد نے ہی اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے علاوہ فرانسیسی ترجمہ میں بھی بجائے ابو العباس کے ابن عباس لکھ دیا گیا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس مقام پر پہلے ایک شہر موجود تھا، جس کا نام کستلم سمیری (CASTELLUM SUMERE) اور بطلیمس اور زوسیموس کے مطابق سُمار (SUMA) تھا یہ نام بھی نیا نہیں بلکہ غالباً بعد میں اسی کو بامعنی بنا کر سُرَّ مَن رایٔ کرلیا گیا تھا، اور ممکن ہے کہ یہ کام اہل بغداد نے کیا ہو، اور مزاحاً اُسے سُرَّ مَن رایٔ کہنے لگے ہوں، کیونکہ اس شہر کی تعمیر نے اہل بغداد کو معتصم کی عزیز محافظ فوج کے ظلم وستم سے آزاد کردیا تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نہر قاطول ابو الفدا کی تحریر کے مطابق سامرہ سے جنوب کی طرف جرجرایا تک بہتی تھی (دیکھو رٹر (RITTER) کی کتاب اردکنڈی (ERDKUND) ج ۱۰ ص ۲۰۹) اور طبری کی تحریر کے مطابق یہ نہر اسی نام سے شمال کی جانب موصل جاتی تھی اس موقع پر یہ مصنف کہتا ہے کہ سامرہ نہایت قدیم زمانہ سے دریائے دجلہ کے کنارے ایک ویران شہر تھا۔ موصل کے علاقہ میں دریائے دجلہ سے نکلی ہوئی ایک بہت بڑی نہر بہتی تھی جسے قاطول کہتے تھے۔ اسی نہر سے موصل کو پانی ملتا تھا۔ سامرہ دریائے دجلہ کے کنارے واقع تھا۔ مگر اس کا پانی بھی نہر قاطول سے آتا تھا۔

[1] "مامون پہلا خلیفہ تھا جس نے ترکوں کو اپنی خدمت پر مقرر کیا۔ ان میں سے اکثر کو اس نے (۱۰۰۰۰۰) اور (۲۰۰۰۰۰) درہم میں خرید ا تھا۔"

لیکن درحقیقت معتصم کے زمانہ میں ان ترک غلاموں کی طاقت کا پورا اظہار ہوا، اور اس نے خاص طور پر ان مملوکوں سے جن کی تعداد (۰ ۰ ۰ ۰) تک پہنچ گئی تھی، اپنی محافظ فوج مرتب کی۔ معتصم غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ امن و امان قائم رکھنے کے لئے صرف اطاعت شعار لوگوں پر بھروسہ کرنا مفید ہوگا، اور عرب اپنے مختلف قبائلی عناد اور مذہبی جھگڑوں میں ایسے مبتلا تھے کہ ان سے یہ کام نہیں لیا جا سکتا تھا علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ چونکہ اُس وقت کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی اس لئے بیرونی دشمن اور اندرونی فتنہ و فساد سے مفتوحہ صوبجات کی حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا، اور یہ کام اُس وقت تک عرب سپاہیوں سے لیا جاتا تھا، مگر اب ان کی جگہ ان بیرونی مملوکوں نے لے لی۔ بدوؤں نے صدر اسلام کی جنگوں میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ لیکن اب چونکہ مال غنیمت کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی، اس لئے یا تو وہ اپنے ریگستان کو واپس چلے گئے تھے، اور یا مفتوحہ علاقوں، خصوصاً ان بے شمار نئے شہروں میں جو اندلس، افریقیہ، مصر، اور دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر بسائے گئے تھے، یا بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس کے ساحل پر آباد ہو گئے تھے ان مقامات میں بسنے کے بعد عیاشانہ زندگی کے سبب یہ لوگ کمزور ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ سپاہیانہ مشاغل کو ترک کر کے علم و فن، تجارت، زراعت اور بالخصوص تجارت اور لین دین کی طرف راغب ہو گئے، کیونکہ اسوقت یہ پیشے انتہائے عروج کو پہنچے ہوئے تھے، اور بہت جلد عربوں نے انھیں بالکل اپنا کر لیا تھا اُس زمانہ میں بغداد نہ صرف خلافت کا، بلکہ جیسا کہ عرب مورخوں نے لکھا ہے، تمام دنیا کا مرکز تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی تجارت بھی یہیں مرکوز ہو گئی تھی۔ ہر رئیس کا فرض تھا کہ قافلے کے تمام رہرو کی حفاظت اور امن و امان کا ذمہ دار ہو۔ یہ قافلے ایران کے مختلف صوبوں مثلاً اندرون فرغانہ، اور بخارا، بلکہ چین و تبت کی طرف سے آتے تھے، اور شمال مغرب، اور بازنطینی سلطنت کی صنعت کے نمونے اپنے ساتھ لائے تھے۔ پھر دریائے فرات اور دجلہ کی بے شمار نہروں میں سے ہوتے ہوئے موصل، اور رقہ پہنچے تھے۔ جنوب اور خصوصاً عرب کے ساتھ بھی تجارتی تعلقات تھے، کیونکہ حج کے موسم میں حاجی بکثرت عرب جاتے تھے، اور قدرتی طور پر ان کا مقصد حج کرنے کے علاوہ تجارت بھی ہوا کرتا تھا۔ مصر، نوابیہ اور شمالی افریقہ کے تاجر یا تو شمالی شام کے علاقہ

میں اترتے تھے، اور وہاں اپنا مال کشتیوں میں بار کرکے دریائے فرات کے راستے بغداد آتے یا دریائے نیل میں سے ہوکر بحیرۂ قلزم پہنچے، اور پھر ریگستان کے راستے سے عراق آتے۔ بغداد اور بصرہ میں بحری تجارت کی بھی کمی نہ تھی۔ یہ راستہ خلیج فارس میں ہوکر کران کے ساحل کے ساتھ دریائے سندھ کے دہانہ تک پہنچتا تھا اور یہاں دیبل اور منصورہ جیسے بڑے شہر موجود تھے، جہاں عربوں کی تجارتی کوٹھیاں اور گودام تھے، اور جن میں ہندی اور چینی مال ذخیرہ کیا جاتا تھا[1]۔ یہ نئے، اور ایک حد تک پُرخطر مشاغل، اور صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے عرب فوجی خدمت سے منحرف ہو گئے تھے، کیونکہ اب اس خدمت میں نہ کچھ فائدہ تھا، اور نہ اس سے عزت و توقیر میں کسی قسم کا اضافہ ہوتا تھا۔

عربوں کے خصائل کی اس پوری کایا پلٹ سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو خلفاء کو گذشتہ پچاس برس کے عرصہ میں اپنی فوج کو ایسے نئے لوگوں کو بھرتی کرکے تقویت دینی پڑی تھی جن میں جنگ و جدل کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہو، اور دوسری طرف قدرتی طور پر قدیم فاتحین محض نام کے مالکان ملک رہ گئے تھے، اور درحقیقت اب وہ مفتوح تھے اصل قوت و طاقت ان غلاموں کے ہاتھ میں منتقل ہوگئی تھی، جو فوجی لحاظ سے ان فاتحوں سے ارفع و اعلیٰ تھے۔

اب ہمیں معتصم اور تھیوفلوس قیصر قسطنطنیہ کی جنگوں کے دوبارہ شروع ہونے کے حالات بیان کرنے سے قبل زُطّ اور علویوں کی بغاوت کے حالات بیان کر دینے چاہییں۔ زُطّ دراصل ہندوستانی نسل کی ایک قوم کا نام[2]

---

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھو: رینوڈ (REIMAUD) کی کتاب RELATION DES VAYAGES FAITS PAR LES ARABES AT LES PERSAMS DAWS L'INDE ET A LA CHINE ETC مطبوعہ پیرس ۱۸۴۵ء مقدمہ ص۱۲۔

[2] دیکھو مجمل التواریخ REIMAUD'S FRAGMENS ARABES ET PERSANS INEDTS RELATIFS A L'INDE ص ۲۔ مقدمہ ص . . . ہواز اور شیراز کے درمیان فارس اور خوزستان کی سرحد پر زط نام ایک مقام بھی ہے (ادریسی ج ۲ ص ۳۹۰، ۳۹۳)، غالباً اس جگہ کو یہ نام اسی قوم کی مناسبت سے دیا گیا تھا۔

یہ لوگ کسی زمانہ میں دریائے سندھ کے علاقہ میں آزاد گھومتے پھرتے تھے۔ انہوں نے جلد ہندوستان کے ایک حصہ پر حکومت قائم کر لی تھی، اور شمال اور مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا تھا۔ اس قوم زُط کا ایک حصہ گھومتے گھومتے ایران کی طرف آیا، اور ایرانی فاتحین سے لڑائیوں میں شکست کھا کر بطور قیدی ملک میں لایا گیا۔ یزدجرد اور مسلمانوں کی جنگوں کے دوران میں ایرانی فوج میں زط، اور ان کے علاوہ دو اور ہندی جنگجو قبیلوں کے نام سنے جاتے ہیں جنھیں اساورہ اور سیابجہ کہتے ہیں جس وقت حضرت موسیٰ الاشعری سوس کا محاصرہ کر رہے تھے یہ سب قبائل رہواز میں تھے فتح سوس کے بعد یہ سب عربوں سے مل گئے، لیکن درحقیقت اُن کے زیر سیادت نہ آئے۔ اساورہ جو بہت جلد دوسرے ایرانی مفرورین سے مل گئے تھے بصرہ میں بس گئے، اور زُط کسگر کے نواح، اور بصرہ اور واسط کے درمیان بطیحہ کے دلدلی علاقہ میں رہنے لگے۱؎۔ مگر اس اجنبی قوم نے مختلف اوقات میں بہت سی جنگی مہمیں، خصوصاً بازنطینیوں کے خلاف اختیار کی تھیں، اور اسی زمانہ سے شام اور میسوپوٹامیا کے بعض سرحدی قلعوں پر قابض تھے ۲۱۹ھ میں غالباً ایشیائے کوچک سے واپسی کے وقت یہ لوگ عراق میں سے گذرے، اور ہر طرح کے ظلم و ستم کے مرتکب ہوئے۔ انھوں نے دیہات اور شہروں کو تاراج کیا، اور بصرہ سے عرب جانے والے قافلوں اور جہازوں کو بھی لوٹا۲؎۔ چونکہ ان جنگجو لٹیروں کی تعداد

۱؎ پہلے یہ سب قومیں بنو تمیم کی موالی بنیں۔ لیکن اس قبیلہ سے ایک ہو کر زُط اور سیابجہ حنظلہ کے اور اساورہ سعد کے موالی ہو گئے۔ صاحب قاموس نے اساورہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ یہ ایک ایرانی قوم کا نام ہے، جو بصرہ میں بس گئی تھی، اور کوفہ کے احامرہ کی طرح ان کا نام، ان کی جائے قیام کے مطابق اساورہ ہو گیا تھا۔ اس مصنف کا بیان ہے کہ انھیں اساورہ اس وجہ سے کہا جاتا تھا کہ وہ نہایت اچھے نشانہ باز تھے، اور اساورہ کا لفظ اسور یا اُسوار سے مشتق ہے جس کے یہی معنے ہیں۔ ان کا سردار، جس کا نام بلاذری کی تحریر کے مطابق سیاہ یا سیاہ الاسواری تھا، یزدجرد کی فوج میں مقدمۃ الجیش کا افسر تھا اور شاید اسی سردار کے نام پر اس قبیلہ کا نام سیابجہ پڑ گیا تھا۔ زُط اور سیابجہ کے متعلق قاموس بالکل خاموش ہے۔ اس کے علاوہ بلاذری نے اسی قسم کی ایک اور قوم کا ذکر کیا ہے جس کا وطن مکران اور بھتان کی سرحد پر تھا، اور اندغار کہلاتا تھا۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھو بلاذری، مطبوعہ مصر ص ۳۸۰ - ۳۸۴]

۲؎ ابن اثیر [ج ۶ ص ۲۲] ابن خلدون [ج ۳ ص ۱۵۰]۔ مگر ابوالفدا اور الیکین نے زط کی لڑائی کا ذکر نہیں کیا۔ بلاذری [مطبوعہ مصر ص ۳۸۲] کے مطابق انہوں نے مامون کے عہد میں تاخت و تاراج شروع کی تھی

(۱۲۰۰۰) تھی اس لئے معتصم کو ان کے خلاف ایک بڑی فوج بھیجنی پڑی، جس کا سپہ سالار عجیف بن عنبسہ تھا۔ عجیف نے واسط میں اپنا عسکر بنایا۔ ان باغیوں کے خلاف سات مہینوں تک جنگ جاری رہی اور سنہ ۲۱۹ھ[1] (جنوری ۸۳۴ء) کے اواخر یا سنہ ۲۲۰ھ کے شروع میں بہت سی خوں ریز جنگوں کے بعد آخر ان کے سردار محمد بن عثمان اور سماق مغلوب ہوئے۔ عجیف ان کے تمام خاندانوں کو جن میں (۲۷۰۰۰) آدمی تھے، کشتیوں میں سوار کرا کے خلیفہ کے پاس بغداد لے گیا۔ معتصم نے انھیں انازربہ کی طرف جلا وطن کر دیا، جہاں بہت جلد وہ بازنطینیوں کے ہاتھوں فنا ہو گئے۔

اس زمانہ میں جس علوی نے خلافت کا دعویٰ کیا وہ حضرت امام حسینؑ کی اولاد سے محمد[2] بن قاسم تھا۔ یہ شخص

---

[1] ابن خلدون نے یہی سنہ لکھا ہے۔ مگر ابن اثیر اسے سنہ ۲۲۰ھ کا واقعہ بتایا ہے۔ [ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۵۰) اور ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۳) دونوں نے اسے سنہ ۲۱۹ھ ہی لکھا ہے۔ مترجم]۔

[2] اس کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے: محمد بن قاسم بن علی بن عمر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب۔ یہ ابن خلدون کا بیان ہے [مسعودی (مطبوعہ یورپ) ج ۷۔ ص ۱۱۶؛ ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۵۰) سے متفق ہے مگر ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۶۲) اور طبری (ج ۲۔ ص ۱۱۶۵) نے یہ نسب نامہ یوں بیان کیا ہے: محمد بن قاسم بن عمر بن علیؑ بن حسینؑ بن علیؓ بن ابی طالب] ابن خلدون نے زیادہ تر شیعوں کے زیر اثر یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ "محمد بن قاسم سنہ ۲۱۹ھ میں معتصم سے ڈر کر بھاگا، اور زندگی زہد و تقاء میں گذارتا تھا۔ اس کے بعد وہ خراسان پہنچا، پھر طالقان آیا، جہاں لوگوں نے اس کی عزت و حرمت کرنی شروع کی، اور زیدیہ فرقہ کے پیرو اس کے ساتھ مل گئے۔ عبداللہ بن طاہر نے اس پر فوج کشی کی، اور شکست دی، اور قید کر کے معتصم کے پاس بھیج دیا۔ خلیفہ نے اس کی موت تک اسے قید میں رکھا، یا ایک روایت کے مطابق اسے زہر دے دیا۔" [ابن خلدون میں اس روایت کا پتہ نہیں چلتا، لیکن مسعودی (ج ۷۔ ص ۱۱۶) نے یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے۔ مترجم] ابن اثیر نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم کو قید کر دیا گیا تھا، لیکن وہ غرۂ شوال کی رات کو قلعہ سے، جہاں وہ قید تھا نکل کر فرار ہو گیا۔ الیکین (ص ۱۴۱) کا بھی یہی بیان ہے، لیکن اس مصنف نے غلطی سے محمد بن قاسم کو ابن علی لکھ دیا ہے۔ یہ امر کچھ خلاف قیاس نہیں کہ معتصم نے، جو اس سے قبل بہت سے لوگوں کو قتل کی سزا دے چکا تھا، محمد بن قاسم کو بھی قید میں قتل کرانے کے بعد اس کے فرار کی خبر مشہور کر دی ہو۔ [مگر ابن خلدون (ج ۳ ص ۲۵

نہایت اطمینان سے مدینہ میں رہتا تھا کہ خراسان کے ایک حاجی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ امامت کا دعویٰ کرے۔ یہ حاجی محمد بن قاسم سے بہت عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا، اور تمام خراسان سے مدد حاصل کرنے کا یقین دلایا۔ محمد بن قاسم ان لوگوں کے ہمراہ جوزجان پہنچا، جہاں چند روز اس نے خاموشی سے گذارے۔ اس کے بعد جب سازشیوں کی تعداد خوب بڑھ گئی تو محمد نے علانیہ طور پر خلافت کا دعویٰ کیا، یا کم از کم شیعوں کے طبعی ابہام کے مطابق الرضا من آل محمدؐ کے لئے دعوت کا آغاز کیا۔ عبداللہ بن طاہر نے جو اس وقت خراسان کا والی تھا، اس کے خلاف بہت سی فوج اور سپہ سالار روانہ کئے۔ محمد بن قاسم شکست کھا کر بھاگا، مگر آخر گرفتار ہوا۔ عبداللہ نے اسے خلیفہ کے پاس بھیج دیا، جس نے اسے قید کر دیا۔ مگر غرۂ شوال ۲۱۹ھ (۸۳۴ء) کی رات کو وہ قید سے فرار ہوا؛ اور ایسا گیا کہ پھر اس کا پتہ نہ لگا۔

خلافت کی بدامنیوں اور فتنہ و فساد سے تھیوفلوس قیصر قسطنطینہ نے فائدہ اٹھایا، اور چاہا کہ مامون کے عہد میں جو شکستیں اسے برداشت کرنی پڑی تھیں ان کا بدلہ لے۔ چنانچہ عین اس وقت جب معتصم کی بہترین فوجیں اور سپہ سالار آذربایجان میں بابک کے خلاف لڑ رہی تھیں، قیصر نے غالباً بلا کسی قسم کے بہانے کے[2] محض بابک کے

(ملاحظہ ہو بقیہ حاشیہ صفحہ ماقبل) ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۲) اور طبری (ج ۲۔ ص ۱۱۶۶) سب نے یہی لکھا ہے کہ محمد بن قاسم قید سے بھاگ گیا تھا۔ ان میں سے کسی نے زہر خورانی کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ صرف مسعودی (مطبوعہ یورپ ج ۷۔ ص ۱۱۶) نے اس کا ذکر کیا ہے، اور اس نے بھی محض ایک روایت نقل کر دی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "وقد تنوزع فی محمد بن القاسم فمن قائل یقول انہ قتل بالسم۔ مترجم]۔

[1] ابن خلدون۔ ج ۳۔ ص ۲۵۰۔ مترجم]۔

[2] بازنطینی مورخوں اور ابن اثیر، ابن خلدون اور [طبری] میں سے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ ملیہ کے مسلمان حاکم نے اس سے قبل یونانی علاقہ پر حملہ کیا تھا۔ حالانکہ اس یونانی فوج ہم کے متعلق انہیں مصنفوں کے لکھے ہوئے حالات سب سے زیادہ مستند ہیں۔ معتصم کے لئے اس زمانہ میں (۸۳۷ء) جب کہ وہ ہر طرح صلح و آشتی کا آرزومند تھا قیصر کے خلاف فوج کشی شروع کرنا ناممکن تھا۔

اکسانے سے دریائے فرات کے اسلامی علاقوں پر حملہ کیا، اور زبطرہ[1] اور سمیاط کو فتح کرکے اس علاقے کو اس طرح لوٹا اور تباہ کیا کہ ملطیہ سے لے کر شام اور میسوپوٹامیا کی سرحد تک کا سب علاقہ تہ و بالا ہوگیا۔ جو مال غنیمت قیصر ساتھ نہ لے جاسکا اُسے برباد کرڈالا۔ فوجی خدمت کے لائق ان تمام مسلمانوں کو جو اُس کے ہاتھ آئے قتل کیا، اور عورتوں اور بچوں کو غلام بناکر بیچ دیا۔ مگر ہم ان تمام بے رحمیوں کو تھیوفلوس اور اس کے یونانیوں سے منسوب نہیں کرسکتے، کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قتل و غارت میں اس نواح کے عیسائی باشندے بھی ایرانیوں اور دوسرے باغیوں کی دست درازی اور ظلم و ستم سے محفوظ نہ رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہی ایرانی اور باغی ہمدان کے قرب و جوار میں خلافت کی فوجوں سے شکست کھانے کے بعد یونانی علاقے میں پناہ گزیں ہوگئے تھے، اور اس وقت تھیوفلوس کی فوج کا ایک حصہ انہیں پر مشتمل تھا[2]۔ چونکہ معتصم کی بہترین فوجیں آذربائیجان میں برسرپیکار تھیں اس لئے ناممکن تھا کہ وہ اُس وقت

(ملاحظہ حاشیہ صفحہ ماقبل) (BARHERBAUS) نے اپنی تاریخ شام (CHRONSYR) (ص ۱۵۹) میں اس مہم کا حال لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ خود تھیوفلوس بھی اس وقت میدان جنگ میں موجود تھا۔ مگر اس کا بیان مستند نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس مصنف نے فوجی مہم کے اسباب بھی بیان نہیں کئے لیکن اس کی تحریر کے مطابق زبطرہ پر پہلا حملہ ۲۲۳ھ میں ہوا تھا۔

[1] اس مقام کے جاۓ وقوع کے متعلق، جو بازنطینیوں میں بھی اسی نام سے مشہور ہے، ادریسی اور ابوالفدا میں اختلاف ہے۔ ادریسی (ج ۲۔ ص ۱۳۱) کے مطابق زبطرہ حصن منصور سے پندرہ میل کے فاصلے پر تھا، اور حصن منصور سمیساط اور ملطیہ کے درمیان سمیساط سے (۲۲) میل اور ملطیہ سے (۳۰) میل کے فاصلے پر تھا۔ ابوالفدا (نسخہ شیر ص ۱۳۲) نے لکھا ہے کہ زبطرہ حصن منصور سے مغرب کی طرف تقریباً دو دن کی مسافت پر ایک میدان میں واقع تھا اور اس کے گرد پہاڑ تھے۔ چونکہ ابوالفدا نے ۷۱۵ھ میں بذات خود اس شہر کو شکست حالت میں دیکھا تھا اس لئے اس کا بیان زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔

[2] [طبری (مطبوعہ یورپ ج ۲ص ۱۲۳۵) اور ابن اثیر (مطبوعہ مصر۔ ج ۶۔ ص ۱۰۶) سے مصنف کے اس بیان کی توثیق ہوتی ہے۔ مترجم۔]

تھیوفلوس کے خلاف جنگ کا اعلان کرسکے[۱]۔ لیکن اس کی مصیبت زدہ رعایا کی فریاد، اور خصوصاً ایک ہاشمی عورت جو قید ہوگئی تھی، اس کی دہائی نے معتصم کو مجبور کیا کہ عمر الفرغانی اور عُجیف بن عنبسہ کو کچھ فوج دے کر سرحد کی طرف روانہ کرے، تاکہ وہ اس قسم کے قتل وغارت کے واقعات کا سدباب کردیں، حالانکہ تھیوفلوس اس ہولناک قتل عام کے بعد فوراً اپنے دارالسلطنت کو واپس ہوگیا تھا، اور صرف تھیوفولوس کو اپنے ایرانی حلیفوں کے ساتھ ایشیائے

---

[۱] عرب مورخ اس سے متفق نہیں ہیں، اور کہتے ہیں کہ تھیوفلوس نے پہلے ۲۲۳ھ (۸۳۸ء) میں زبطرہ اور سمیساط فتح کیا تھا۔ لیکن ان مورخوں میں خود اختلاف اس طرح سے واقع ہوتا ہے کہ وہ پہلے عُجیف اور عمر الفرغانی کا یونانیوں کے خلاف جانا بیان کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں (ابن اثیر [ج ۶ ص ۱۷۰] اور ابن خلدون [ج ۳ ص ۲۶۲]) کہ بابک پر فتح پانے کے بعد معتصم نے عموریہ پر فوج کشی کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عُجیف اور عمر کی پہلی فوجی مہم بابک کی جنگ کے خاتمہ سے پہلے عمل میں آئی تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، بابک شوال ۲۲۲ھ میں زیر ہوا تھا، اور ۲۲۳ھ کے شروع میں افشین کے ساتھ سامرا پہنچا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلاشک وشبہ زبطرہ کی تباہی یقیناً ۲۲۲ھ میں، جو ۸۳۶ء میں شروع ہوا تھا، واقع ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ زبطرہ کی تباہی اور معتصم کی مہم کے درمیان، جس میں افشین اور دوسرے سپہ سالاروں نے جو بابک کے خلاف لڑچکے تھے، حصہ لیا تھا، دوبرس کا عرصہ گذرا تھا۔ یعنی تھیوفلوس کی یورش ۸۳۶ء میں ہوئی تھی، اور عام جنگ کا اعلان اور عموریہ کا محاصرہ ۸۳۸ء میں پیش آیا تھا۔ اس دوبرس کے عرصہ کے متعلق نہ صرف عرب متفق ہیں، بلکہ بازنطینی مورخوں کا بھی یہی خیال ہے کیونکہ YEOI HMYNTI (ص ۱۲۵) نے Simeon کی کتاب (ص ۶۲۴) کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ زبطرہ کی فتح تھیوفلوس کے ساتھ سنہ جلوس میں اور (ص ۶۲۶) اور عربوں کی فوج کشی کا واقعہ تو سنہ جلوس میں پیش آیا تھا۔ اس کے علاوہ ابن اثیر [ج ۶ ص ۱۶۹] اور ابن خلدون [ج ۳ ص ۲۶۲] نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ بابک نے تھیوفلوس کو لکھا تھا کہ معتصم کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ اس نے اپنے درزی (جعفر) اور باورچی (ایتاخ) کو سپہ سالار بناکر اس کے خلاف بھیجا ہے، اور اس لئے اگر جنگ مقصود ہو تو اس سے بہتر دوسرا موقع نہیں مل سکتا۔ یہ یقیناً ۲۲۲ھ کا واقعہ ہے، کیونکہ معتصم نے اسی سال ان دونوں سپہ سالاروں کو آذربائیجان بھیجا تھا۔ مصنف نے اس سے قبل بھی ذکر کیا ہے کہ تھیوفلوس نے زبطرہ اور سمیساط پر قبضہ کیا تھا۔ لیکن ابن اثیر (ج ۶ ص ۱۰۶) طبری۔

کوچک میں چھوڑ گیا تھا۔ اس عرصہ میں خلیفہ نے قیصر کے خلاف جنگ کی تیاری مکمل کی۔ خلافت کے تمام صوبوں سے فوجیں جمع کی گئیں، اور جونہی وہ فوجیں جو بابک کے خلاف لڑ رہی تھیں مستقر کو واپس آئیں ۲۲۳ھ (۸۳۸ء) کے موسم بہار میں خلیفہ بذات خود انھیں لے کر ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا۔ مقدمتہ الجیش پر اشناس اور محمد بن ابراہیم بن مصعب کو، میمنہ پر ایتاخ کو، میسرہ پر جعفر [بن دینار عبداللہ] الخیاط کو، اور قلب پر عجیف بن عنبسہ کو افسر مقرر کیا گیا معتصم نے اپنا عسکر سلیبیا (سلوقیہ) میں قائم کیا، جو طرسُوس سے ایک دن کی مسافت پر دریائے ایڈنوس [نہرالبسن] کے کنارے واقع تھا[1]۔

جب تمام عرب فوج، جو بازنطینی اندازے کے مطابق (۲۵۰۰۰۰) تھی یکجا جمع ہوگئی تو معتصم نے (۳۰۰۰۰) آدمیوں کو افشین کے زیر سرکردگی میں سروج اور درب الحدثہ کے راستہ سے ملطیہ کی طرف روانہ کیا، اشناس اور وصیف کو دریائے سلیبیا کے راستہ کپاڈوشیا بھیجا، اور حکم دیا کہ وہ طوانہ کی جانب جائے۔ اشناس ۲۲ رجب کو روانہ ہوا۔ اُسے حکم تھا کہ صفصاف[2] میں خلیفہ کا انتظار کرے۔ اس کے دو دن بعد خلیفہ بذات خود روانہ ہوا۔ چونکہ اُسے معلوم تھا کہ بازنطینی اس کے قراول پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے اُس نے اشناس کو قیام کرنیکا حکم دیا، تاکہ یونانی فوج کے عسکر کا پتہ لگایا جائے۔ اشناس نے عمر الفرغانی کو دو سو سوار دے کر آگے بھیجا۔ انہوں نے کپاڈوشیا میں اِدھر اُدھر چھاپے مارے اور چند قیدی ساتھ لے کر واپس آئے۔ ان لوگوں سے معلوم ہوا کہ قیصر

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) (ج ۲۔ ص ۱۲۳۴) مسعودی (ج ۷۔ ص ۱۳۴) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۲) نے سمیساط کے بجائے ملطیہ پر یونانی حملہ کا ذکر کیا ہے، اور یہی درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مصنف نے خود لکھا ہے کہ اس تباہی خیز مہم کی بدولت ملطیہ سے شام کی سرحد تک کا تمام علاقہ برباد ہوگیا تھا، جس کی تصدیق طبری (ج ۲۔ ص ۱۲۳۴) سے بھی ہوتی ہے۔ مترجم)

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۷) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۳) کہتے ہیں کہ اس نے نہرالبسن کے کنارے سلوقیہ میں اپنا عسکر بنایا تھا بازنطینی مورخ بھی لکھتے ہیں کہ معتصم کا عسکر طرسوس کے قریب تھا۔

[2] میرا قیاس ہے کہ صفصاف طرسوس اور طوانہ کے درمیان غالباً دریائے سلیبیا کے ایک جانب واقع ہے۔

یقینی طور پر کپاڈوشیا میں جنگ کی تیاری کر رہا تھا، لیکن جب اسے افشین کے ارمینیہ جانے کی خبر معلوم ہوئی تو اس نے بھی اُسی طرف کا رُخ کیا[1]۔ یہ معلوم کرکے معتصم نے افشین کے پاس ایک قاصد بھیجا اور حکم دیا کہ وہ آگے نہ بڑھے، لیکن باوجود اس کے کہ قاصد سے (.... ۱) دینار انعام کا وعدہ کیا گیا تھا وہ افشین تک نہ پہنچ سکا۔ اس اثنا میں معتصم نے اشناس کو فوج کا ایک حصہ دے کر آگے روانہ کیا۔ وہ انقرہ[2] پہنچا جس کے تمام باشندے بھاگ چکے تھے، اور شہر خالی تھا۔ اشناس نے مفرورین کو اکٹھا کرکے ان کی تمام دولت اور کھانے پینے کا ذخیرہ ان سے چھین لیا۔ انقرہ میں ہی اشناس کو اطلاع ملی کہ افشین نے قیصر کو شکست دی ہے۔ اس جنگ میں پہلے یونانیوں کا پلہ بھاری معلوم ہوتا تھا، مگر ترک تیر اندازوں کی ہمت اور کوشش سے حالت بدل گئی، اور آخر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا یونانیوں کی فوج بالکل تباہ ہوگئی۔ اور قیصر نے بھاگ کر جان بچائی[3]۔ یہ خوشخبری معتصم تک پہنچائی گئی، جو اس وقت

---

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۰) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۳) اس واقعہ کے متعلق بازنطینی مورخوں سے متفق ہیں۔

[2] انقرہ نام کا ایک شہر شمالی گلاتیا میں اور ایک فرائگیا میں واقع ہے۔ لیکن مورخوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان دونوں مقامات میں سے کسی سے بھی مراد نہیں تمام اسناد میں جو حالات بیان ہوئے ہیں ان کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انقرہ کا یہ شہر طرسوس اور انکوئیم کے درمیان ہوگا۔ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۸) کے مطابق وہ عموریہ سے سات مراحل تھا۔ اور لیسی (ج ۲۔ ص ۱۱۳) نے انقرہ نام ایک شہر کا ذکر کیا ہے جو قونیہ اور انطاکیہ کے درمیان واقع تھا۔

[3] یہ نہایت مستند مورخوں کا بیان ہے۔ اسلامی فوج میں ترکوں کے موجود ہونے کا واقعہ نہ صرف بازنطینی مورخوں نے بلکہ ابن اثیر نے بھی بیان کیا ہے۔ ترکوں کا افسر ایتاخ تھا۔ اور یہی شخص افریقیہ کے سپاہیوں کا بھی افسر تھا۔ عربوں نے اس جگہ کا نام نہیں لکھا جہاں یہ جنگ واقع ہوئی تھی Theo. Contin (ص ۱۲۷) نے اس کا نام دنیرامونا (Dasemonae) لکھا ہے۔ ایک اور جگہ انزے (Anze) بھی کہلاتی تھی، جہاں سے قیصر تھیوفلوس تمام عربی فوج کو دیکھ سکتا تھا ان دونوں مقامات کا صحیح محل وقوع معلوم نہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ افشین ملطیہ کی طرف سے آکر قیصر سے لڑا تھا اور اس جنگ کے بعد ایرانی معاون فوج کے غدر کی وجہ سے قیصر نے اناسیہ کے قریب خلوکم میں پناہ لی تھی۔ اس لئے میدان جنگ غالباً سیواس اور قیصریہ کے

بذات خود انقرہ کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ افشین بھی بہت جلد یہاں خلیفہ سے آملا۔

معتصم اپنی فوج تین حصوں میں تقسیم کر کے عموریہ کی طرف بڑھا، اور زبطرہ سے عموریہ تک، جو قیصر کے باپ کا مولد تھا، تمام علاقہ پامال کر ڈالا، تاکہ بازنطینیوں سے ان کے گذشتہ قتل و غارت کا قرار واقعی انتقام لے[1]۔ افشین میمنہ پر، اشناس میسرہ پر، اور خود معتصم قلب فوج پر افسر تھا۔ تھیوفلوس نے افشین کے خلاف روانہ ہونے سے قبل سب سے استدعا کی تھی کہ عموریہ کے بچانے میں اس کی مدد کریں شہر چاروں طرف سے قلعبند کیا گیا تھا اور یوتیوس دوسرے بہادر سپہ سالاروں کے ساتھ مقیم فوج کا افسر مقرر ہوا تھا۔ قیصر نے خود ڈریلم (دریولیہ) کے قریب ایک مستحکم چھاؤنی تیار کی تھی، لیکن اُسے معلوم تھا کہ وہ دشمن کا، جس کی تعداد اُس سے تین گنا تھی، نہ مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ محصورین کو کسی قسم کی مدد پہنچا سکتا ہے۔ اس اثنا میں محصورین نے نہایت ثابت قدمی دکھائی، اور اگر دو غدار عربوں سے مل کر شہر کی فتح کو آسان نہ بنا دیتے تو غالباً محاصرہ طول کھینچتا۔ ان میں سے ایک عیسائی عرب تھا، جو مسلمانوں سے مل گیا، اور فصیل شہر کا وہ حصہ انھیں دکھا دیا جو طغیانی کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا چنانچہ معتصم نے محاصرہ کے تمام آلات فصیل کے اسی حصہ پر لگا دئے۔ یوتیوس خوب جانتا تھا کہ وہ شہر کو بہت دن تک محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اور چاہتا تھا کہ رات کے وقت شہر کے دروازے سے باہر آئے، اور مسلمانوں کی صفوں کو چیرتا ہوا باہر نکل جائے۔ مگر یوتیوس کی یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ قاصد، جسے اس نے اطلاع کے لئے قیصر کے پاس بھیجا تھا، مسلمانوں کے ہاتھ آگیا۔ ادہر اسی وقت اس کے سپہ سالار نے جو شکستہ فصیل کی حفاظت پر

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) درمیان کہیں واقع ہوگا، یونانیوں کے خلاف ایرانیوں نے جہاں سازش کی تھی، اس جگہ اور میدان جنگ کے قریب قریب ہونے کا ذکر گبن اور شلاسر (Schlosser) نے بھی کیا ہے۔ اس جنگ میں مینوئل، متعدد مرتبہ قیصر کی جان بچانے کے بعد، خود کام آیا تھا۔ ابن اثیر کے مطابق یہ جنگ ۲۵ شعبان ۲۲۳ھ (۲۱ جولائی ۸۳۸ء) کو ہوئی تھی۔

[1] بازنطینی مورخوں کے مطابق اس مہم کے آغاز ہی میں معتصم نے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ اپنی ڈھالوں پر عموریہ کا نام ثبت کرائیں ابن اثیر (ج ۶ ۔ص ۱۷۰) لکھتا ہے کہ بابک کو مغلوب کرنے کے بعد معتصم نے دریافت کیا تھا کہ یونانی سلطنت میں کون سا شہر

مامور تھا، معتصم کے ساتھ خط وکتابت شروع کرکے لڑائی موقوف کردی مگر رسل ورسائل کے دوران میں مسلمان برابر فصیل شہر سے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ یونانی سپاہی اپنے افسر کے حکم کے منتظر تھے۔ آخر جب انھیں اس کی غداری کا حال معلوم ہوا تو معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا، اور مسلمانوں کو پسپا کرنا ناممکن تھا، چنانچہ عرب بغیر کسی مزاحمت کے شہر میں داخل ہوگئے۔ یوتیوس نے بھی، مقابلہ بے کار سمجھ کر، ہتھیار ڈال دیئے اب مسلمان شہر پر قابض تھے، اور معتصم کو کوئی چیز بدقسمت اہل شہر سے پورا پورا انتقام لینے سے نہ روک سکتی تھی[1]۔

عرب مورخوں کا بیان ہے کہ یہ محاصرہ صرف (۵۵) دن تک رہا اور اواخر شوال ۲۲۳ھ (۲۳ ستمبر ۸۳۸ء)

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) سب سے زیادہ اہم اور باوقعت سمجھا جاتا ہے، اور لوگوں نے عموریہ کا نام لیا تھا، جہاں اس وقت تک کوئی اسلامی فوج نہیں پہنچ سکی تھی۔

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۶۔۱۸۰) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۲۔۲۶۴) نے فتح عموریہ کے حالات اسی طرح بیان کئے ہیں عرب عیسائی غدار کا نام انھوں نے نہیں لکھا۔ مگر دوسرے غدار کا نام وندو یا ویدو بتایا ہے۔ بازنطینی مورخوں نے اس کا نام بیودسیس ( ) لکھا ہے اس سپہ سالار نے کاغذ کا ایک پرچہ مسلمانوں کے عسکر میں پھینک کر انھیں اس مقام کی اطلاع دی تھی جہاں وہ مامور تھا، اور دعوت دی تھی کہ اسی جگہ حملہ کیا جائے۔ عربوں نے اس کا نام بالکل مسخ کردیا ہے، لیکن یہ مسخ شدہ نام نہایت آسانی کے ساتھ (Boedises) یا کم از کم (Woidises) سمجھا جاسکتا ہے (Simeon Magister-G. Monach) نے دونوں غداروں کے نام بیودیسیس اور منی کو فیگوس ( ) لکھے ہیں (Bax Herbans) اسے بودن Boden لکھتا ہے۔ عربوں نے غداری کا الزام ایک عیسائی پر رکھا ہے، اور فتح شہر کو ایک دوسرے غدار بیودیسیس سے منسوب کیا ہے۔ ان کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس غداری کو خاص طور سے شہرت دینا چاہتے ہیں بازنطینی مورخ بھی بیودیسیس کی غداری کے قائل ہیں اور جیسا کہ خود عرب مورخوں سے پتہ چلتا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ معتصم نے اسے رشوت دی تھی، تاکہ وہ اس سے مل جائے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس اثنا میں جب کہ وندو معتصم کے ساتھ خط وکتابت کر رہا تھا، عبدالوہاب بن علی نے، جو مسلمانوں کا قریب ترین افسر تھا شہر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اور یونانی ابھی خط وکتابت ہی میں مشغول تھے کہ مسلمان دھاوا کرکے شہر میں داخل ہوگئے، حالانکہ وندو کو حکم تھا

شہر فتح ہوا۔ جن معزز خاندانوں سے زر فدیہ کی بڑی رقم وصول ہونے کی اُمید تھی انہیں گرفتار کر لیا گیا، عوام الناس میں سے جو لوگ ہتھیار اُٹھانے کے قابل تھے، قتل کئے گئے، اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ شہر عموریہ کو مال و دولت سے خالی کرنے کے بعد آگ لگا دی گئی معتصم موسم سرما کے آغاز سے قبل ہی شام کی طرف واپس ہوا۔ خلیفہ کی بسرعت تمام واپسی کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے غیاب میں فوج نے اس کے بھتیجے عباس بن مامون کو خلیفہ بنانے کے لئے ایک سازش کی تھی۔ عرب مورخوں نے اس جنگ کے بعد معتصم اور بازنطینیوں کی کسی خط و کتابت کا ذکر نہیں کیا۔ یونانی مورخوں کے مطابق تھیوفلوس نے اب صلح کی درخواست کی، لیکن معتصم کی شرائط صلح ناقابل قبول تھیں اسی وجہ سے قیدیوں کا تبادلہ بھی نہ ہو سکا۔ بازنطینیوں کی حالت اب ایسی تھی کہ وہ نئے سرے سے جنگ بھی شروع نہ کر سکتے تھے، حالانکہ آئندہ سال ان کی دوسری سفارت بھی، جو خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔ بے نیل مرام واپس آ گئی تھی۔ اور صلح نہ ہو سکی تھی[1]۔

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ما قبل) لڑائی روک دی۔ جب وندو نے یہ دیکھا تو اس نے معتصم سے کہا کہ تو نے مجھ سے دھوکا کیا۔ معتصم نے اس کا جواب یہ دیا کہ تیری تمام آرزوئیں پوری کر دی جائینگی۔ اس طرح مسلمان دعا داکر کے شہر میں داخل ہوئے، ایک گرجا کو جسے عیسائی خاص طور پر مقدس سمجھتے تھے آگ لگا دی، اور یونانی سپہ سالار اعظم تے توس (   ) یا ایتوس نے بھی، جو اب تک ایک برج پر قابض تھا ہتھیار ڈال دیئے، اور خلیفہ نے اُسے تازیانہ کی سزا دی۔ وغیرہ وغیرہ۔

[1] Theophanes Contin ص ۱۲۰ اور Cedrenus ص ۱۳۰۔ مجھے اس بیان کی صداقت میں بہت شبہ ہے کیونکہ ابن اثیر اور ابن خلدون جو ہمیشہ قیدیوں کے تبادلے کا ذکر کرتے ہیں، سب سے پہلے ۲۳۱ھ میں واثق کے عہد میں اس قسم کے تبادلے کا حال لکھتے ہیں۔ حالانکہ اس دوران میں مسلمانوں اور یونانیوں میں کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی۔ عرب اور بازنطینی مورخوں کے اس متفقہ بیان کی بنا پر ہم (Bar Hebr) (ص ۱۶۳) کی سند کو کوئی وقعت نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد ۲۲۶ھ (۸۴۱ء) میں ابو سعید نے یونانی علاقہ پر ایک یورش کی، اور بہت سے قیدی پکڑ کرلے گیا۔ لیکن بعد میں ابو سعید کو یونانیوں نے گرفتار کر لیا، اور مرعش اور ملطیہ کے علاقوں کو بالکل پامال کر ڈالا۔ اس وقت تھیوفلوس نے ایک اور سفارت بہت سے تحفوں کے خلیفہ کی خدمت میں

قیصر کو فرینک قوم سے مدد کی امید تھی، جو پوری نہ ہوئی، اور بذات خود وہ اتنا کمزور تھا کہ اکیلا جنگ جاری نہ رکھ سکتا تھا۔ دوسری طرف معتصم کو اندرونی فسادوں کی بیخ کنی کرنے اور طبرستان کے رئیس کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔

سب سے پہلے اس سازش کا ذکر کردینا ضروری ہے جو عباس بن مامون کے حق میں کی گئی تھی کیونکہ افشین اور عجیف بن عنبسہ کے درمیان اسی واقعہ سے دشمنی شروع ہوئی تھی۔ افشین ماوراء النہر کے صوبہ اشروسنہ[1] کا رہنے والا تھا۔ اور اس کا تعلق قدیم ایرانی شاہی خاندان سے تھا، وہ خلیفہ کا ندیم اور معتمد علیہ تھا، اور اس سے قبل سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے مصر میں نام پیدا کرچکا تھا۔ اس کے بعد بابک کی طول وطویل جنگ کا خاتمہ اسی کے ہاتھ پر ہوا تھا۔ اب چونکہ افشین کو معتصم نے فوج کے میمنہ کا افسر مقرر کیا تھا، اس لئے اسے دوسرے سپہ سالاروں پر فوقیت حاصل ہوگئی تھی، اور فوجی کارروائیوں اور انتظام میں اُس کی بہت اہمیت تھی۔ اُس کی یہ ترقی عرب سپہ سالار عجیف بن عنبسہ کو، جسے تھوڑی سی فوج دے زبطرہ بھیج دیا گیا تھا، ناگوار گذری، کیونکہ اب فوج میں اس کی حیثیت محض ایک ماتحت افسر کی سی رہ گئی تھی۔ عجیف نے عباس کو، جسے مامون کی وفات کے بعد فوج کے ایک حصہ نے خلیفہ بنانا چاہا تھا، خلافت کا دعویٰ کرنے کے لئے اکسایا۔ اور اسے غیرت دلائی کہ وہ اپنے باپ کی وفات پر بے حس وحرکت بیٹھا رہا

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) بھیجی، اور گو اب بھی قیدیوں کا تبادلہ نہ ہوا، لیکن دونوں حکمرانوں نے بہ تراضی طرفین ایک دوسرے کو بہت سے قیدی تحفے میں پیش کئے، اور ایک صلح نامہ بھی مرتب ہوا۔ لیکن یہ سب واقعات ۲۳۱ھ (۸۴۵ء) اور ۲۴۱ھ (۸۵۵ء) میں واثق اور تھیوڈورا کے درمیان پیش آئے۔ عموریہ کے (۴۲) شہداء کی حکائت کا تعلق ان واقعات سے نہیں ہے۔ لیکن یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ روائت کے مطابق یہ شہداء سات برس یعنی ۲۲۳ھ سے ۲۳۱ھ تک قید میں رہے تھے۔ تبادلہ کے وقت غلطی سے (۴۲) عیسائی باقی رہ گئے تھے یہ سب یا تو قید ہی میں مرگئے، اور یا بیودیس کی خواہش پر اس کے حوالہ کردیئے گئے، اور اس طرح (۴۲) شہداء کی حکائت مشہور ہوگئی۔

[1] دیکھو اورلیسی ترجمہ جوبرٹ (Jaubert) ج ۲، ص ۲۰۲۔ اشروسنہ خجند اور سمرقند کے تقریباً بیچ میں واقع تھا۔ (ابن)

اور لوگوں کو معتصم کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی اجازت دے دی[1]۔ عباس بھی آخر اس سازش میں شریک ہو گیا۔ بہت سے عرب سپہ سالار ایسے تھے جنھیں ایتاخ[2] اور اشناس[3] کا عروج ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، کیوں کہ وہ غیر عرب تھے، اور محض غلامی سے ترقی کرتے کرتے سپہ سالار بن گئے تھے۔ یہ لوگ بھی اس سازش میں شریک ہو گئے۔ فیصلہ ہوا کہ جونہی موقع ملے[4] معتصم اور اُن سپہ سالاروں کو، جو اُس کے ساتھ تھے، قتل کر دیا جائے۔ چونکہ معتصم اُس وقت دریائے سلیسیا[5] کے کنارے کوچ کر رہا تھا، اور افشین کی ترک فوجیں ملطیہ کے علاقہ میں تعین اس لئے عجیف چاہتا تھا کہ فوراً کارروائی شروع کر دی جائے۔ مگر عباس باوجود حرص و طمع کے یہ نہ چاہتا تھا کہ جہاد کا اعلان ہو، کیونکہ خلیفہ کے قتل سے یقیناً خانہ جنگی شروع ہو جاتی اور فوج کے اتحاد کا خاتمہ ہو جاتا۔ محاصرۂ عموریہ کے دوران میں احمد بن خلیل اور عمر الفرغانی دونوں سپہ سالاروں کی بے حرمتی ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ معتصم افشین اور اس کی فوجوں کی بہادری کا معترف تھا، اور دوسری طرف اشناس نے ان دونوں سپہ سالاروں کو، جو اس کے ماتحت تھے، ولد الزنا کہہ دیا تھا[6]۔

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) (ورق ۱۱۰) کے مطابق افشین کوئی خاص نام نہ تھا بلکہ اشروسنہ کے رئیسوں کا عام لقب تھا۔ اس وجہ سے حیدر بن کاؤس افشین کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۸۰)۔ ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۷۶)۔

[2] ایتاخ پہلے سلام الابرش کا غلام اور باورچی تھا۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے، معتصم نے اپنے اسی باورچی کو جسے اُس نے ۱۹۹ھ میں سلام سے خرید لیا تھا بابک کے خلاف روانہ کیا تھا اس کے بعد ایتاخ رفتہ رفتہ بہادری کی وجہ سے ترکی فوج میں ترقی کرتا گیا۔ اس کا نام مختلف قلمی نسخوں میں ایتاخ، ایناخ، ایتاخ لکھا گیا ہے۔ دیکھو ابن خلکان (مطبوعہ یورپ) ج ۱۔ ص ۶۰۰۔

[3] اشناس بھی ترک تھا اس نے مامون کے عہد میں حلب کے قریب سندیس یا سندوس کا قلعہ فتح کیا تھا۔ اور وہاں کا حاکم مقرر ہوا تھا اسی مورخ نے اس قلعہ کا نام سدس بھی لکھا ہے۔

[4] ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۷۶) نے بالکل صاف لکھا ہے کہ یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جب معتصم درہ (درب) میں سے گذر رہا ہو تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ مگر ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۰) لکھتا ہے کہ یہ کام اُس وقت انجام پاتا جب کہ افشین ملطیہ سے ایشیائے کوچک جاتا، اور

احمد بن خلیل مدتوں سے عباس اور اس کے ہمدرد حرث السمرقندی سے ملا ہوا تھا، اور عمر الفرغانی بھی اس واقعہ کے بعد سازش میں شریک ہوگیا تھا۔ عموریہ کی فتح کے بعد عجیف بن عنبسہ نے انتظام کیا کہ مال غنیمت لوٹ لیا جائے وہ چاہتا تھا کہ اس طرح معتصم کے خلاف لوگوں کو بھڑکا سکے، اور عام بے چینی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مقصد حاصل کرے مگر سازش کرنے والوں کی یہ تجویز بار آور نہ ہو سکی۔ اول تو خود مفسدوں کا تذبذب سد راہ ہوا۔ اور دوسری طرف معتصم کے ذاتی تہور نے اسے پورا نہ ہونے دیا۔ معتصم نے تلوار ہاتھ میں لے کر خود امن قائم کیا اور اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔ پھر اس کے بعد خلیفہ کے حکم سے تمام مال غنیمت مساوی طور پر تقسیم کیا گیا[1] اس واقعہ کے بعد عمر الفرغانی کی بے احتیاطی سے خلیفہ کو تمام سازش کا علم ہوگیا۔ معتصم کے خدام میں ایک نوجوان شخص تھا، جس سے عمر کو بہت محبت تھی۔ مال غنیمت کے تاراج کی جو کوشش کی گئی تھی اس کے دوسرے دن شام کو عمر اس نوجوان کے ساتھ تھا۔ نوجوان نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے معتصم کو تہور اور عزم و حزم کی تعریف کی۔ عمر نے یہ سن کر اس نوجوان کو آئندہ راتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے مشورہ دیا کہ ان شور و شغب کی جگہوں سے دور رہا کرے اور جہاں تک ہو سکے خلیفہ کی امت میں رہنے سے بھی گریز کرے۔ عمر اور احمد کی واپسی کے بعد چونکہ ان دونوں نے اشناس کے ہاتھوں اپنے بے حرمتی کی اکثر شکایت کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں کسی دوسرے سپہ سالار کے ماتحت کر دیا جائے اس لئے اس نوجوان کو عمر کے لفظ آگئے، اور اس نے خلیفہ کو اس کی اطلاع کر دی۔ خلیفہ نے اس کا علم ہوتے ہی عمر کو اپنے پاس بلایا، اور اس سے پوچھا کہ اس نے شور و شغب کی رات کو نوجوان سے کیا کہا تھا۔ عمر اس وقت اتنا مدہوش تھا کہ اسے معلوم تک نہ ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے اس شام کی تمام گفتگو خلیفہ کے سامنے دہرا دی۔ معتصم نے عمر کو

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) اس کے بعد انقرہ پہنچا، جہاں خلیفہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۹)۔

[2] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۸۰) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۵) نے صاف لکھا ہے کہ عباس مال غنیمت کی لوٹ برپا کرتا اور اسی دوران میں معتصم کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

اتیاخ کے پاس نظر بند کر دیا۔ جب احمد نے یہ سنا تو اس نے خلیفہ کی خدمت میں باریابی کی درخواست کی اور چونکہ اشناس مانع ہوا اس نے حرث السمرقندی سے اس سازش کے متعلق جو کچھ سنا تھا اشناس کو بتا دیا۔ اب حرث کو گرفتار کیا گیا اس نے جرم کا پورا پورا اقبال کیا، اور تمام مفسدوں کے نام بھی بتلا دیئے۔ لیکن اس سازش میں شریک ہونے والے افسران فوج کی تعداد اتنی تھی کہ معتصم کو یقین نہ آیا، اور اس واقعہ کی صداقت معلوم کرنے کے لئے اس نے عباس کو خوب شراب پلائی، اور پھر بہت سے وعدے کر کے حقیقت حال دریافت کی حرث نے جو کچھ کہا تھا عباس نے اس کی توثیق کی۔ اب معتصم کو اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ اس نے فوراً مجرموں کو یکے بعد دیگرے گرفتار کیا۔ ان میں سے چند کو موت کی سزا دی گئی، اور بعض کو زنجیروں سے جکڑوا کر وحشی درندوں کے سامنے ڈال دیا گیا۔ خلیفہ کا بھتیجا عباس افشین کے سپرد کیا گیا۔ جس نے اسے منبج میں قید کیا، اور کھانے کو پیٹ بھر کر دیا، مگر پیاسا مار ڈالا۔ یہی انجام عجیف بن عنبسہ کا ہوا۔ عمر الفرغانی کو نصیبین میں زندہ دفن کرا دیا گیا۔ باقی ماندہ مجرم افسران فوج قتل ہوئے۔ اس وقت سے عباس کو لعین کہا جانے لگا۔ اس کے سب بھائی بہنوں کو بھی قید کر دیا گیا۔ صرف حرث کو خلیفہ نے معافی دی کیونکہ اسی نے سب سے پہلے سازش کی پوری اطلاع خلیفہ کو دی تھی۔

خلیفہ معتصم کے خلاف اس گہری سازش کا یقیناً ایک نتیجہ یہ تھا کہ فوج کو نئے سرے سے ترتیب دینا ضروری سمجھا گیا۔ خلیفہ نے اس کا بخوبی اندازہ کر لیا کہ عرب رئیسوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور ان کو بے دخل کر کے فوج کا انتظام ترکوں اور ایرانیوں کو سپرد کرنا لازمی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نو دولت اجنبی غلاموں میں بھی بہت دیر تک امن و امان اور یگانگت باقی نہ رہی۔ رشک و حسد، بلند نظری، مال و دولت کا لالچ، اور قوت و طاقت حاصل کرنے کے جذبات نے ان کے دلوں کو مسحور کر لیا۔ چونکہ یہ لوگ ملک و ملت میں اجنبی تھے اس لئے انہوں نے ان کی بہبود کی مطلق پرواہ نہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اب عہد خلافت کے اس المناک دور تک پہنچ گئے ہیں جب واقعات عموماً سیاسی یا مذہبی تخیلات کی وجہ سے پیش نہ آتے تھے اور خلیفہ کی ذات بھی قا [illegible] اب واقعات کا سرچشمہ وہ مختلف سازشیں اور فتنے ہیں جو مختلف صوبوں کے والی،

کرتے رہتے تھے۔

افشین کو عبداللہ بن طاہر کے والی خراسان ہونے پر حسد تھا۔ اُس نے طبرستان کے اسپہبد، مازیار بن قارن، کو خلیفہ کے خلاف بغاوت برپا کرنے پر اکسایا، اور وعدہ کیا کہ وہ اپنی فوج سمیت اُس سے مل جائیگا کیونکہ افشین سمجھتا تھا کہ جب حالت نازک ہوجائیگی تو اسی کو بڑی زبردست فوج دے کر مازیار کے خلاف بھیجا جائیگا۔ اور فتح پانے کے بعد عبداللہ بن طاہر کو آسانی سے بے دخل کیا جاسکیگا۔ مازیار خود بھی بغاوت پر آمادہ تھا، کیونکہ فتح طبرستان کے بعد خلیفہ اور مازیار کے درمیان عبداللہ بن طاہر حائل تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ والی خراسان ہونے کی حیثیت سے عبداللہ طبرستان کا بھی والی تھا، مگر مازیار کو یہ گوارا نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا تعلق خلیفہ سے رہے، اور وہ اپنا خراج بجائے خراسان بھیجنے کے براہ راست خلیفہ کو ادا کیا کرے۔ دوسری طرف افشین اور عبداللہ بن طاہر میں بھی ان بن تھی۔ بابک کے خلاف فوج کشی کے دوران میں افشین بڑی بڑی سرکاری رقمیں ہضم کرکے اپنے وطن اشروسنہ بھیجا کرتا تھا، اور عبداللہ اس کی اطلاع ہمیشہ خلیفہ کو دیتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ یہاں تک ہوا کہ افشین نے ایک رقم چند آدمیوں کے ہاتھ اشروسنہ بھیجی۔ ان لوگوں کو عبداللہ نے چوروں کے بہانہ سے گرفتار کیا، اور جو رقم ان کے ساتھ تھی اُسے اپنی فوج میں تقسیم کردیا۔ بہرکیف مازیار بن قارن کی یہ بغاوت اتنی خطرناک تھی کہ خوف تھا کہ اس کی وجہ سے تمام آذربائیجان اور شمالی میسوپوتامیا میں آگ لگ جائے گی۔ مگر عبداللہ بن طاہر اسے فرو کرنے اور ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ دوسری طرف خود طبرستان میں ایک زبردست فریق مازیار کا مخالف تھا کیونکہ وہ خانہ جنگی برپا کرلے، اور اپنے پیشرو کو قتل کرنے کے بعد اسپہبد کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ خلیفہ کی اطاعت سے

طبری (ج ۶۔ ص ۱۸۲)۔ ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۵)۔

(۱۸۸) ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۸)۔

فتح ہوا۔ مہدی کے زمانہ میں ۱۶۷ھ میں یہاں کے دو رئیسوں، ونداہرمز اور شروین نے شورش پھیلائی

...ر کے عہد خلافت میں مہرویہ الرازی کو طبرستان کی ولایت سے معزول کرکے اُس کی

انحراف کرنے کے بعد مازیار نے اپنی رعایا سے خود مختار بادشاہ ہونے کی حیثیت سے وفاداری کی دوبارہ قسمیں لیں اور اس خیال سے کہ وہ اپنی قسموں سے پھر نہ جائیں اُن سے یرغمال حاصل کئے اس کے علاوہ جنگ کی تیاری کے لئے ان پر بھاری محصول لگائے جو شہر میدان میں واقع تھے، اور جن کے متعلق اسے یہ خیال تھا کہ وہ انہیں محفوظ نہ رکھ سکیگا، ان کی فصیلیں سمار کرادیں اور باشندوں کو مجبور کیا کہ وہ کوہستان میں پناہ لیں۔ اس طرح اس نے آمُل اور ساریہ کے باشندوں کو ان دونوں شہروں کے درمیان ایک کوہستانی مقام ہرمزآباد[1] میں منتقل کیا۔ مزید برآں اس نے طمیس[2]، آمُل اور ساریہ کی فصیلیں بھی منہدم کرادیں۔ ایک فصیل جو بحیرۂ خزر تک پھیلی ہوئی تھی، اور جسے ایرانیوں نے ترکوں کی یورشوں سے محفوظ رکھنے کے لئے تعمیر کرایا تھا، اس کی مرمت کرائی۔

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) جگہ پہلے عبداللہ بن سعید کو، اور پھر عبدالملک بن مالک کو یہاں کا والی بنایا گیا۔ سنہ ۲۰۱ھ میں مامون کے زمانہ میں عبداللہ بن خرداد بہ طبرستان کے کوہستانی علاقوں پر قابض ہوا۔ اور وہاں کے رئیس، شہریان (یا شہریار) بن شروین کو مجبور کیا کہ وہ میدانوں میں رہے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک اور شہزادہ مازیار بن قارن ونداہرمز، کو مامون کے پاس بھیج دیا۔ سنہ ۲۱۰ھ میں جب محمد بن موسیٰ بن حفص طبرستان کا والی تھا۔ شہریار بن شروین نے، جو طبرستان کے کوہستانی علاقہ کا مالک تھا، وفات پائی اس کا بیٹا سابور اس کا جانشین ہوا۔ مگر مازیار بن قارن نے بغاوت کی، اور سابور کو برطرف کر کے طبرستان کا مالک بن گیا۔ یہ تمام واقعات ابن اثیر اور ابن خلدون نے مختلف سنین کے تحت نقل کئے ہیں۔

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۸۳) ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۵، ۲۶۶) ابن خلدون نے اس مقام کا نام ہرمزیار لکھا ہے۔

[2] ادریسی (ج ۲۔ ص ۱۷۰، ۱۷۱) طمس یا طامس نام ایک شہر کا ذکر کیا ہے، جو طبرستان میں واقع تھا۔ ادریسی کے فرانسیسی مترجم جوبرٹ نے اس کا نام ایک مرتبہ تمیش اور دوسری دفعہ تمیسنا لکھا ہے۔ لاطینی ترجمہ میں تیسم ( ) ہے ادریسی کی تحریر کے مطابق طمس ساریہ اور استرآباد کے درمیان راستہ میں واقع تھا، اور استرآباد سے ساریہ جاتے ہوئے یہ مقام سب سے پہلے آتا تھا، ابن خلدون کہتا ہے کہ طمس جرجان کی سرحد پر تھا۔ اسی سے ہم قدیم قلعبند فصیل کے جائے وقوع کا اندازہ کر سکتے ہیں دوسرے مصنفوں نے بھی اس فصیل کا ذکر کیا ہے، اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ فصیل کسی زمانہ میں ضرور موجود تھی۔

عبداللہ بن طاہر نے اپنے چچا حسن بن حسین کو ایک زبردست فوج دے کر جرجان (فارسی. گرگان) کی طرف روانہ کیا، تاکہ وہ اس طرف سے مازیار کا راستہ روک دے. عبداللہ نے اپنے آزاد کردہ غلام حیان بن جبلہ کے ساتھ چار ہزار آدمی قومس کے راستہ سے کوہستان شروین[1] بھیجے. خود معتصم نے حکم دیا کہ ایک فوج براہ رے دنباوند[2] روانہ کی جائے، تاکہ جنوب مغرب کی طرف سے مازیار پر حملہ آور ہو. باوجود ان حملوں اور تیاریوں کے مازیار اگر اپنی رعایا کی خوشنودی اور وفاداری حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو طبرستان کے ناقابل گذر پہاڑوں میں وہ مدت تک خلیفہ کی فوجوں کا مقابلہ کر سکتا تھا. لیکن اس نے اپنے آپ کو ظالم و جابر ثابت کیا، اور لوگ اس سے متنفر ہو گئے. نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے لوگوں نے دغابازی سے کام لینا شروع کر دیا. پہلے مازیار کی فوج، جو اس کے سپہ سالار سرخاستان کی سرکردگی میں ان خندقوں کی حفاظت کے لئے مقرر کی گئی جو طمس اور سمندروں کے درمیان واقع تھیں، حسن بن حسین سے مل گئیں. اور سرخاستان اور اس کے بھائی کو حسن کے حوالہ کر دیا اس کے بعد ہی مازیار کے چچازاد بھائی قارن[3] بن شہریار نے جس کا باپ کسی زمانہ میں طبرستان کا مالک رہ چکا تھا،

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) دیکھو رٹر (RITTER) کی کتاب (ERDKUNDE) ج ۸. ص ۳۵۹. ابوالفدار (جغرافیہ ص ۴۳۴) نے طبرستان کے مشرقی شہر کا نام تمیشہ لکھا ہے.

[1] شروین غالباً کوہستان البرز کے جنوب مشرقی حصہ کا نام ہے.

[2] ابن اثیر (ج ۶. ص ۱۸۳) مطبوعہ نسخہ میں دنباوند ہی ہے) اور ابن خلدون (ج ۳. ص ۲۶۶. مطبوعہ نسخہ میں دنباوند ہی ہے). نے صاف طور پر دنباوند لکھا ہے، دماوند نہیں لکھا، حالانکہ عام طور پر اک پہاڑ پر دماوند ہی کہتے ہیں. ادریسی (ج ۲. ص ۱۰۶، ۱۸۰) نے بھی دماوند ہی لکھا ہے. ابن خلکان نے، ابوبکر الشبلی کے ترجمہ میں دمباوند (درحقیقت دنباوند ہے مگر دمباوند پڑھا جاتا ہے) لکھا ہے، اور بیان کیا ہے کہ بہت سے لوگ رے کے علاقے کے اس شہر کو دماوند کہتے ہیں، لیکن اس کا صحیح املا دنباوند ہی ہے یہی بیان ابوالفدار (جغرافیہ ص. ۴۱۱) کا ہے. خیال رکھنا چاہیے کہ دنباوند اور دنیاوند دونوں ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں لہٰذا نقلوں کا فرق ہوتا ہے. اسی وجہ مختلف قلمی نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے.

حیان بن جبلہ سے خط وکتابت شروع کی اور کہا کہ اگر اس کے آبار و اجداد کی ریاست اُسے دینے کا وعدہ کر لیا جائے تو وہ کوہستان شروین اور شہر ساریہ حیان کے حوالہ کر دیگا۔ حیان نے اس کی اطلاع عبداللہ بن طاہر کو دی، اور اُس نے یہ شرط منظور کر لی۔ قارن بن شہریار نے بہت سے فوجی افسروں اور مازیار کے بھائی عبداللہ بن قارن کو جو اس نواح کا سپہ سالار تھا، کھانے کی دعوت دی، اور انہیں گرفتار کر کے حیان کے حوالہ کر دیا۔ اس کے بعد حیان نے کوہستان شروین اور ساریہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ خود مازیار کے ایک بھائی قوھیار نے قارن کی پیروی کی۔ بغاوت کے آغاز میں عرب والی محمد بن موسیٰ بن حفص گرفتار کر لیا گیا تھا۔ قوھیار نے اسے رہا کر کے حیان کے پاس بھیج دیا۔ اس کے صلہ میں اس نے استدعا کی کہ کوہستانی علاقہ کی حکومت، جو اس سے قبل ان کے آبار و اجداد کے ہاتھ میں تھی، اُسے دے دی جائے، اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے بھائی کو بھی حیان کے حوالہ کر دیگا۔ ممکن تھا کہ اس تجویز کو فوراً قبول کر لیا جاتا۔ مگر حیان نے بے احتیاطی سے قوھیار کے ایک قاصد کا گھوڑا چھین لیا۔ اور قوھیار نے قسم کھائی کہ وہ ایسے شخص کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ نہ کریگا۔ چنانچہ قوھیار مقررہ دن کو حیان کے پاس نہ آیا، اور حسن بن حسین سے خط وکتابت شروع کی۔ حسن بسرعت تمام خرم آباد پہنچا، جہاں قوھیار نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ان تمام باتوں کی توثیق کی جن کا وعدہ حیان نے قوھیار سے کیا تھا۔ اب اس نے اپنے بھائی مازیار کو یقین دلایا کہ اس کے پاس مازیار کے لئے خلیفہ کے پاس سے معافی نامہ آچکا ہے ان باتوں پر اعتبار کر کے آخر مازیار ایک رات خود عربوں کے عسکر میں آگیا[1]

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) [3] یہ ابن اثیر (ج ۶ ص ۲۶۶) کا بیان ہے۔ ابن خلدون (ج ۳ ص ۱۸۴) نے قارن بن شہریار کو مازیار کا بھتیجا بتایا ہے (ابن اثیر اور ابن خلدون دونوں نے قارن کو مازیار کا بھتیجا ہی لکھا ہے) مگر یہ غلط ہے۔ قارن غالباً اس شاپور یا سابور کا بھائی تھا، جسے مازیار نے حکومت سے برطرف کیا تھا۔

[1] یہ ابن اثیر (ج ۶ ص ۲۶۷) اور ابن خلدون ج ۳ ص ۱۸۴، ۱۸۵) کا بیان ہے ابن خلدون نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے۔ ایک بیان کے مطابق مازیار کے ایک چچا زاد بھائی نے دغا کی۔ یہ شخص طبرستان کے تینوں پہاڑوں کی حکومت کا حقیقی دعویدار تھا، اور مازیار کو صرف میدانی علاقوں پر حکومت کرنے کا حق تھا۔ مگر مازیار نے اپنے اس چچا زاد بھائی کو اس کے علاقے سے بے دخل کر دیا تھا۔ اب

ان لوگوں نے اُسے اُنہیں زنجیروں میں جکڑا جو اس نے اپنی خود مختاری کے اعلان کے وقت خلیفہ کے مقرر کردہ والی محمد بن موسیٰ بن حفص کو مقید کرنے میں استعمال کی تھیں اس طرح مازیار کو گرفتار کرنے کے بعد دنیا وند کا فوجی افسر محمد بن ابراہیم اسے لے کر سامرہ گیا، جہاں اسے بابک کے پہلو بہ پہلو مصلوب کیا گیا۔ لیکن مازیار کا بے شمار خزانہ خلیفہ کے ہاتھ نہ آیا۔ کیونکہ قوہیار اپنی غداری کے بعد جب یہ خزانہ عربوں کی فوج میں لے جارہا تھا تو مازیار کے مملوکوں نے اُسے قتل کردیا۔ اور خزانہ آپس میں تقسیم کرکے دیلم بھاگ گئے

طبرستان کی یہ بغاوت ۲۲۵ھ میں ختم ہوئی لیکن اس کے دوران میں ایک اور شورش آذربائیجان میں ہوئی۔ اس میں بھی افشین کا ہاتھ تھا، یا کم از کم اس کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی تھی۔ تفصیل یہ ہے کہ بابک کی جنگ کے خاتمہ پر خلیفہ نے افشین کو آذربائیجان کا والی مقرر کیا تھا۔ یہاں وہ خود نہیں گیا، بلکہ اپنے ایک رشتہ دار کو جس کا نام منکجور تھا[1]۔ بطور نائب بھیج دیا۔ منکجور نے خلیفہ کو اطلاع دی، بغیر بابک کے خزانہ پر قبضہ کرلیا۔ اور رجب صاحب البرید نے اس کی اطلاع خلیفہ کو دی، تو اُسے قید کردیا۔ اور چاہتا تھا کہ اسے قتل کردے۔ اُدھر جب اہل اردبیل نے منکجور کی

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) جب مازیار نے عربوں کی اطاعت سے انحراف کیا تو اس نے اپنے برادر عم زاد کو میدانی علاقے سے بلایا، اور اس اُمید پر کہ وہ عربوں کے خلاف اس کی مدد کریگا اسے ایک بڑے عہدے پر فائز کیا۔ لیکن اس شخص نے حسن کے ساتھ خط و کتابت شروع کردی، اور افشین اور مازیار کے آپس میں جو نامہ و پیام ہوا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ اگر اس کے باپ کا علاقہ اُسے واپس دینے کا یقین دلا دیا جائے تو وہ مازیار کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ خلیفہ مامون کے وزیر حسن بن سہل نے طبرستان کی حکومت مازیار کے سپرد کی تھی، اور مازیار نے اپنے چچا زاد بھائی کو اس کوہستانی سرزمین سے، جس پر وہ حکمران تھا، بے دخل کردیا تھا۔ حسن بن حسین نے عبداللہ بن طاہر کی ایک تحریر اس کے حوالہ کی جس میں اس کے تمام دعووں کی توثیق کی گئی تھی اور اُنھیں تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے دریائے کو غیر محفوظ چھوڑ دیا، اور عربوں نے مازیار کا محاصرہ کیا تاوقتیکہ اس نے اپنے آپ کو ان کے حوالہ کردیا۔ ایک اور بیان کے مطابق اُسے شکار میں قید کیا گیا تھا۔ (ابن خلدون۔ ج ۳۔ ص ۲۶۷)

[1] ابن اثیر ج ۔ ص ۱۸۶ (مطبوعہ نسخہ میں منکجور ہی ہے) نے اس کا یہ نام لکھا ہے۔ مگر ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۰) اُسے منکجوار کہتا ہے۔

حفاظت کا ذمہ نہ لیا تو وہ ان سے بھی لڑنے کے لئے تیار ہوگیا۔ ایسی حالت میں معتصم نے افشین کو مجبور کیا کہ وہ منکجور کو آذربائجان سے واپس بلالے، اور چونکہ منکجور نے اطاعت سے انحراف کیا اس لئے خلیفہ نے بغا ترکی کو فوج دیکر اس کے خلاف بھیجا۔ بغا نے اسے اردبیل سے نکال دیا۔ پھر منکجور نے بابک کے ایک قلعہ پر، جسے اس نے دوبارہ مستحکم کر لیا تھا، قبضہ کرکے وہاں پناہ لی، لیکن مازیار کی طرح اس کے چند ساتھیوں نے غداری کی اور ۲۲۵ھ میں اُسے بغا کے حوالہ کر دیا۔ بُغا اُسے سامرہ لے آیا، جہاں اُسے قید کر دیا گیا۔[۱]

یہ دونوں شورشیں اور افشین کے خلاف عبداللہ بن طاہر کے الزامات درحقیقت افشین کی نکبت کا باعث بنے۔ افشین کو اس کا بخوبی علم تھا، اور اسی بنا پر اُس نے یہ تدبیر کی کہ ارمینیہ بھاگ جائے، کیونکہ یہ علاقہ بھی اس کی حکومت میں شامل تھا، اور پھر وہاں سے بحیرۂ خزر کو عبور کرکے اپنے وطن اشروسنہ چلا جائے۔ لیکن بہت جلد اُسے محسوس ہوا کہ معتصم کے جاسوس سایہ کی طرح اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، اور ان سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے ایک عظیم الشان ضیافت ترتیب دی، جس میں اُس نے ان تمام بڑے بڑے آدمیوں کو جن کی جاسوسی سے وہ خائف تھا بلایا۔ اُسے اُمید تھی کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر وہ بچ کے نکل جائیگا۔ لیکن بدقسمتی سے اُسی دن اُس نے اپنے ایک غلام کے ساتھ ایسا بے رحمی کا سلوک کیا کہ اس غلام نے افشین کی تمام تجویزیں من وعن ایتاخ سے بیان کردیں۔ ایتاخ نے خلیفہ کے حکم سے افشین کو گرفتار کر لیا۔[۲] لیکن افشین کی گرفتاری کو اس کے بیٹے حسین کی گرفتاری تک

---

[۱] ایک اور بیان کے مطابق منکجور نے بغا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ یہ غالباً اس وقت ہوا جب اس کے ساتھی اُس سے منحرف ہوچکے تھے۔

[۲] یہ ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۸) کا بیان ہے۔ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۸۹) کے مطابق افشین چاہتا تھا کہ خلیفہ اور تمام فوجی افسروں کو زہر دے دے۔ لیکن اس کے ایک دوست اداجن الاشروسنی نے اس قسم کی شقاوت کی علانیہ مخالفت کی۔ ایک ملازم نے جو اُن کی باتیں سُن رہا تھا افشین کو اس کی اطلاع کر دی، اور افشین نے چاہا کہ اداجن کو قتل کر دیا جائے۔ اداجن کو یہ تجویز ایک دوسرے نوکر کی زبانی معلوم ہوگئی۔ وہ فوراً معتصم کے پاس گیا اور سازش کا پورا حال اس سے کہہ دیا۔ لیکن جیسا کہ افشین کے مقدمہ کے حالات سے

رازمیں رکھا گیا۔ حسین ماوراالنہر کا والی تھا، اور افشین کی طرح اس کے پاس بھی موالی کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ خلیفہ نے عبداللہ بن طاہر کو لکھا کہ کسی طرح دہوکے سے حسین کو گرفتار کیا جائے۔ چنانچہ عبداللہ نے حسین کو بخارا کا والی بنایا، اور اس کے ساتھ فوج میں اسد کو جو اس وقت بخارا کا والی تھا لکھا کہ حسین کو گرفتار کر کے اُس کے پاس بھیج دے[1]۔ اب چونکہ اس کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے افشین پر باضابطہ طور سے غداری کا الزام لگایا گیا۔ لیکن چونکہ غداری کی کافی شہادت موجود نہ تھی، اور معتصم چاہتا تھا کہ افشین کے بڑے بڑے موالی کو، جن پر اُس کی طاقت کا انحصار تھا، جرم کا یقین دلادے اس لئے افشین کے اسلام سے انحراف کو بھی جرموں کی فہرست میں شامل کیا گیا افشین کا مقدمہ سننے کے لئے ایک خاص عدالت قائم کی گئی۔ اس عدالت کی کارروائی اس قدر تفصیل سے ہم تک پہنچی ہے کہ ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام کے پہلو بہ پہلو اس وقت ایرانیوں کا قدیم مذہب بھی باقی تھا، اور ماوراالنہر میں اس کے پیرو علانیہ طور پر موجود تھے۔ قاضی احمد ابن ابی داؤد، وزیر عبدالملک بن الزیات اور تمام بڑے فوجی اور شہری افسروں کے سامنے عدالتی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے سُغد کے رہنے والے دو مستغیث عدالت کے آئے۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ ان میں سے ایک مسجد کا امام اور دوسرا موذن ہے اور انھیں افشین نے ان کے وطن میں چابکوں کی سزا دی تھی۔ چنانچہ اُن کے بدن پر اس سزا کے نشان اس وقت تک موجود تھے۔ ابن الزیات نے افشین سے اس سزا کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا کہ ان دونوں نے ایک معبد کو جبراً مسمار کر کے مسجد بنا لیا تھا اور اسی لئے میں نے انھیں سزا دی تھی، کیونکہ عہد نامہ کے مطابق یہ معبد اہل شہر کے لئے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ ابن الزیات نے پوچھا کہ وہ مطلا و مرصع کتاب کیا ہے جو تمہارے گھر میں موجود ہے، اور جو بے دینی کی تعلیم دیتی ہے، افشین نے جواب دیا کہ وہ کتاب مجھے میرے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملی تھی، اور اس سے مجھے خالص اخلاق کے سبق لیتے ہیں

(ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ماقبل) (بقیہ حاشیہ) ابن اثیر کا یہ بیان بہت کم قابل وثوق ہے، اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ افشین کو ملزم ثابت کر دیا جائے۔ زہر دینے کی تجویز بھی قابل اعتماد نہیں۔ اس تجویز کے مشہور کرنے سے غالباً مقصد یہ تھا کہ افشین کو موت کی سزا دی جا سکے۔

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۹)۔ ابن خلدون (ج ۳ ص ۲۶۸)۔

جیسی ملا، ومرصع وہ مجھے ملی تھی ویسی ہی اب تک ہے، میں نے اس سے صرف اخلاق سیکھا، اور اس کی بے دینی کی باتوں پر توجہ نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں نے کسی طرح اسلام سے انحراف نہیں کیا۔ اب ایک موبد عدالت کے سامنے حاضر ہوا، اس نے اظہار دیا کہ افشین مختنقہ جانوروں کا گوشت کھاتا ہے[لہ]۔ بلکہ اس نے اُسے بھی یہ گوشت کھانے کی ترغیب دلائی تھی، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ ایسا گوشت ذبح کئے ہوئے جانور کے گوشت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے اس کے علاوہ اس نے ایک دن یہ بھی کہا تھا کہ میں نے جبراً عربی پڑھی، زیتون کا تیل استعمال کیا اور جوتا پہنا، لیکن باوجود اس کے مسلمان مجھے ختنہ کرانے پر مجبور نہ کرسکے۔ افشین نے قاضی کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ ایک مسلمان کے مقابلے میں بے دین مجوسی کی شہادت سننا کہاں تک جائز ہے[لہ]۔ موبد کے بعد سُغد کا ایک رئیس عدالت میں آیا، اور اس نے افشین سے پوچھا کہ آیا اشروسنہ کے باشندے اسے خدا یعنی اللہ کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں یا نہیں۔ افشین نے کہا یہ درست ہے لیکن اس کا باعث محض یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے روسار کو اسی لفظ سے مخاطب کرنے کے عادی ہیں، اور میں نے انہیں اس وجہ سے منع نہیں کیا کہ کہیں وہ میری اطاعت سے انحراف نہ کر بیٹھیں اب قیدی مازیار نے اظہار دیا کہ افشین کے بھائی نے افشین کی طرف سے اس کے بھائی نے افشین کی طرف سے اس کے بھائی قوہیار کو لکھا تھا کہ ہمارا قدیم مذہب بابک، تمہارے اور میرے ذریعہ دوبارہ زندہ ہوسکتا ہے لیکن بابک کو چونکہ میری مدد حاصل نہ تھی اس لئے وہ اپنی جہالت سے مغلوب ہوگیا اب تم بغاوت برپا

لہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہودیوں کی طرح مسلمان بھی ایسے جانوروں کا گوشت حرام سمجھتے ہیں جسے چھری سے ذبح نہ کیا گیا ہو، اور ذبح کرتے وقت خدا کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اسی وجہ سے یہودیوں کی طرح دیندار مسلمان عیسائیوں کا تیار کیا ہوا گوشت کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ چنانچہ مشرق میں جب کوئی عیسائی اپنے مسلمان دوست کی دعوت کرتا ہے تو کھانا پکانے کے لئے مسلمان باورچی تلاش کرتا ہے۔

لہ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۹۰) لکھتا ہے کہ یہ موبد اس وقت تک مجوسی تھا، اور آخر خلیفہ متوکل کے زمانہ میں مسلمان ہوا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایرانی موبد اس خلیفہ کے دربار میں بھی موجود تھا جس نے حضرت امام احمد بن حنبل کو اس وجہ سے تازیانہ کی سزا دی تھی کہ انہوں نے قرآن شریف کے متعلق دربار کے علماء سے اختلاف کیا تھا۔

میرے سوار تمہارے مقابلے کے لئے کسی اور کو نہیں بھیجا جائیگا، اور میں اپنے بہادر سپاہیوں سمیت تم سے مل جاؤنگا اور اس طرح ہم دونوں عربوں، اہل افریقہ اور ترکوں سے لڑینگے۔ عرب محض کتے ہیں، اور صرف چند ٹکڑوں سے بہلا کر ان کا سر کاٹا جا سکتا ہے۔ مغاربہ پلک مارتے تباہ کئے جاسکتے ہیں۔ رہ گئے ترک وہ اسی وقت تک مقابلہ کرینگے جب تک اُن کے پاس تیر باقی رہیں، اس کے بعد انہیں رسالہ فوج سے روند کر ختم کر دیا جائیگا۔ پھر پرانی ایرانی سلطنت کے زمانہ کی طرح ہمارا مذہب دوبارہ زندہ ہو جائیگا۔ اس الزام کا جواب افشین نے دیا کہ وہ اپنے بھائی کی ایسی تحریر کا جو اس کی رضامندی کے بغیر لکھی گئی ہو۔ جوابدہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اور اگر خود اس نے یہ تحریر لکھی بھی ہوتی تو اس کا مقصد اس سے صرف یہ تھا کہ ایک نئی فتح حاصل کر کے خلیفہ کے وقار و طاقت میں اضافہ ہو جائے۔ جیسا کہ اس موقع پر عبداللہ بن طاہر کی مہم میں پیش آیا۔ بہرکیف قانوناً افشین کو موت کی سزا دینا ناممکن تھا۔ اُسے دوبارہ بغا کی نگرانی میں نظربند کیا گیا، مگر کھانا اتنا کم دیا گیا کہ آخر اس نے ماہ شعبان ۲۲۶ھ میں فاقوں سے وفات پائی مرنے کے بعد اس کے گھر سے ایک بت، اور پارسی مذہب کی ایک کتاب برآمد ہوئی۔ اس کی پاداش میں لاش کو مصلوب کرنے کے بعد جلا دیا گیا[1]۔ معتصم نے غالباً افشین کے خلاف مازیار کی فیصلہ کن شہادت کا منتظر تھا کیونکہ عدالت میں اظہار دینے کے بعد مازیار کو ڈنڈے مار کر ہلاک کر دیا گیا اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

---

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ص ۱۹۰) افشین نے اپنی موت سے قبل معتصم سے کہا تھا کہ: "میری مثال ایک بچھڑے کی سی ہے جسے کوئی شخص نہایت احتیاط سے پالے پوسے مگر اس کے دوست اس بچھڑے کا گوشت کھانا چاہتے ہوں۔ یہ شخص بچھڑے کو ذبح کر کے دوستوں کی آرزو پوری نہیں کرتا۔ آخر دوست یقین دلاتے ہیں کہ یہ درحقیقت بچھڑا نہیں بلکہ شیر ہے، اور بڑا ہو کر اپنی جنس میں مل جائیگا دوسرے اس رائے کی تصدیق کرتے ہیں، یہاں تک کہ آخر وہ شخص اس بچھڑے کو ذبح کر ڈالتا ہے" (ابن اثیر ج ۶۔ص ۱۹۱) ابن خلدون نے ایک روایت نقل کی ہے (ج ۳۔ص ۲۶۹) کہ افشین کو قتل کیا گیا تھا۔ لیکن یہ اغلب نہیں۔ کم از کم اتنا معلوم ہے کہ عدالتی اظہار کے بعد مازیار کو ۲۲۵ھ میں قتل کی سزا دی گئی تھی، اور اس کے برعکس افشین نے شعبان ۲۲۶ھ میں وفات پائی تھی اثبات جرم کے بعد اُسے اتنے دن تک زندہ چھوڑنا اور پھر قتل کرنا ناممکن ہے۔ معتصم غالباً اس کے قتل کی ہمت نہ کر سکتا تھا، اور اسی لئے اس نے آہستہ آہستہ مارا۔

افشین کا مقدمہ باضابطہ عدالت میں پیش ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ معتصم کے انصاف کا دلدادہ تھا، بلکہ درحقیقت وہ افشین کے بے شمار سوالی سے خائف تھا، اور چاہتا تھا کہ انھیں ظاہری طور پر عدل و انصاف کا یقین دلادیا جائے بہیت مجموعی معتصم اپنے پیشرو خلفاء کے مقابلہ میں کچھ کم مطلق العنان نہ تھا۔ عدالت تمام تر خلیفہ، اور اس کے بعد اس کے وزیر اور سپہ سالار اور پھر قاضی اور قاضی القضاۃ کے زیر اقتدار تھی، حالانکہ معتصم قاضی القضاۃ محمد ابن ابی داؤد کی بہت عزت کرتا تھا اور قاضی کو خلیفہ پر بہت اثر حاصل تھا۔ اس کی ہم آئندہ ایک مثال بھی دینگے۔ مگر اس سے پہلے دو بغاوتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے یہ دونوں بغاوتیں معتصم کے عہد میں شروع ہوئیں، لیکن ان میں سے ایک اُس کی وفات کے بعد فرو ہوئی اسی وجہ سے وہ اس میں زیادہ دخل نہ دے سکا۔ اس کے علاوہ معتصم نے یونانیوں کے خلاف ایک نئی جنگ بھی لڑی۔

موصل کے صوبہ میں کردوں نے جمع ہوکر جعفر بن فہر جس کو اپنا افسر بنایا تمام صوبے کے اوباش اور بدقماش لوگ اس کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد جان و مال غیر محفوظ ہوگئے، اور باقاعدہ حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ان لوگوں نے شمالی میسوپوتامیا تک قتل و غارت کا سلسلہ جاری کیا۔ آخر معتصم نے ایک فوج کی اور عبداللہ بن السید (بن انس الازدی) کی سرکردگی میں اسے باغیوں کے خلاف بھیجا۔ عبداللہ نے باغیوں کو ایک زبردست شکست دی، اور ماتعیس سے جہاں انھوں نے اپنی چھاؤنی بنائی تھی نکال دیا۔ شکست کھاکر باغی کوہستانی علاقے میں پناہ گزیں ہوگئے، اور عبداللہ بھی بلا سوچے سمجھے، عقب کی حفاظت کا انتظام کئے بغیر ان کے پیچھے پہاڑ میں داخل ہوا۔ قبل اس کے کہ اسے خطرہ کا احساس ہو، اس نے دیکھا کہ وہ ایک گھاٹی میں دشمنوں سے گھر گیا ہے۔ اس نے چاہا کہ دشمنوں کو تلوار سے کاٹ کر راستہ بنائے۔ لیکن اس کوشش میں اُس کے بہت سے آدمی یا تو کردوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور یا ان پتھروں سے کچلے گئے جو دشمن نے پہاڑوں پر سے لڑھکائے تھے۔ اس ناکامی کے بعد معتصم نے ایک نئی فوج موصل بھیجنے کے لئے تیار کی، اور آئندہ سال یعنی ۲۲۶ھ (۸۴۱ء) میں ایتاخ نے، جو عبداللہ کی جگہ سپہ سالار مقرر ہوا تھا، کوہ دسیر کی ایک جنگ میں باغیوں کے سرکردہ جعفر کو

قتل کیا اور بغاوت فرو کی۔[1]

میسوپوتامیا میں امن و امان قائم ہوا ہی تھا کہ فلسطین ایک خطرناک بغاوت کا میدان بن گیا۔ یہاں اب تک بنی امیہ کے ہمدرد موجود تھے، اور شورش کا مقصد یہ تھا کہ حکمران خاندان خلافت کو تباہ کر دیا جائے۔ فوری سبب یہ ہوا کہ ایک سپاہی نے فلسطین کے رہنے والے ایک شخص ابوحرب الیمنی کے گھر میں زبردستی داخل ہو کر ایک عورت کو قتل کر دیا۔ جب ابوحرب گھر واپس آیا، اور اس واقعہ کی اطلاع اُسے ہوئی تو اس نے سپاہی کو قتل کیا، اور جبال اردن میں پناہ لی؛ جہاں اُس نے نقاب پوش ہو کر بغاوت اور خلیفہ سے خود مختاری کا وعظ کہنا شروع کیا۔ ابوحرب نے دعویٰ کیا کہ وہ بنی امیہ کے خاندان سے ہے۔ بہت جلدی لوگوں کی ایک بڑی جماعت اس کے گرد جمع ہوگئی۔ جابر بن ایوب الحضاری کو معتصم نے فوج دے کر فلسطین بھیجا، لیکن کو اس وقت حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر آئندہ سال معتصم کی وفات اور واثق کے خلیفہ ہونے کے بعد ابوحرب کی، جو نقاب پوش ہونے کی وجہ سے مبرقع کے نام سے مشہور رہے۔ لڑائی رجار سے ہوئی۔ مبرقع کے بیس ہزار آدمی کام آئے خود مبرقع ہوا، اور سامرا بھیجا گیا۔[2]

مندرجہ ذیل واقعہ سے معتصم کے زمانہ کی عدالتی کارروائی کے متعلق ہمارے خیال کی توثیق ہوتی ہے اس سے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معتصم نے افشین کو مجرم ثابت کرنے کی غرض سے محض سیاسی اسباب کی بنا پر ظاہرداری کے لئے تمام عدالتی انتظامات کئے تھے، اور دوسری طرف اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو سکے تب بھی معتصم سخت ترین سزا دینے میں تامل نہ کرتا تھا۔

افشین کو مشہور سپہ سالار ابودلف سے اُس کی بہادری، فصاحت و بلاغت اور زبان عربی میں بے انتہا

---

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ص ۱۸۷)۔ ابن خلدون (ج ۳۔ص ۲۶۷)۔ (ان دونوں مصنفوں کا بیان ہے کہ یہ بغاوت ۲۲۶ھ میں فرو ہوئی تھی۔

[2] ابن اثیر (ج ۶۔ص ۱۹۳) ابن خلدون (ج ۳۔ص ۲۷۰) کل (۱۰۰۰۰) آدمی مبرقع کے ساتھ تھے، اور یہ سب اُسے سفیانی

دسترس رکھنے کی وجہ سے حسد تھا۔ چنانچہ اُس نے ابودلف کے خلاف ایک سازش کی، اور ایسے گواہ جمع کئے جنھوں نے اس کے قاتل اور غدار ہونے کی شہادت دی۔ افشین نے ابودلف کو گرفتار کرایا، اُس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا، آخرانہیں اجیر گواہوں کے بیان پر اُسے موت کی سزا سنادی گئی۔ اس کی اطلاع قاضی القضاۃ احمد بن ابی داؤد کو ہوئی۔ وہ عدالت کے چند آدمی ساتھ لے کر فوراً افشین کے پاس گئے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ جلاد عدالت کے فیصلہ کی تعمیل کے لئے تیار تھا، اور غدار ابودلف کی گردن مارا ہی چاہتا تھا۔ احمد نے افشین سے کہا کہ امیرالمومنین نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے تاکہ میں تجھے یہ حکم پہنچادوں کہ ابودلف کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے اور اُسے میرے حوالہ کر دیا جائے۔ یہ کہ کر احمد عدالت کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوئے، اور کہا کہ گواہ رہنا کہ میں نے امیرالمومنین کا حکم افشین کو پہنچا دیا ہے اور ابودُلف کو زندہ وسلامت پایا ہے۔ اب افشین کے لئے سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ ابودُلف کو آزاد کرائے۔ اِدھر احمد سیدھے معتصم کے پاس گئے، اور ابودلف اور افشین میں جو کچھ گذرا تھا اس کی اطلاع دی اور کہا کہ ابودلف کی جان بچانے کے لئے گو کوئی احکام صادر نہیں ہوئے تھے لیکن ضروری تھا کہ وہ خلیفہ کے قاصد ہونے کی حیثیت سے یہ پیغام افشین تک پہنچادیں۔ معتصم نے یہ سن کر احمد کو روک لیا، اور ابودلف کا قصور معاف کر دیا۔ مگر افشین کو محض زبانی سرزنش کی گئی حالانکہ وہ خلیفہ اور قاضی القضاۃ کے ہوتے ہوئے قاضی القضاۃ کے آخری فیصلے کے بغیر دارالخلافہ کے ایک جلیل القدر عہدہ دار کی جان لینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔[1]

معتصم محمد الجہم برمکی سے ناراض ہوا اور اُس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس کے قتل کی تیاری ہو چکی تھی۔ مگر احمد بن ابی داؤد، جو اس کی بے گناہی سے واقف تھے کسی نہ کسی طرح اُسے بچانا چاہتے تھے، اور انہیں سوائے اس کے اور کوئی ترکیب نہ سوجھی کہ خلیفہ کے ذاتی مفاد کا حوالہ دے کر اسے اس کام سے باز رکھیں۔ انہوں نے

(ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ما قبل) سمجھتے تھے یمنیوں کا سردار تھا بس بھی مبرقع کے ساتھ ول گیا۔

[1] ابن خلکان (مطبوعہ یورپ) ج ۱ ص ۶۳۔

خلیفہ سے پوچھا کہ تو نے اس کے قتل کا ارادہ کس کے حکم سے کیا ہے۔ معتصم نے کہا کہ مجھے روک کون سکتا ہے۔ احمد نے جواب دیا کہ خدا اور اس کا رسول اور خلفاء کا انصاف مجھے اس سے باز رکھتے ہیں کہ تو وارثوں سے ان کا مال نہ چھینے' خصوصاً جب تیرے پاس جرم کی جس کے تو موت کی سزا دے رہا ہے' کوئی واضح شہادت موجود نہ ہو۔ جب تک وہ زندہ تو اس سے وہ رقم جو اس نے غبن کی ہے' واپس مانگ سکتا ہے۔ معتصم نے یہ سنکر محمد بن الجہم کی جان بخش دی' اور اُسے دوبارہ قید میں بھیج دیا۔ اس معاملہ کا تصفیہ آخر اس طرح ہوا کہ محمد نے ایک کثیر رقم دے کر دوبارہ رہائی پائی۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ قاضی کے لئے یہ ناممکن ہوا کہ وہ خلیفہ سے صاف کہدے کہ اس شخص کی زندگی پر تجھے کوئی اختیار نہیں' بلکہ اسے خود خلیفہ کی ذات کا حوالہ دینا پڑا۔ یتیموں کا مال ضبط کرلینا ایک معمولی بات تھی۔ مگر زندہ لوگوں کا مال ضبط کرنے میں بھی تامل نہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ وزیر فضل بن مروان سے خلیفہ ناراض اور اُسے معزول کیا' تو اس سے (۱۰۰۰۰۰) دینار اور اتنی ہی قیمت کے سونے چاندی کے برتن اور جواہرات وصول کئے گئے[1]۔ فضل کے بعد احمد بن عمار اور پھر محمد بن عبد الملک بن الزیات وزیر ہوئے[2]۔ گو اس زمانہ کے شعراء نے ابن الزیات کی مدح میں قصیدے کہے ہیں[3]۔ مگر اس کی اور قاضی احمد بن ابی داؤد کی کبھی نہیں بنی۔

معتصم کے عہد خلافت میں یونانی علوم و فنون کی ترقی میں احمد بن ابی داؤد اور محمد بن عبد الملک ابن الزیات قابل ذکر حصہ لیا۔ خود خلیفہ معتصم اتنا ہی جاہل اور اَن پڑھ تھا جتنا کہ اس کا بھائی مامون علم و فضل کے لحاظ سے قابل فخر ہے

---

[1] ابن خلکان۔ ج ۲۔ ص ۲۰۰۔ ۱

[2] یہ ابن خلکان کا بیان ہے۔ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۰) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۷۱) کے مطابق فضل کے بعد ہی محمد بن عبد الملک وزیر مقرر ہوا تھا۔ (مصنف نے معتصم کو ظالم و جابر ثابت کرنے کے لئے اس رقم کا ذکر تو کر دیا جو معزولی کے بعد فضل بن مروان سے خلیفہ نے وصول کی تھی۔ مگر یہ نہیں بیان کیا کہ فضل سرکاری رقمیں غبن کیا کرتا تھا' خلیفہ کے احکام کی تعمیل سے گریز کرتا تھا' اور ہر لحاظ سے بدترین سیرت کا اظہار اس سے ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ واقعات ابن اثیر اور ابن خلدون نے بیان کئے ہیں۔ اسی غبن کی پاداش فضل سے رقم بطور جرمانہ وصول کی گئی تھی۔ مترجم۔) [3] دیکھو ابو تمام کے چند اشعار۔ ابن خلکان۔ ج ۲۔ ص ۳۰۸۔

یہاں ان یونانی طبیبوں اور فلسفیوں کا ذکر کرنا غیر ضروری ہے جو ابتدائی خلفاء کے زمانہ میں عربوں کے استاد رہتے تھے، اور جنھوں نے یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔ یہ حالت معتصم کے زمانہ تک باقی رہی۔ نہ ہم یہودی طبیب زین الطبری اور اس کے بیٹے ابو الحسن علی بن سہل کا حال لکھنا یہاں مناسب سمجھتے ہیں۔ زین نے نہ صرف طب کا بلکہ فلسفہ اور ریاضی کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔ اس کا بیٹا طبرستان کے اسپہبد مازیار بن قارن کا معتمد تھا۔ اس کی نکبت کے بعد وہ غالباً اس سے الگ ہوا، اور خلیفہ کے سامنے اس نے اسلام قبول کیا۔ مشہور طبیب الرازی اسی کا شاگرد تھا۔ الکندی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس کا نام فلسفی ہونے کی حیثیت سے مشہور رہے۔ اس کی بعض تصانیف یورپ میں بھی مقبول ہوئیں۔ اسے بجا طور پر فیلسوف العرب کہا جاتا ہے۔ الکندی قبیلہ کندہ سے تھا، اس کا نام ابو یوسف یعقوب بن اسحاق بن صباح ہے۔ اس نے بصرہ میں تعلیم پائی تھی۔ فلسفہ، طب اور ریاضی پر جتنی یونانی ایرانی اور ہندی کتابیں اس کے زمانہ میں متداول تھیں اس نے ان کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے یونانی مصنفوں کی کتابیں اصلی زبان میں پڑھیں، اور پھر اپنی محنت سے طب اور علم ہیئت میں ایسا ملکہ پیدا کیا کہ اسی کی شرحوں اور ترجموں کے سبب یونانی فلسفہ اور ریاضی کی عام ترویج ہوئی۔ بہت جلد مامون نے اسے بغداد بلالیا اور مترجم مقرر کیا۔ چنانچہ خلیفہ معتصم کے دربار میں اسے بہت وقعت حاصل تھی۔

معتصم نے ۱۸ ربیع الاول ۲۲۷ھ (۵ جنوری ۸۴۲ء) کو وفات پائی وہ بنی عباس کا آٹھواں خلیفہ اور حضرت عباس کی آٹھویں پشت سے تھا۔ اس نے آٹھ بیٹے اور آٹھ بیٹیاں چھوڑیں۔ اس کی عمر اڑتالیس برس کی تھی۔ اس نے موت کے وقت (۸۰۰۰۰۰۰) دینار اور اتنے ہی درہم خزانہ میں چھوڑے۔ وہ ماہ شعبان میں پیدا ہوا تھا۔ جو سال کا آٹھواں مہینہ ہے۔ اس نے آٹھ مرتبہ فوج کشی کی یا کم از کم ان کا حکم دیا۔ یہ مہمیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) بابک اور اس کے پیرووں کے خلاف۔

(۲) زط کے خلاف؛

(۳) خراسان میں بنو علی کے خلاف۔

(۴) بازنطینیوں کے خلاف۔

(۵) اسپہبد طبرستان کے خلاف۔

(۶) آذربائیجان کے باغیوں کے خلاف۔

(۷) کردوں کے خلاف۔

(۸) مبرقع کے خلاف۔

معتصم سے خلفاء کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جب کہ وہ اصلی ناموں سے یاد نہیں کئے جاتے تھے۔ خود معتصم کا نام ابواسحاق محمد تھا، اور وہ معتصم باللہ کے لقب سے مشہور ہے۔ اسی طرح باقی خلفاء کے بھی القاب ہوتے تھے، اور انھیں القاب سے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ہمت

جناب مہدی علی صاحب صدیقی مدیر حصہ انگریزی

صاحب تخت و صاحب افسر — در بدر پھر رہے ہیں خاک بسر

حسن تدبیر ہے نہ عزم عمل — اور الزام سارا قسمت پر

فکر اصلاح ملک و سطوت ہیچ — بے پری بے زری وعزم سفر

کوششوں میں شہید ہو جانا — زندگی سے یہ موت ہے بہتر

مالک شہرت دوام ہوئے — قائد مصر و غازی انور

نام زندہ ہیں اہل ہمت کے — موت سے گو نہیں کسی کو مفر

خضر کی عمر ننگ نادر ہے

آب حیوان نثار اسکندر

تتمہ صوان الحکمۃ
یا
تاریخ حکمار اسلام

جناب ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی ام۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)

میرا قصد ہے کہ اس مقالہ (تھیسس) میں سے جو میں نے لندن یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی میں پیش کیا تھا چند اقتباسات امام خراسان و علامۃ الزمان ظہیر الدین ابو الحسن علی بن ابو القاسم زید البیہقی (۵ ۵ ۵ ہ) کے مختصر حالات ان کے شدہ تاریخ بیہق اور دیگر تصانیف کے متعلق جو تقریباً اسی ہیں، چند مضامین مجلہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شائع کروں۔ بوجوہات چند میں نے ترتیب قائم نہیں رکھی اور جو مضمون فی الحال اولاً شائع کرنا مناسب سمجھا اس سے ابتدا کی ہے۔

اہمیت تتمہ صوان الحکمۃ ۔ تتمہ صوان الحکمۃ یا تاریخ حکمار الاسلام ظہیر الدین ابو الحسن علی بن زید البیہقی کی دوسرا شدہ کار ہے، جو عربی زبان میں لکھی گئی (صوان الحکمۃ مصنفہ ابو سلیمان بن طاہر بن بہرام سجزی ا کا تتمہ ہے) کتاب نہایت اہم ہے اور اس کی اہمیت کے کئی اسباب ہیں۔

اولاً یہ کتاب نہایت قدیم اور ان بیش بہا خزانوں میں سے ہے جو مغلوں کے دست برد و تاخت و تاراج

ایران سے محفوظ رہیں، اس کتاب کا سنہ تالیف، جہانتک ہمیں علم ہے، موجودہ مواد کی رو سے ۹۴۴ ہجری تک قرار پاتا ہے، جس پر ہم اپنے دوسرے مضمون میں، جو متعاقب شائع کیا جائیگا، ذرا تفصیل سے روشنی ڈالینگے۔

ثانیاً۔ مواد مندرجہ تتمہ نہایت اہم اور قابل اعتماد ہے، کیونکہ مصنف نے اس میں اکثر و بیشتر ایسی باتیں درج کی ہیں جو اس نے اپنی آنکھوں دیکھی اور اپنے کانوں سنی تھیں، جس چیز کے متعلق اسے خود یقین نہیں تھا، اس کو صاف صاف بیان کر دیا کہ اس کی اسے تحقیق نہیں۔ یہ چیزیں مصنف نے موقع محل پر کتاب میں واضح کر دی ہیں۔

ثالثاً۔ اس کتاب کے ذریعہ بعض شعراء و مصنفین کے قدیم و اہم ترین حالات کا انکشاف ہوتا ہے جو بلا شبہہ نہایت قیمتی اور علمی دنیا میں جدید اضافہ کہی جا سکتی ہیں، جنکی وجہ سے سابقہ معلومات و خیالات میں تبدیلی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ ان کی تفصیل دیگر مضامین میں متعاقب تحریر کیجائیگی۔

منجملہ اور معلومات کے یہ انکشاف نہایت اہمیت رکھتا ہے جو مشہور مصنف محمد بن محمود شہرزوری تخمیناً سنہ ۶۰۰ ہ کی شہرہ آفاق کتاب نزھتہ الارواح و روضۃ الافراح فی تاریخ حکماء المتقدمین والمتاخرین[۵۵] سے متعلق ہے، یہ کتاب متعدد عربی و فارسی کتابوں کا ماخذ رہی ہے، اس کتاب کی اہمیت کے لحاظ سے مقصود علی نے فارسی میں اس کا ترجمہ کرا کے تاریخ حکماء سلف نام رکھا[۵۶]۔

ابوالحسن علی بن زید کے کارناموں کی جستجو و تحقیق کے دوران میں جب تتمہ صوان الحکمہ یا تاریخ حکماء الاسلام

---

۵۵ فہرست مخطوطات عربی سٹیٹ لائبریری برلن، نمبر ۱۰۰۵۵، ایم او ۲۱۷

۵۶ ذیلی فہرست مخطوطات فارسی، برٹش میوزیم، نمبر ۱۰۰۔ پروفیسر محمد شفیع صاحب نے اورنٹیل کالج لاہور میگزین فروری سنہ ۱۹۲۹ء جلد ۵، صفحہ ۱۰۹ میں تتمہ صوان الحکمہ کے ایک ترجمہ درۃ الاخبار و لمعۃ الانوار کا ایک حصہ شائع کیا تھا، لیکن پروفیسر صاحب نے یہ درج نہیں کیا کہ وہ نسخہ کہاں دستیاب ہوا اور اب کس کتب خانہ اور کس شخص کے قبضہ میں ہے۔

میرے ہاتھ لگی، اور میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا، تو مجھے شبہ ناشی ہوا کہ اسی قسم کی عبارت میں نزہت الارواح میں بھی پائی جاتی ہے، چنانچہ دونوں کتابوں کے مقابلہ کے بعد یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نزہت الارواح کا نصف حصہ آخر جو حکمائے متاخرین سے متعلق ہے، من وعن تتمہ صوان الحکمہ کی نقل ہے۔

نزہت الارواح و روضہ الافراح کو شہرزوری نے دو حصوں پر تقسیم کیا ہے، پہلے حصہ[1] میں حکمائے قدیم مثلاً تالیس سے آغاز اور جالینوس پر اختتام ہوتا ہے۔ دوسرے حصہ[2] میں حکمائے متاخرین کا ذکر ہے؛ اس کو نیض بن اسحق سے شروع کر کے ابوالفتوح یحییٰ پر ختم کیا گیا ہے۔

موخرالذکر حصہ کتاب میں شہرزوری نے تتمہ کو بالکلیہ نقل کیا ہے، لیکن اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ اس امر کو پوشیدہ رکھا ہے کہ وہ کسی طرح بھی کسی اور مصنف کا مرہون منت ہے۔

اس سرقہ کے مقابل وہ سرقات کوئی اہمیت نہیں رکھتے جو تاریخ طبرستان، بزم آرا اور العراضہ فی حکایات السلجوقیہ میں چہار مقالہ[3]، بہار الالباب[4] اور راحت الصدور[5] سے لئے گئے ہے۔

شہرزوری نے ہمارے مصنف ابوالحسن بیہقی کا نام بھی ان علمائے بیہق کی فہرست میں شریک نہیں کیا۔ جن کے حالات اس نے نزہت الارواح میں لکھے ہیں، حالانکہ ابوالحسن بیہقی اپنے زمانہ کے بزرگ ترین علماء میں سے تھا، اور اس خطہ مشہور بیہق کا باشندہ ہونے کے علاوہ کثیر التعداد تصانیف [illegible] صاف ظاہر ہے کہ شہرزوری نے عمداً ہمارے مصنف کو

[1] نزہت الارواح ورق ۱تا ۱۴ب۔

[2] ″ ″ ورق ۱۴۱ب تا ۱۹۵ب

[3] چہار مقالہ، دیباچہ، صفحہ ۱۴۔

[4] لباب الالباب جلد ۱ صفحہ

[5] راحت الصدور، دیباچہ، صفحات ۴۳، ۵۴۔

حوالہ بھی ضرور دینا پڑتا۔ اس طرح نزہت الارواح کے اصلی ماخذ کا انکشاف ہوجاتا، اور وہ اس کو اپنی کتاب کے طور پر پیش کرسکتا؛ یہ خوف اس وجہ سے بھی زیادہ تھا کہ شہرزوری ہمارے مصنف کے نہ صرف نصف صدی بعد زندہ رہا ہے۔

ہم نے دونوں کتابوں یعنی تتمہ صوان الحکمہ اور نزہت الارواح کا مقابلہ نہایت تحقیق و تدقیق سے کیا، ان کی عبارتوں میں بہت ہی کم فرق پایا، نہ صرف نزہت الارواح کی ترتیب وہی ہے جو تتمہ کی ہے۔ بلکہ الفاظ بھی وہی ہیں، البتہ شہرزوری کبھی کبھار بعض الفاظ یا طویل وغیرہ واہم القابات یا جملے، جو ہمارا مصنف عادتاً تفصیل وار لکھا کرتا ہے، حذف یا تبدیلی یا مختصر کردیتا ہے۔ بعض مقامات میں نہ صرف الفاظی تغیر پایا جاتا ہے بلکہ جملوں کا بھی بعض جگہ شہرزوری اپنی طرف سے چند الفاظ یا جملے اضافہ کردیتا ہے۔

شہرزوری کا سرقہ اس جگہ پوری طور پر ثابت ہوجاتا ہے، اور کسی شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی جہاں ہمارے مصنف نے صاف طور پر خود اپنے چشم دید واقعہ یا اپنی تصنیف کا ذکر کیا ہے مثلاً جہاں یہ کہتا ہے "میں نے فلاں کتاب دیکھی ہے" "میں نے فلان واقعہ کو اپنی فلان کتاب میں بیان کیا ہے" "میں نے بات فلان شخص سے سنی ہے" ان مواقع پر شہرزوری ان جملوں کا تبدیلی کے ساتھ یون رمطراز ہوتا ہے "ایک مورخ نے مجھسے بیان کیا" "ایک کتاب میں لکھا ہے" اسیطرح کے چند جملوں کے بعد بجنسہ کتاب کی نقل جاری رکھتا ہے۔

میں مندرجہ بالا دعویٰ کا ثبوت ذیل میں پیش کرتا ہوں جس سے دعویٰ پوری طور پر ثابت ہوجاتا ہے۔
بغرض سہولت عبارتوں میں جہاں اختلاف ہے اس کے نیچے لکیر کھینچدی گئی ہے۔

تتمہ صوان الحکمۃ یا تاریخ حکماء الاسلام

حنین بن اسحاق المترجم کان اول من فسر اللغۃ الیونانیہ ونقلہا الی السریانیہ والعربیہ ولم یوجد فی ہذہ الازمنۃ بعد الاسکندر اعلم منہ باللغۃ العربیہ والیونانیہ کان فی عہد المامون والمعتصم کان بغدادی المولد وقد نشا بالشام وتعلم بہا وکان یدخل بیعۃ النصاری ویتعبد علی قوانین الشریعہ المسیح عیسی علیہ السلام۔

الشیخ ابو النصر فارابی ہو محمد بن محمد بن طارخان من فاراب ترکستان وہو الملقب بالمعلم الثانی ولم یکن افضل منہ من حکماء الاسلام وقیل الحکماء اربعۃ اثنان قبل الاسلام وہما ارسطو والا ... واثنان فی الاسلام وہما ابو النصر و ابو علی وکان بین وفات ابی النصر و ولادت ابو علی ثلثون سنہ وکان ابو علی تلمیذ التصانیفہ۔

نزہت الارواح و روضۃ الافراح

حنین بن اسحق المترجم کان اول من فسر اللغۃ الیونانیہ ونقلہا الی السریانیہ والعربیہ ولم یوجد فی ہذہ الازمنہ بعد الاسکندر اعلم منہ باللغۃ العربیہ والیونانیہ وکان فی عہد المامون والمعتصم بغدادی المولد ونشا بالشام وتعلم بہا وکان یدخل بین النصاری ویتعبد علی قوانین الشریعہ المسیح۔

الشیخ الفاضل محمد بن محمد وہو من فاراب ترکستان وہو الملقب بالمعلم الثانی ولم یکن افضل منہ من حکماء الاسلام وقیل الحکماء اربعۃ اثنان قبل الاسلام وہما ارسطو والاسکندر واثنان فی الاسلام وہما ابو نصر وابو علی وکان بین وفاتہ وولادت ابی علی ثلثون سنۃ وکان ابو علی تلمیذ التصانیفہ۔

۱۔ تتمہ ورق ۲، ب، سطر ۱۵۔
۲۔ تتمہ ورق ۱۰، الف، سطر ۵۔

۱۔ نزہت ورق ۱۴۱، ب، سطر ۷۔
۲۔ نزہت ورق ۱۴۶، سطر ۷۔

ابو سهل مسیحی کان حکیما استولی علیه تصانیفه فی الطب کثیرة مفیدة، وقد ارتبطه خوارزمشاه مامون بن محمد، ومولد ابی سهل من جرجان وقد نشأ وتعلم ببغداد وقد صنف کتابا لطیفا فی التعبیر وکان نصرانیا فی الملة لا یحضر مع النصاری ویتعبد فی منزله۔[۲]

الملک العادل العالم عضد الدنیا والدین علاء الدین فرامرز بن علی بن فرامرز ملک یزد، کان ملکا عالما عادلا ترمیم اسلان سنة منه عشر وخمسمائة وکان عرض علی والدی تصنیفه الذی سماه بهجة التوحید وکان ذهب عن رای ابی البرکات بن ملک الطبیب البغدادی ونصر قوله فی مسئلة العالمیة، وکان متخلقا باخلاق الحکماء ومستعد الملک، قال یوما للامام عمر الخیام ما تقول فی اعتراضات حکیم ابی البرکات علی کلام ابی علی فقال له الامام عمر ابو البرکات لم یفهم بکلام ابی علی ولیست له رتبة الادراک لکلامه فکیف یکون له رتبة الاعتراض۔[۳]

ابو سهل المسیحی کان حکیما استولی علیه الطب وتصانیفه فی الطب کثیرة مفیدة وقد ارتبطه خوارزمشاه مامون بن محمد، ومولد ابو سهل بجرجان، نشاء وتعلم ببغداد، وصنف لخزانة خوارزمشاه کتابا لطیفا فی التعبیر وکان نصرانیا فی الملة "لا یحضر مع النصاری ویتعبد فی منزله۔[۲]

عضد الدین ملک یزد کان عادلا عاما وله کتاب سماه بهجة التوحید، وکان ذاب علی رای ابی البرکات وتعصب قوله فی مسئلة العالمیة، وکان متخلقا باخلاق الحکماء کان یوما الخیامی ما یقول فی اعتراضات ابی البرکات علی ابی علی فقال الخیامی انه لا یفهم کلام ابی علی ولیست له رتبة الادراک لکلامه فکیف یکون له رتبة الاعتراض۔[۳]

[۲] تتمه ورق ۵۲ ب، سطر ۵۔
[۳] تتمه ورق ۶۵ ف

[۲] نزهة، ۱۵۵ ب، سطر ۳۔
[۳] نزهة، ورق ۱۵۸، سطر ۱۔

الله[1] مستور الفيلسوف حجة الحق عمر بن ابراهيم الخيام كان نيشابورالميلاد والا باء والاجداد وكان تلوابي علي في اجزاء علوم الحكمه الا انه كان سيئي الخلق ضيق العطن وقد تامل كتاباً باصفهان سبع مرات و حفظها وعاد الى نيسابور واملاه، فقوبل بنسخه الاصل فلم يوجد بينهما كثير تفاوت...

ودخل حجة الاسلام الغزالي يوما عليه (شهاب الاسلام) وساله عن تعيين الاجزاء الفلك القطبيه دون غيرها مع كونه متشابه الاجزاء، واما قد ذكرت ذلك في كتاب عرائس النفائس من تصنيفي، فاطال الامام عمر الكلام وابتدا ......

بذكر[3] الحكيم ابي ريحان محمد بن احمد البيروني كان من اجلاء المهندسين وقد سافر في بلاد الهند اربعين سنة وصنف كتبا كثيرة ورايت اكثرها بخطه وله مناظرات...

عمر الخيامي[2] النيسابوري الاباء والبلاد وكان تلوابي علي في اجزاء علوم الحكمه الا انه كان سيئي الخلق ضيق العطن وقد تامل كتابا باصفهان سبع مرات وحفظها وعاد الى نيسابور فاملاه فقوبل بنسخه الاصل ولم يوجد بينهما كثير تفاوت...

ودخل عليه (شهاب الاسلام) يوما الامام حجة الاسلام محمد الغزالي وساله عن تعيين جزء من اجزاء الفلك القطبيه دون غيرها مع ان الفلك متشابه الاجزاء فاطال الامام عمر الكلام وابتدا....

ابو ريحان[4] محمد بن احمد البيروني ويرون مدينه بالسند، وكان من اجلاء المهندسين وقد سافر في طلب العلم في بلاد الهند اربعين سنة، وصنف كتبا كثيرة وله مناظرات...

---

[1] تتمہ، ورق ۶۶ ب، سطر ۷ ۔

[2] تتمہ ورق ۳۸ الف، سطر ۹ ۔

[3] نزہتہ، ورق ۲۱۵۹، سطر ۲ ۔

[4] نزہت، ورق ۱۵۷ ب، سطر ۱۲ ۔

الحکیم[1] ابو القاسم عبد الرحمان علی بن ابی صادق المتطبیب قال فی الحکمه واجزائها مرتبه عظیمه خصوصا فی الطب .... ولزم مکانه واختار انزوا وقد خلت یوما علیه وبین یدیه اطباق من الفواکه فقال لی الحکم ابو القاسم ......

ابو القاسم[2] عبد الرحمان بن ابی صادق. قال فی الحکمه مرتبة عظیمه خصوصا فی الطب... ولزم مکانه، واختار انزوا وقد خل بعض الناس علیه وبین یدیه اطباق الفواکه، فقیل الی انه ......

محمود[3] الخوارزمی، کان والده وزیر قنبر، و هو ترکی، استولی علی خوارزم، وکان محمود ادیبا، فاضلا، کاملا، استعاد من حکیم ابی البرکات ورایته بمروفی شهور سنه تسع عشر وخمسمایه، فاستولی علیه نوع من السودا -

محمود[4] الخوارزمی، کان والده وزیر میسر و هو ترکی، استولی علی خوارزم، وکان محمود حکیما، ادیبا، فاضلا، من تلامذ ابی البرکات استوی علیه نوع من السودا۔

اسی طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں ہم نے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے۔

اگر تتمہ صوان الحکمہ موجود نہ ہوتی اور روشنی میں نہ لائی جاتی تو کسی کو اس امر کا شبہ بھی نہ ہوتا کہ نزہت الارواح اصلی کتاب شہرزوری نہیں ہے (ہمارا خیال ہے کہ شہرزوری کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں تھا کہ نزہت الارواح کو اپنی تصنیف کے طور پر پیش کرتا) چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اصلی نادر الوجود ہونیکی وجہ سے نزہت الارواح کو

---

[1] تتمہ ورق ۶۳ ب، سطر ۶
[2] نزہت، ورق ۱۰۰ ب سطر ۱۲-
[3] تتمہ ورق ۳۸، الف، سطر ۹
[4] نزہت، ورق ۱۰۱ الف سطر ۱۲

شہرت عام حاصل ہوئی، اور متاخرین نے اُسکو ماخذ قرار دیا اور اصل کیطرف کسی کا خیال بھی نہیں کیا گیا لیکن اب یہہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہوگئی ہے۔

اگرچہ محمد بن ابی الوفا المعروفی نے اپنی کتاب "منتخب من کلام ابی الفضل وغیرہ"[1] میں ابوعلی سینا کا حال تتمہ صوان الحکمہ سے نقل کیا ہے، مگر اس کے ساتھ اس کو اس امر کا اعتراف بھی ہے[2]۔

نہ صرف شہرزوری اور المعروفی نے تتمہ سے نقل واقتباسات کئے ہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ مشہور مصنف علی بن یوسف بن ابراہیم القفطی نے بھی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف تاریخ الحکما[3] میں ابوعلی سینا کا حال تتمہ سے لیا ہے۔

میں ذیل میں تتمہ صوان الحکمہ اور تاریخ الحکما میں سے ابوعلی سینا کے متعلق چند سطور پیش کرتا ہوں جس سے یہ چیز بخوبی واضح ہوجائیگی۔

تتمہ صوان الحکمہ	تاریخ الحکماء
ابو علی سینا بخاری ... وقال کان رجل یقال لہ ابو محمد الشیرازی وقد ارتبطہ الشیخ لہ دارا فی جوارہ، وانزلہ بہا دار ابو عبید لمختلف الیہ کل یوم یقرا	ابو علی بن سینا الشیخ الرئیس ... قال کان بجرجان رجل یقال لہ ابو محمد شیرازی یحب ہذا العلوم وقد اشتری الشیخ دارا فی جوارہ، وانزلہ بہا وانا اختلف الیہ کل

[1] فہرست مخطوطات عربی، سٹیٹ لائبریری برلن، نمبر ۸۲۰۵، ۶۰۰

[2] ایضاً ورق ۳۳ الف

[3] ایضاً نمبر ۱۰۰۵۲، ۹۴۳، ورق ۱۶۰ ب

یوم اقرأ[1] المجسطی، واشتمل[2] المنطق و صنف لابی محمد الشیرازی کتاب المبدا والمعاد، وکتاب الارصاد الکلیہ	اقرأ المجسطی واسمی المنطق، وصنف لابی محمد الشیرازی کتاب المبدا و المعاد، وکتاب الارصاد الکلیہ

سنہ ۵۰۵ھ (صحیح سنہ ۵۰۶ھ) ابو الحسن بیہقی اور عمر خیام کی ملاقات اور موخر الذکر کا اول الذکر سے حماسہ اور انواع خطوط قوسیہ کے متعلق سوال کی نسبت ایک حکایت فردوس التواریخ مصنفہ خسرو ابرقوہی میں مذکور ہے جس کا حوالہ پروسی مستشرق زوکروسکی نے المظفریہ[3] میں اور علامہ مرزا محمد قزوینی نے حاشیہ چہار مقالہ[4] میں دیا ہے، لیکن فردوس التواریخ میں نہ تو اصلی ماخذ کا حوالہ دیا گیا تھا نہ اس کا پتہ چل سکا، اب تتمہ کے ہاتھ آنے سے اس بات کا یقین ہوگیا کہ اس کا ماخذ اصلی یہی تتمہ بیہقی ہے۔

مذکور الصدر مصنفین کے علاوہ پروفیسر سخاؤ مشہور مستشرق المانی کے دیباچہ آثار الباقیہ مصنفہ ابی ریحان البیرونی (صفحہ ۳۰ تا ۳۲) میں ابی ریحان کا ترجمہ حال تتمہ سے ہی ماخوذ ہے۔

نسخے تتمہ صوان الحکمہ ۔ تا حال تتمہ صوان الحکمہ کے صرف پانچ نسخوں کا پتہ چلا ہے، منجملہ ان کے ایک نسخہ برلن سٹیٹ لائبریری میں محفوظ ہے جو بظاہر ابتدا و انتہا کی موجودگی کی وجہ سے مکمل تو ضرور ہے لیکن اس میں اغلاط و الفاظ کی بہت سی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں جو اس نسخہ سے بھی ظاہر ہیں اور دیگر نسخوں سے مقابلہ کے بعد بخوبی واضح ہو گئی ہیں۔ اس نسخہ کی ابتدا حسب ذیل ہے۔[5]

---

[1] بقرء [2] لبسطی

[3] المظفریہ مؤلفہ پروفیسر زوکووسکی سینٹ پیٹرزبرگ، ۱۸۹۷ صفحات ۳۲۷ تا ۳۳۱، المظفریہ مترجمہ سر ڈینیس راس، رائل ایشیاٹک جرنل ۱۸۹۸ صفحہ ۳۴۹ - [4] چہار مقالہ گب میموریل سیریز، صفحہ ۲۱۰ و ۲۱۱

[5] فہرست مخطوطات عربی، سٹیٹ لائبریری برلن، مرتبہ اہلورڈ، نمبر ۱۰۰۵۲، پی ایم ۷۴۷۔

الحمد للہ المنعم الذی لہ نعم ابت ارضا مہا الا استدادا ......

اور وہ اس طرح ختم ہوتا ہے۔

تمع وتسلم وتد ولا لند مروا سلام ......

اس کتاب کا نہ تو سنہ کتابت ہے نہ نام نقل کنندہ۔

تتمہ کا دوسرا مختصر نسخہ لیڈن لائبریری میں ہے[2] یہ اختصار ابواسحق غضنفر تبریزی نے کیا ہے، چنانچہ وہ اس طرح لکھتے ہیں۔

ھذا اخرنا وعدنا من الاختصار من تتمۃ صوان الحکمۃ من تالیف الامام ظہیر الدین ابی الحسن بن ابی القاسم البیہقی قدس اللہ روحہ ۔

اس اختصار کے بعد ابواسحق نے اپنا ایک رسالہ بطور تتمہ شامل کرا کے مزید چند حکماء کے حالات واشعار کا اضافہ کیا ہے تاکہ کتاب کی خوبیوں میں اور زیادتی ہو جائے۔ تتمہ صوان الحکمہ کا اختتام زین الدین جرجانی پر ہوتا ہے اور غضنفر تبریزی نے اپنے رسالہ کو شیخ شہاب الدین سہروردی کے حال پر ختم کیا ہے۔

تتمہ کی نقل ۶۹۲ھ میں ابن الغلام نے کی تھی جس کو اس نے حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہے۔

وجدناھذہ التعلیقات انتقلہا افضل المتقدمین والمتاخرین ابو اسحٰق الغضنفر قدس اللہ نفسہ ونقلنا کما وجدناھا فی سنۃ ۶۹۲ کتبہا ابن الغلام ۔

اس نسخہ کے مقابل دیگر نسخے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اسلئے کہ یہ نسخہ بالکل مختصر اور اختصار کنندہ کے تصرفات سے مملو ہے، ہم نے اس نسخہ سے مقابلہ اس حد تک کیا ہے جہاں تک اصل متن میں مدد مل سکتی تھی ورنہ متن کیا

---

[1] ولا تسندم، نسخہ جات کتب خانہ بشیر آغا، وملا مراد۔

[2] فہرست مخطوطات عربی، فارسی، و ترکی کتب خانہ لیڈن (ہالینڈ) مرتبہ ڈوزی جلد ۲ صفحہ ۲۹۲، کوڈ ۱۳۳، گول۔

بہت تغیر ہو جاتا۔

تتمہ کے دیگر نسخوں کا حوالہ سوائے اس لگ کے کتب خانوں کے جہاں یہ نسخے موجود ہیں، کسی اور فہرست کتب خانجات میں نہیں پایا جاتا۔

قدیم شہر استنبول وہ خطہ ہے جس کے در و دیوار سے نور ٹپکتا ہے، وہ منبع ہے جس کے فیض سے بیشمار علمی نہریں بہیں اور تمام عالم کو سیراب کیا، وہ چشمہ شیرین ہے جس کے گرد تشنہ لبان علم اب بھی جمع ہو کر اپنا حلق تر اور دماغ تازہ کرتے ہیں، اس کے قدیم و مختصر کتب خانوں میں جو تقریباً ہر گلی کوچہ میں نظر آتے ہیں، اب بھی السنہ و علوم مشرقیہ کی ایسی بیش بہا اور عدیم النظیر کتابیں دستیاب ہوتی ہیں جو یورپ کی عظیم الشان لائبریریز میں بھی موجود نہیں۔

انہیں بکھرے خزانوں میں دو جواہر پارے تتمہ صوان الحکمہ کے بشیر آغا اور ملا مراد کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

اس نقل تتمہ صوان الحکمہ کا جو میں نے برلن والے نسخہ سے کی تھی، ان دونوں نسخوں سے مقابلہ کیا، دونوں نسخے مکمل اور برلن والے نسخہ سے بہتر ہیں، میری رائے میں بہترین و قدیم ترین نسخہ بہمہ وجوہ وہ ہے جو کتب خانہ ملا مراد میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ کا سنہ کتابت چھ سو اتنالیس ہجری، اور نسخہ محفوظ کتب خانہ بشیر آغا کا سنہ چھ سو نو ہجری ہے، برلن اور لیڈن والے نسخوں کا سنہ تحریر نہیں ہے، مگر بظاہر تحریر و کاغذ سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ مندرجہ بالا نسخوں سے جدید تر ہیں۔

اول الذکر نسخوں کی ابتداء و انتہا وہی ہے جو برلن والے نسخہ کی ہے، البتہ بعض الفاظ کا اختلاف ہے۔ ملا مراد والے نسخہ میں اختتام پر عبارت ذیل زاید ہے۔

---

[1] کتب خانہ بشیر آغا استنبول نمبر ۴۹۴۔

[2] کتب خانہ ملا مراد استنبول نمبر ۱۴۰۸، یہ نمبر کتاب پر مرقوم ہے اور فہرست میں نمبر ۱۴۳۱ لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔

... تبلغ وسلم ولا تندم، والحمد للہ اولا واخرا وظاھرا وباطنا وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا خیر الخلایق محمد المصطفی المجتبیٰ وعلی آلہ الطیبین الطاھرین اجمعین ۔

بشیر آغا کے کتب خانہ والے نسخہ میں اختصار کنندہ (جس کا نام درج نہیں ہے لیکن ہم خیال کرتے ہیں وہ ابو اسحق غضنفر تبریزی ہے جس کا نام لیڈن لائبریری کی فہرست میں درج ہے اور جس نے تتمہ صوان الحکمہ کا تتمہ لکھا ہے) اس نسخہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

واخرہ (کتاب صوان الحکمہ) کتاب تتمہ صوان الحکمہ لامام الفاضل ظہیر الدین ابی الحسن بن ابی القاسم البیہقی رحمۃ اللہ تعالیٰ ووضعت فی اخرہ رسالہ وسمیت باتمام التتمہ وذکرت فیہا الاشعار المتاخرین من الحکماء وختمت التواریخ بہ ۔

ان نسخوں کے مقابلہ وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں استنبول سے شام وعراق ہوکر ایران روانہ ہوا جب طہران پہنچا اور وہاں کے کتب خانوں کی چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ تتمہ کا اور ایک نسخہ کتاب خانہ آستانہ رضوی یا مشہد مقدس میں بھی ہے جس کا پتہ اس کتب خانہ کی فہرست جلد سوم سے چلا جو ابھی ابھی شائع ہوئی ہے، افسوس کہ بوجہ ناسازی میں مشہد مقدس نہ جا سکا، مگر میں نے ایک عنایت فرما پروفیسر کے ذریعہ اس کی نقل حاصل کرنیکا انتظام کیا ہے جو توقع ہے کہ قریب میں وصول ہو جائیگی، بعد ازاں اُمید ہے کہ تتمہ صوان الحکمہ کے طباعت کا انتظام مکمل ہو جائیگا انشاء اللہ تعالیٰ ۔

اس خیال سے کہ اس کتاب کے اور نسخے موجود ہونگے میں نے حتی الوسع کتب خانوں کی فہرستیں بخوبی چھان ڈالیں، اور دیگر باخبر اور اہل علم حضرات سے اس کی نسبت استفسارات کئے لیکن کسی اور نسخے کا سراغ نہ ملا اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب ہذا کا اور کوئی نسخہ موجود نہیں، اگر احیاناً کسی خانگی شخص کے قبضہ میں ہو تو اس کا وجود کالعدم

اے یادگار پھول

جناب علی حسین صاحب زیبا

تجھ سے وابستہ ہے میری داستان زندگی
تو ہے اس ٹوٹے ہوئے دل کا بیان زندگی

یاد ہے مجھکو ابھی تک کیسے ہاتھ آیا تھا تو!
کس سراپا ناز کا میرے لئے تحفہ تھا تو!

شام وہ صحن چمن کی جس پہ سو صبحیں نثار
کیا بسایا تھا تری خوشبو نے دامان بہار

وہ کسی کا کانپتے ہاتھوں سے تجھ کو توڑ کر
یادگار اپنی عطا کرنا مجھے با چشم تر

جنگ شرم و عشق سے ان کو تھا گو کچھ اضطرار
محشر جذبات سے میرا بھی دل تھا بیقرار

وہ بھری بے ربط سانسیں اور وہ انکا اضطراب
عشق کی دنیا میں ہوتے ہیں یہ لمحے انتخاب

آہ اب بھی مجھ سے شرح داستاں ممکن نہیں
کیف ایسا تھا کہ لفظوں میں بیاں ممکن نہیں

تجھ پہ بھی اسوقت تھی کیسی قیامت کی بہار
جیسے تجھ میں جمع تھی اس باغ کی ساری بہار

تیرا ہر رنگیں ورق تھا اک فسانہ عشق کا حسن کا تحفہ تھا لیکن تجھ میں تھی بوئے وفا

میرے دل سے ملتی جلتی تھی بہت حالت تری تھا شگفتہ میرا دل شاداب تھی صورت تری

تیری اک اک پنکھڑی میں اک چمن پوشیدہ تھا عشق کے جذبات سے اک گلکدہ تھا دل مرا

لیکن اس کے بعد دل کا حال ہے ناگفتنی تھا کسے معلوم اک شام مسرت تھی وہی

اس کے کچھ دن بعد میرے دل کی بستی لٹ گئی وقت کے ہاتھوں تری رعنائی تجھ سے چھٹ گئی

تجھ کو سرد و گرم نے دنیا کے پژمردہ کیا ایک شوخ و شنگ نے دل میرا افسردہ کیا

دلکشی تجھ میں نہیں یاں تازگی دل میں نہیں ہے وہی محفل مگر اب شمع محفل میں نہیں

تو بھی مرجھایا ہوا دل بھی مرا افسردہ ہے
تو گل پژمردہ ہے اور یہ دل پژمردہ ہے

غزل

از جناب مولوی حکیم مرزا قاسم علی بیگ صاحب خگر

دامنش دام افگن افتادست | بہوائے دل من افتادست
نرود از دلم بہیچ دوا | مرض عشق مزمن افتادست
دامن از دست صبر باز برفت | دست من تا بدامن افتادست
گل گریبان درید و گل بلبل | طرفہ شورے بگلشن افتادست
شوخیٔ جلوۂ تجلی کیست | برق حیرت بدیدن افتادست
رازِ خلوت نمی توان گفتن | بزبانیکہ الکن افتادست
کششِ دل نگر پس از مردن | گذر او بمدفن افتادست
دادہ ام دل دگر بسنگدلے | شیشۂ من برآہن افتادست
ماہ را از فروغِ طلعتِ او | برقِ حسرت بخرمن افتادست
یک طرف سحر و یک طرف اعجاز | نگہش تا چہ پُرفن افتادست
یک ہمایوں ہما بدامِ فریب | از فراز نشیمن افتادست
خضرِ تحقیق در طریقت ما | دور از راہِ ما من افتادست
سر برآری تو از زمین آنجا | کآسمان ہم بگردن افتادست
گر بخوانی کتاب منطق عشق | ہر دلیلے مبرہن افتادست
قید نفس است رستم دستان | اندرین چاہ بیژن افتادست

عشق زور آزمائے دل اخگر
تا چہ افتاد با من افتادست

اشاعی ٹیلیفون

از جناب ابوالفتح سید غلام محی الدین صاحب متعلم کلیۂ جامعہ عثمانیہ

سائنس کے موجودہ ترقیات واکتشافات سے ہر تعلیم یافتہ شخص واقف ہے۔ برق وبھاپ کی قوت اور سائنس کے اکتشافات نے جب خشکی وتری کے چپہ چپہ کو وسائل آمدورفت سے مالا مال کردیا۔ ملک میں تمام ریلوں کا جال بچھا یا گیا سمندر میں اسٹیمر چلنے لگے تو برسوں کا سفر مہینوں میں مہینوں کا دنوں اور دنوں کا گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ وقت اور فاصلے کا سوال غیر اہم ہوگیا۔ محکمۂ ڈاک قائم ہوا اور اس طرح سے وسائل خط وکتابت میں نہایت سہولت پیدا ہوگئی۔ برق کی تیز رفتاری کو کون روک سکتا تھا تحقیقات پر تحقیقات اکتشافات پر اکتشافات ہونے لگے۔ اشاعی ٹیلیفون بھی اس کا ایک ادنی کرشمہ ہے جس کی وجہ سے ہر شخص گھر بیٹھے لندن ونیویارک کے مجالس رقص وسرود کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ آن کی آن میں اپنے دوست احباب سے جو اس سے صدہا میل دور ہیں بات چیت کرسکتا ہے۔

برقی قوت کی مدد سے یہ ممکن ہوگیا کہ آواز کی توانائی کو برقرار رکھکر اسکو ایک جگہ دوسری جگہ منتقل کیا جائے ابتدائی خیال یہ تھا کہ اشاعت آواز بغیر مادی واسطے کے ناممکن ہے چنانچہ اگر دو ٹین کے پیالوں میں سوراخ کر کے اس کو کسی تار کے ذریعہ جوڑ دیا جائے اور درمیان میں کوئی دیوار حائل ہو تو ایک پیالے میں گفتگو کرنے سے دوسرے پر سنائی دیتی ہے۔

جب برقی قوت اور تاروں کی وساطت سے یہ ممکن ہوگیا کہ آواز کی توانائی کو برقرار رکھکر اس کو صدہا میل تک منتقل کیا جائے تو مختلف سائنس والوں کے دماغ میں یہ خیالات پیدا ہوتے رہے کہ اس مادی واسطے کو جس کو عرف عام میں تاروں کے نام سے نامزد کرتے ہیں قطعاً بے ضرورت ثابت کر کے صرف اثیری ذرات سے کام کیا جائے۔ اور مقام اسال و وصول پر ایسا انتظام کیا جائے جس کی مدد سے برقی مقناطیسی امواج پیدا کئے جاسکیں تار کی وساطت کے بغیر برقی مقناطیسی امواج کی مدد سے گفتگو کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا اشاعی ٹیلیفونی ہے۔ اس کے اصول کو سمجھنے کے لئے یہ غور کرنا چاہیئے کہ ہمیں آواز کیوں سنائی دیتی ہے؟؟

جب کوئی مبداء آواز ارتعاش کرتا ہے اور یہ ارتعاشات اس سے خارج ہوکر فضا میں ہر طرف پھیل جاتے ہیں جس سے کرۂ ہوائی کے دباؤ میں خفیف سے لیکن جلد جلد تغیرات پیدا ہوتے ہیں اور جب یہ کسی کان کے پردے پر جاکر ٹکراتے ہیں تو آواز سنائی دیتی ہے اشاعی ٹیلیفونی میں یہ انتظام کرنا ہوتا ہیکہ مبداء آواز سے جو امواج شایع ہوں وہ تھوڑی دیر کے دیر کے بعد فضا میں مفقود نہ ہوں۔ بلکہ ان کی توانائی برقرار رہے۔

سر ڈبلیو پریس اور سر جان گیوی W. Preece & Sir John Gavey کی توجہ امالی رو ٹیں کی طرف مبذول ہوئی جو کہ ایک دوسرے سے دور رکھے ہوے دو دوروں (circuits) کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ بعد میں انھوں نے موصلیت زمین

پر ان رؤں کے اثر کو بھی معلوم کیا۔ بعد ازاں ای رومر E. Ramer نے اس موضوع پر غور کرنا شروع کیا اور اس کے محنت شاقہ کے بعد ایک نیا طریقہ معلوم کیا جو سیلینیم Selenium کی اس خاصیت پر مبنی ہے کہ یہ روشنی کے حدت کے زیر اثر اپنی مزاحمت کو بدلتا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہر دو نتائج نقص سے پاک نہیں تھے اس لئے عملاً ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے اشاعی ٹیلگرافی Radio Telegraphy میں جب خاصی ترقی ہوگئی تو موجدوں پر اس کا امکان ظاہر ہوا کہ انہیں چیزوں کی مدد سے گفتگو کو بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ بہت جلد یہ بات واضح ہوگئی کہ اس میں عملاً کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک ایسے ارسالی آلہ Transmitter کی ایجاد ضروری ہے۔ جس سے غیر قسری برقی اشاع un damped electric radiation حاصل ہو سکے اور ایک وصولی آلہ Receiver کی بھی خاص ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ یعنی یہ کہ یہ نہ صرف متصل (Coherer) کی طرح اہتزازات کی وجہ سے اپنا عمل شروع کردے بلکہ وصولی ہوائیہ Receiving aerial پر جو موجیں آکر واقع ہوں اُن کے حیطۂ ارتعاش amplitude کی مناسبت سے اثر پیدا کرے۔ اب ہم مختصراً اس امر کی تشریح کریں گے کہ اولاً آلۂ ترسیل میں برقی تموج کس طرح پیدا کرتے ہیں اور ان امواج کے حیطہ ہائے ارتعاشات کو کس طرح سے مرتب کریں کہ یہ متکلم کی گفتگو کے رواج Wave form سے تطابق میں ہوں اور تیسرا سوال یہ ہے کہ ان متغیر Variable حیطہ ہائے ارتعاشات کے برقی امواج کو کس طرح سے وصول کریں کہ یہ ایک ٹیلیفون پر اثر کرکے اس کو چلا سکیں۔ مقام ترسیل اور وصول پر دو ہوائیے (جو مستول کی وضع کے لانبے

تاروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور جن کو دوسرے تاروں کے ذریعہ تکین دیکر سہارا جاتا ہے) کم و بیش ۱۰۰ فیٹ طویل ہوتے ہیں۔ اور ان کو زمین پر انتصاباً قائم کیا جاتا ہے تاکہ یہ برقی مقناطیسی امواج کو شائع اور جذب کرسکیں۔ برقی امواج یا اہتزازات کو یوں سمجھایا جاسکتا ہے کہ یہ بلند تعدد کی متبادل برقی روئیں High Frequency alternating current ہیں۔ یعنے ان کا تعدد ہزاروں تک پہنچ جاتا ہے۔ ہم کو عموماً دو قسم کے برقی اہتزازوں سے سروکار ہوتا ہے ایک قسری اور دوسرے غیر قسری۔ ان دونوں کا فرق قابل لحاظ ہے پہلی صورت میں ایسے اہتزازات اپنا حیطۂ ارتعاش کم کئے بغیر مسلسل جاری رہیں غیر قسری اہتزازات un damped osciliations کہلاتے ہیں اور اُن اہتزازوں کو ہم معمولی ترسیمی طریقہ سے جیبی منحنی Sine curve کے ذریعہ سے ظاہر کرسکتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر اہتزازات ایسے ہوں کہ جو ایک خاص حیطۂ ارتعاش سے شروع ہوں لیکن تھوڑی دیر کے لئے مفقود ہوجائیں اور پھر اپنی ابتدائی حیطۂ ارتعاش کو حاصل کریں تو ایسے اہتزازات کو قسری اہتزازات Damped osciliations کہتے ہیں۔ ان کو بھی اسی طرح سے ہم ترسیماً مرغولہ Logarthmic Spiral کے ذریعہ سے بتلاسکتے ہیں۔ بلند تعدد کے متبادلوں High Frequency Alternator کے ذریعہ بلند تعدد کی متبادل غیر قسری روئیں High Frequency undamped altering currents پیدا کی جاسکتی ہیں۔

اشعاعی ٹیلیفونی کے لئے مناسب یہ ہے کہ Generator میں سے مسلسل غیر قسری اہتزازات ارسالی ہوائیہ Transmitting aerial میں پیدا ہوں اور ان امواج کے حیطۂ ارتعاش یا طول موج کو تقریر کی آواز کے موج کے مطابق

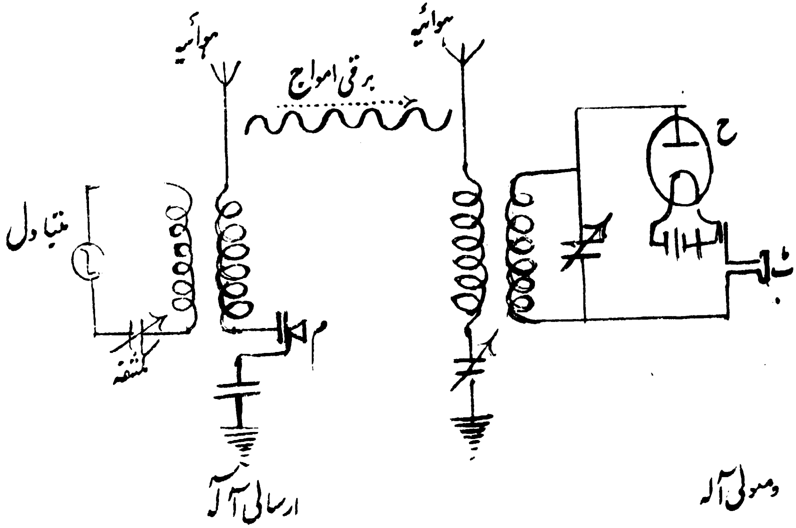
بدلنے دیں تقریر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کامیابی کے ساتھ برقی امواج کے ذریعہ منتقل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اہتزازات کے یکساں بہاؤ میں رکاوٹ واقع نہ ہو اور کوئی بڑے تعدد کا متبادل ایسی رو دے جس کا تعدد ارتعاش تیس اور پچاس ہزار کے درمیان واقع ہو۔ اگر فضا میں مسلسل ارتعاشات واقع ہوتے رہیں اور ان کا تعدد ارتعاش (۴۰) اور (۲۰) ہزار کے درمیان ہو تو عام طور پر آواز کا احساس ہوتا ہے۔ سُر کا انتہائی تعدد ارتعاش جو کہ کسی موسیقی میں استعمال ہوتا ہے چار یا پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہوتا اگر کسی سُر کا تعدد ارتعاش بیس ہزار سے زیادہ کر دیا جاوے تو اکثر کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

پولسن V. Poulsen نامی سائنس دان نے اشاعی ٹیلیفونی کے لئے قوسی ترسیلی آلہ Arc Transmitter کو ایجاد کیا۔ اس میں اس نے کاربن تانبے کی برقی قوس کو ہیڈروجن کی فضا میں عمل کرنے موقع دیا اور ایک طاقتور مقناطیسی میدان کو Generator کی طرح استعمال کیا۔ پانی کو ٹھنڈا کرنے کی ضرورت اور قوسی چیمبر Arc Chamber کے لئے ہیڈروجن یا کوئلے کی گیس کے ذخیرہ کی ضرورت کو دفع کرنے کے لئے اس میں اس طرح سے تبدیلی کی گئی کہ دھاتی صندوق جس میں کہ برقی قوس روشن رہتا تھا ایک اشاعی بغل Radiator Flanges سے اس طریقہ پر ملحق کیا گیا تھا کہ فضائی تبرید Air Cooling ممکن ہو سکے اور گیس کے بجائے میتھلی روح۔ Methylated Spirit یا کوئی اور طیران پذیر Volatile ہیڈرو کاربن مائع کے قطرہ قطرہ کرکے ٹپکانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ مختلف قوسوں کا سلسلہ جوڑ کر بلند تفاوت قوہ (Voltage) اور چھوٹی رودیں حاصل کیجائیں

Arc generator کی مختلف شکلیں آزمائی گئیں۔ فرانس میں کالن اور جینس Colin & Jeance نے قوسی برقیرہ Arc Electrode کے طور پر کاربن کے قرص کا استعمال کیا اور اسٹیلین اور ہیڈروجن کی فضاء کو ایک خاص تناسب میں استعمال کیا تھا۔ پولسن نے مقناطیسی میدان استعمال کیا تھا جس میں اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

فلیمنگ Fleming نے زیادہ غور و فکر کے بعد حررواتی کہلمندن Thermionic Valve کی ایجاد کی اور اس سے لاسلکی میں ایک عظیم الشان انقلاب ہوگیا۔ فرض کرو کہ مقام ارسال پر ایک ہوائیہ ہے جس میں ایک بلند تعدد کے متبادل سے غیر قسری اہتزازات پیدا ہوتے ہیں اور مقام وصول پر بھی ایک ہوائیہ ہے جس کے قریب ایک مکثفہ، اہتزازی کہلمندن اور ایک ٹیلیفون ہم سلسلہ جوڑے ہوئے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک گویا کاربن ماکروفون Speaking carbon microphone ارسالی ہوائیہ کے ساتھ ہم سلسلہ جوڑا جاتا ہے۔ تب اگر اس میں کوئی گفتگو کی جائے تو کاربن کے تکیے Granules کی مزاحمت آواز کی وجہ سے بدلتی جائے گی۔ اور اسی لئے اہتزازی رو ئیں بھی بدلتی جائیں گی جو کہ ہوائیہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ پس برقی امواج کا حیطۂ ارتعاش جو کہ ہوائیہ سے خارج ہوتا ہے اسی طرح سے بدلتا جائے گا جس طرح سے کہ گفتگو کی موجی شکل Wave form ماکروفون پر پڑتی ہیں اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وصول شدہ امواج جو ٹیلیفونی کے وصولی آلے میں پیدا ہوتے ہیں اسی طریقے سے بدلتی جائیں گی۔ پس اس لئے ٹیلیفون سے بالکل اسی قسم کی آوازیں یا گفتگو پیدا ہوگی جیسے کہ ماکروفونی ترسیلی آلے سے بھیجی جائے گی۔ ہم اس طرح سے اشاعی ٹیلیفونی کو حاصل کرنے کے

قابل ہو گئے ۔



اوپر لاسلکی ٹیلیفونی کے ضروریات ایک شکل میں ظاہر کی گئی ہیں ۔ بائیں جانب ارسالی آلہ ہے جس کے ہوائیہ کے ذریعہ سے مسلسل برقی امواج شائع ہوتے ہیں اور ماکروفون م پر گفتگو کرنے سے بدلتے جاتے ہیں ۔ وصولی آلہ کا ہوائیہ ان امواج کو وصول کرلیتا ہے اور یہ حرروانی کھلمندن ح سے گزرنے کے بعد اس قابل ہوجاتے ہیں کہ یہ ٹیلیفونی وصولی آلے ٹ کے ذریعہ سے سنائی دیں عملاً استعمال ہونے والے آلات کے ارسالی ہوائیہ میں اہتزازات ایک سہ برقیرے Three Electrodes حرروانی کھلمندن کے ذریعہ سے پیدا کئے جاتے ہیں اور گویا ماکروفون سے ہم سلسلہ ایک دو خانے اور امالی لپچے کے ابتدائی دور شریک کئے جاتے ہیں ۔ اس کا ثانوی دور بھی ارسالی کھلمندن سے جوڑا جاتا ہے اور اس طرح سے پیدا ہونے والے اہتزازات کو متغیر کرتا ہے ۔ ان طریقوں سے گفتگو کا اٹلانٹک کو عبور کرنا بھی آسان ہوگیا ۔

مارچ ۱۹۱۹ئ میں اُن اہم تجربات کی بنا پر جو کہ مارکونی کے ساتھیوں نے ترتیب دیئے تھے۔ انھوں نے گفتگو کو دو ہزار میل کے فصل پر منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد جو جو آزمائشیں کی گئیں اُن سے معلوم ہوا کہ لندن سے نیویارک تک اشاعی ٹیلیفونی کے ذریعہ سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ لیکن زمانۂ حال میں اس قدر ترقی ہوگئی ہے کہ حال ہی میں یہ خبر اخبار میں شائع ہوئی تھی کہ روم کے کسی شہر میں تقریر کی گئی تو تمام دنیا میں اس کو پہنچایا یا Broadcasted گیا۔ اور گول میز کانفرس کے سلسلے میں تو عام طور پر دہلی وغیرہ خود حیدرآباد میں بعض مقامات پر لندن کی تقاریر سنی گئیں۔

اشاعی ٹیلیفونی کے ذریعہ سے ہوا باز سے بھی گفتگو کی جا سکتی ہے وہ اس طرح کہ حروانی کہلمندن، وصولی آلہ اور Generator کو تھوڑی سی جگہ میں ایسے کہ ہوا باز میں آسکے بنا سکتے ہیں۔ ہوائیہ Aerial جس کو عموماً تقریباً (۲۵۰) فٹ لانبا بنایا جاتا ہے ہوا باز سے ملحق کیا جاتا ہے جو اس کی پرواز کی حالت میں اس کے پیچھے ہوا میں لٹکتا رہتا ہے۔ کہلمندن کے لئے جو برقی رو کی ضرورت ہوتی ہے اس کو ایک ڈائنمو کے ذریعہ سے مہیا کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے انتظامات سے ہوا باز سے ۵۰ میل یا اس سے زیادہ کے فصل سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

نوٹ۔ یہ مضمون زیادہ تر فلیمنگ کی دو کتابوں (۱) The Principle of electric wave telegraphy & telephony (2) Fifty years of Electricity سے ماخوذ کیا گیا ہے۔

صدائے دِل

از
رشید سُبحانی

سوال اُٹھا مرار وئے زمین سے — جواب اس کا ملا عرش بریں سے
کر یجیے ما سوا کو خاک، دل میں — لگی ہے آگ، روئے آتشیں سے
خودی آئینۂ ذاتِ خدا ہے — اگر روشن ہو دل "نور مبیں" سے
حسیں بھی ہیں غضب کے، خود نما بھی — اُنہیں بھی دیکھنا ہو تو اُنہیں سے
ہمارے دل پہ کیا گذری نہ پوچھو — کسی "گل" کی ادائے دلنشیں سے
نہ ہو ذوق وفا گر، بے اثر ہے — لگانا دل کسی زُہرہ جبیں سے
ستم ہے یا وفا کی آزمائش — یہ آنکھیں پھیر لینا اور ہمیں سے

رشید شیفتہ دل وہ بلا ہے
ہلا دے عرش بھی زورِ یقین سے

اردو صحافت

اثر

جناب مولوی بدر الدین خاں صاحب شکیب بی اے عثمانیہ۔

صحافت کسی ملک کی صحافت اس ملک کے جذبات اور احساسات کا آئینہ اور اس ملک کی سیاسی، معاشری، معاشی و اقتصادی اور علمی حالت کی مظہر ہوتی ہے ۔ موجودہ دورِ ترقی میں اگر کسی چیز نے غیر معمولی اہمیت حاصل کرلی ہے تو وہ صحافت ہے کیونکہ مہذب ممالک میں صحافت ہی رائے عامہ ہے اور یہی وہ ذریعہ ہے جس سے عوام الناس حکومتوں پر اثر پذیر ہوتے ہیں ۔ یہی وہ "زبانِ خلق" ہے جس کی معمولی سی غلط بیانی بھی وہ زور پکڑ جاتی ہے کہ حقیقتیں اس پر قربان ہو جاتی ہیں ۔ صحافت کی ترقی پذیر صورت ہی پر ملک کی ترقیوں کا انحصار ہے ۔ صحافت ایک جادو ہے جس کے بول میں خیر و شر کی بجلیاں رُو پوش ہیں جس طرف صحافت کا رجحان ہوتا ہے اسی طرف لوگوں کے احساسات اور رجحانات

رجوع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اخبارات کا ہاتھ ملک کے سنوارنے اور بگاڑنے میں برابر کا شامل ہے۔

بین الاقوامی معاملات میں صحافت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی وجہ سے مختلف قوموں میں جو بعد ہے، ان کے خیالات اور احساسات میں جو تباین ہے اور ایک دوسرے کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہیں۔ دور ہو سکتی ہیں اور بین الاقوامی تعلقات کو مستحکم کرنے کے لئے صحافت سے بڑھ کر کوئی وسیلہ نہیں۔ تہذیب و تمدن کی توسیع و اشاعت بھی زیادہ تر صحافت ہی کی مرہون منت ہے۔

جس طرح لارڈ برتھام نے پوچھا تھا کہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں رائے عامہ کی حکومت ہے لیکن آخر یہ رائے عامہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اکثریت یا کسی مافوق الفطرت آدمی یا عورت کی رائے نہیں رائے عامہ کو اثر پذیر ہونے کے لئے نہ صرف منطق کی ضرورت ہے بلکہ اس کو ممنوع السمع بھی ہونا چاہئے۔ اس کے خیال کے مطابق رائے عامہ کے اجزا میں کسی چیز میں اتنی قوت اور انرجی نہیں جتنی کہ اخباری پریس میں ہے۔ مکمل، صحیح اور فوری خبروں کے شائع کرنے ہی سے دنیا کی یکجہتی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

صحافت کی ابتدائی

صحافت مشرق کی پیداوار ہے جو مغرب کے ہاتھوں پروان چڑھی ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال پیشتر دنیا کا پہلا اخبار چین سے نکلا جو "پیکین گزٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اخبار آج کل کے اخبارات کی طرح تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک سرکاری جریدہ کی تھی جس کا مقصد شاہی فرامین اور احکامات کی تبلیغ تھی۔ صحافت کی یہی بنیاد ہے جس پر آج ایسی سربفلک عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

ایک ایسے زمانہ میں جب تمدن بالکل ہی ابتدائی حالت میں تھا صحافت کا یکایک

پیدا ہو جانا اور عروج پکڑنا دو متضاد سی باتیں تھیں۔ صحافت کو کمال کے درجہ پر پہنچنے کے لئے ایک ایسے تمدن آفرین زمانہ کی ضرورت تھی جو نہ صرف اس کے روایات کو برقرار رکھتا بلکہ اس کو اپنا ایک لاینفک جزو بھی بنا لیتا۔ موجودہ زمانہ غالباً اسی خیال کی تعبیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحافت تہذیب حاضرہ کی جان ہے۔

اس میں شک نہیں کہ صحافت چین سے ایجاد ہوئی تھی اس کی قابل ذکر ترقی اور عمومیت ازمنہ وسطہ کے بعد سے شروع ہوئی ہے۔ قسطنطنیہ کے ترکی قبضہ کے بعد وہاں کے عالموں کی جماعت تمام یورپ میں پھیل گئی جن کی کوششیں عیسائی ممالک سے جہالت دور کرنے میں بہت کامیاب ہوئیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب یورپ اپنے عہد بربریت سے تمدن کی طرف قدم بڑھا رہا تھا کہ فن طباعت نے جنم لیا۔ اس کا ایجاد ہونا تھا کہ توسیع علم کا ایک نیا باب کھل گیا۔ اور صحافت جو طباعت کے نہ ہونے سے ایک جسد بے روح تھی پھر از سر نو زندہ ہوگئی۔ طباعت اور صحافت میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور جس طرح طباعت کے طریقوں میں تبدیلیاں اور ترقیاں ہونے لگیں۔ صحافت بھی اپنی ارتقائی منازل طے کرنے لگی۔ آج کل مشنری ہی پر اخبار کی کامیابی اور ناکامی کا دارو مدار ہے۔

ہندوستان میں صحافت کی ابتدا

صحافت کے مقصد۔ تبلیغ و اشاعت کو پیش نظر رکھا جائے تو دنیا میں اس کا وجود کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔ مینار، کتبے، پتھر پر کندہ کی ہوئی عبارتیں اور اسی قسم کے بہت سے طریقے صحافت کی ابتدائی نقوش ہیں۔ ہندوستان میں اب تک یہ چیزیں ماضی کو بے نقاب کرتی رہی ہیں۔ اس کے بعد ہندوستان میں اگر صحافت کی طرف کوئی قابل ذکر قدم اٹھائے تو وہ مسلمانوں کے دور بلکہ

عہد مغلیہ کی "واقعہ نویسی" ہے۔ مغلیہ عہد میں واقعہ نویس خصوصیت سے حکومت کے مختلف حصوں میں مقرر کئے جاتے تھے۔ جن کا فریضہ یہ تھا کہ بادشاہ کو ان تمام واقعات سے مطلع رکھیں جو ان کے علاقوں میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ بڑے بڑے امراء اور روساء بھی اپنے اپنے آدمی مقرر کرتے تھے۔ غرض اس طرح خبریں عام معنوں میں بھی مشتہر ہو جاتی تھیں۔ واقعہ نویس اپنی حد تک بہت آزاد تھے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد واقعہ نویسی کو بھی زوال آگیا اور انگریزوں کے حکمران ہونے تک ہندوستان میں صحافت کے متعلق کوئی قابل ذکر بات نظر نہیں آئی۔

۱۷۸۰ء میں ہندوستان سے پہلا اخبار "بنگال گزٹ" یا "جنرل" جاری ہوا۔ اس کے بعد اور بہت سے اخبار نکلنے شروع ہوئے لیکن یہ تمام کے تمام انگریزوں کی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ ۱۸۱۶ء سے دیسی صحافت کا آغاز ہوا جب گنگا دھر بھٹاچار نے پہلا بنگالی اخبار جاری کیا۔ اس وقت تک سرام پور میں عیسائی مشنریوں نے اپنا ایک مطبع قائم کر لیا تھا۔ ۱۸۱۸ء میں انھوں نے ایک اخبار "دگدرشن" جاری کیا۔ جس کے دو حصے ہوتے تھے۔ ایک انگریزی اور اس کا ترجمہ بنگالی میں۔ اس طرح ان مشنریوں نے ہندوستان کی اکثر زبانوں میں تبلیغ کی غرض سے انجیل مقدس کے ترجمے شائع کرکے لوگوں میں تقسیم کر گئے۔ ان کی کوشش بھی ایک حد تک دیسی صحافت کے پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ ۱۸۰۴ء سے ۱۸۱۷ء تک انجیل کے ترجمے اکثر اردو میں تھے۔

ہندوستان میں طباعت کی ابتدا کے ساتھ ہی اخبار جاری ہونا شروع ہوئے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں پہلے فورٹ ولیم کالج میں چھپائی کا انتظام ہوا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی تمام کتابیں یہیں شائع ہوئیں تھیں۔ اخراجات بہت بڑھ جاتے تھے اور نستعلیق خط کے نہ ہونے سے خوشنمائی نہیں پائی جاتی تھی۔ ۱۸۱۲ء میں اس مطبع کو بھی آگ لگ گئی اور اکثر کتابیں نذر آتش ہوگئیں۔ ۱۸۳۷ء میں دہلی میں ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ قائم کیا گیا۔ جس کی وجہ سے کتابوں کے شائع ہونے میں بڑی مدد ملی۔

دیسی زبانوں میں پہلی زبان بنگالی ہے۔ جس میں اخبار جاری ہوئے لیکن حکومت کی جانب سے اخبار جاری کرنے میں بہت قیود عاید تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت ایک زمانہ تک ہندوستانی پریس غیر معروف رہا لیکن رفتہ رفتہ اس نے شہرت کیطرف قدم بڑھایا جس کی وجہ غالباً مدیروں کی جلاوطنی یا اخباروں کا بند کرنا تھا۔ اس پالیسی کا پیشرو لارڈ ویسلی تھا۔ ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہسٹنگز نے اس طریقہ کو بند کیا لیکن مدیروں کو جلاوطن کرنے کا طریقہ برقرار رہا۔ ۱۸۲۳ء میں ایک قانون نافذ کیا گیا جس کی وجہ سے چھاپے خانے بغیر اجازت قائم نہیں کئے جا سکتے۔ اور ساتھ ہی اخبار اور کتابیں شائع کرنے میں چند قیود عائد کئے گئے۔

۱۸۳۲ء میں جب انگلستان کے دونوں ایوانوں کی توجہ ہندوستانی طرز حکومت کی چھان بین کی طرف مبذول تھی تو یہ معلوم ہوا تھا کہ یہاں پانچ جریدے دیسی زبانوں میں اور ۶ اخبار انگریزی زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں پرچہ اجازت نامہ کے بغیر شائع نہیں کیا جا سکتا تھا جو بغیر کسی وجہ یا اطلاع کے واپس بھی لے لیا جا سکتا تھا ۱۸۳۵ء میں لارڈ مٹکاف کے زمانہ میں اجازت ناموں کا طریقہ منسوخ کر دیا گیا اور تمام لوگوں کو اپنے احساسات کے اظہار کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا جو صرف قانونی اور اخلاقی ذمہ داریوں کے پابند تھے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔ اس سال لارڈ کیننگ

نے ایک قانون نافذ کیا جو ۱۸۲۳ء کے قانون پر مبنی ہے۔ اس کے ذریعے سے ناشروں پر یہ لازم آگیا کہ وہ عہدہ دار متعلقہ کو اس قسم کا اقرار نامہ دیں کہ وہ اپنے اخبار میں کوئی چیز ایسی طبع کریں گے اور نہ شائع جو حکومت اور رعایا کے تعلقات کشیدہ کرنے یا مختلف قوموں یا مذہبوں میں منافرت پیدا کرنے میں مدد ہو۔

ان حالات کے تحت ہندوستانی اخبار نکالنے کی جسارت نہیں کرتے تھے لیکن جو انگریزی اخبارات جو ملک میں شائع ہوتے تھے اور اُن سے جو کام لیا جاتا تھا وہ ہندوستانیوں کے لئے کافی ہمت افزا تھے۔ اور جب مغربی تہذیب ہندوستان پر اثر پذیر ہونے لگی تو اخباروں کی بھی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی۔

اردو صحافت کی ابتدا

جب ۱۸۳۶ء میں پریس آزاد کیا گیا تو ۱۸۳۸ء میں باقر حسین صاحب آزاد کے والد نے دہلی سے "اردو اخبار" جاری کیا۔ اس اخبار میں خبریں شائع کرنے کا التزام نہیں تھا بلکہ یہ زیادہ تر ادبی پرچہ تھا۔ اس میں ذوقؔ غالبؔ، مومنؔ اور دوسرا شعراء کی ہم وزن و ہم قافیہ غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ زبان و محاورے وغیرہ کے متعلق بھی مباحثے ہوتے تھے۔ حکومت بھی اس پرچہ کے سرپرستوں میں تھی۔ ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے لاہور سے "کوہ نور" نکالا جو ہندوستانی اور انگریزی حلقوں میں بہت مقبول رہا۔ مہاراجگان کشمیر پٹیالہ بھی اس کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ پہلے یہ ہفتہ میں ایک بار پھر دو بار اور تین بار شائع ہوا شروع ہوا۔ لیکن بہت جلد یہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور اس کی جگہ دوسرے اخباروں نے لیلی۔ جن کے اکثر اڈیٹروں نے دفتر کوہ نور میں تعلیم پائی تھی۔ منشی نولکشور جن کے اردو زبان پر بہت بڑے احسانات ہیں اسی اخبار میں ملازم تھے۔ کوہ نور کے بعد بہت سے اخبار جاری ہوئے۔ کانپور سے "شعلۂ طور" اور

مطبع نور، لاہور سے 'پنجابی اخبار' اور 'انجمن اخبار' دہلی سے 'اشرف الاخبار' سیالکوٹ نے وکٹوریہ پیپر، بنگلور سے 'قاسم الاخبار' بمبی سے 'کشف الاخبار' لکھنؤ سے 'کارنامہ' مدراس سے 'جریدۂ روزگار' وغیرہ۔ اس زمانہ کا سب سے قابل ذکر اخبار اودھ اخبار ہے جس کو منشی نولکشور نے ۱۸۵۹ء میں یوپی سے جاری کیا جس کا آج تک وہاں کے مشہور پرچوں میں شمار ہے۔ اس میں اکثر خبریں انگریزی اخبارات سے ترجمہ کرکے شائع کی جاتی تھیں۔ سیاسیات میں اس اخبار کا کوئی خاص مسلک نہیں تھا اور نہ سیاسی معاملات میں یہ زیادہ دخل انداز تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا بعد میں روزانہ ہوگیا۔

دوسرا اہم اخبار 'اخبار عام' ہے جس کو لاہور سے پنڈت مکند رام نے جاری کیا۔ یہ پرچہ حکومت اور پبلک میں بہت ہی مقبول رہا۔ قیمت کم ہونے کے باوجود اس میں خبریں شائع کرنے کا خاص التزام کیا گیا تھا حالانکہ زبان ادبی نہ تھی۔

اس زمانہ میں سرسید کی شخصیت تمام صحیفہ نگاروں میں ممتاز ہے۔ ۱۸۶۲ء میں سرسید نے انگریزی کی بہترین کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے لٹرری اور سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کا ترجمان علیگڈہ انسٹیٹوٹ گزٹ تھا۔ سرسید نے اس میں مختلف النوع مضامین یعنی معاشری، اخلاقی، ادبی، سیاسی، اور مذہبی موضوعات پر قلم اُٹھایا انگریزی اخبارات کے آرٹیکلوں کے اس میں ترجمے شائع کئے جاتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں سرسید نے مشہور رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا جس کی وجہ سے مسلم سوسائٹی میں انقلاب پیدا ہوگیا۔ اس پرچے نے ہندوستان میں وہی کام کیا جو انگلستان میں ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر نے کیا تھا مذہب کے متعلق جو لوگوں میں غلط فہمیاں مشہور تھیں اس کے دور کرنے میں اس پرچے نے نمایاں کام کیا ہے۔ مغربی تعلیم کی ترغیب اور سوسائٹی کی اصلاح اس کا خاص مسلک رہا ہے۔ اس پرچے میں ملک

ملک کے مشہور اہلِ قلم لکھتے تھے۔ سرسید محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی تہذیب الاخلاق کی روح رواں تھے۔

لکھنؤ سے "اودھ پنچ" ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ اس اخبار کے مشہور اڈیٹر منشی سجاد حسین تھے جن کے گرد نثر نگاروں کی اچھی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ اودھ پنچ اردو زبان کا پہلا مذاقیہ اخبار ہے۔ اس میں اخبار کی تمام خصوصیتیں موجود تھیں۔ زبان کے لحاظ سے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ آزادیٔ تحریر اس کی ایک خاص خصوصیت تھی اور مذہبی رواداری کا یہ خاص علمبردار تھا۔ اس اخبار کے اردو زبان پر بڑے احسانات ہیں۔ اردو نثر نے اس کے ذریعہ بہت ارتقائی منازل طے کئے۔ زبان کے تصنّع (ARTIFICALITY) کے دور کرنے میں اس کا خاص حصہ رہا ہے اور سادگیٔ تحریر اس کی ایک شانِ امتیازی تھی۔ اردو صحافت میں یہ سب سے پہلا اخبار ہے جو خبروں کے علاوہ ایک مستقل پالیسی کے تحت شائع ہوتا تھا۔ معاشرتی معاملات میں یہ بہت ہی تنگ نظر تھا۔ تعلیم نسواں، مغربی تعلیم اور پردہ کا سخت مخالف تھا۔ سرسید کو اس میں 'پیر نیچریہ' وغیرہ کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اودھ پنچ کا مذاق بہت سنجیدہ نہیں تھا۔ بسا اوقات مذاق تہذیب کے دائرے سے گرا ہوا رہتا تھا۔

۱۸۸۳ء میں "ہندوستانی" لکھنؤ سے جاری ہوا۔ یہ پہلا اخبار ہے جس میں باقاعدہ سیاسی معاملات اور حالات حاضرہ پر تنقید کی جاتی تھی۔ اس کا معیار بلند تھا اور یہ معمولی جھگڑوں میں مبتلا بھی نہ ہوتا تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا، پھر ہفتہ میں دو بار اور تین بار اور پھر ہفتہ وار شائع ہونے لگا۔ جلدی میں ترجمہ کرنے میں اس کی زبان کا معیار زیادہ بلند نہیں تھا۔

۱۸۸۷ء میں لاہور سے 'پیسہ اخبار' جاری ہوا جس کے مشہور اڈیٹر اور مالک

منشی محبوب عالم ہیں جن کی ذات میں ایک صحیفہ نگار کی تمام خصوصیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اُردو صحافت کی ارتقا میں پیسہ اخبار کا خاص حصہ رہا ہے۔ اخبار کی قیمت کم کرنے کا جوگر مغربی ممالک کے جریدہ نگاروں نے معلوم کیا اس کی ترویج ہندوستان میں منشی محبوب عالم نے پیسہ اخبار کے ذریعہ کی۔ اشتہارات جو اخبارات کا ایک جزو لاینفک ہیں پیسہ اخبار سے بڑھ کر کسی اُردو اخبار میں نظر نہیں آتے۔ اُردو صحافت منشی محبوب عالم کی احسان سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں شرر مرحوم کی شخصیت سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا شرر نے اپنی زندگی صحافت ہی کی چھاؤں میں گزاری ہے۔ ان کی زندگی بہ حیثیت نائب مدیر پنڈت نولکشور کے اودھ اخبار سے شروع ہوتی ہے اور منشی احمد علی کسمنڈی کے زیر ہدایت انھوں نے اپنے فن میں کمال حاصل کیا۔ شرر نے ہر قسم کے موضوعوں پر قلم اٹھایا۔ ادبی، فلسفی، سیاسی وغیرہ۔ ۱۸۸۲ء میں شرر نے اپنا پہلا ہفتہ وار اخبار "محشر" لکھنؤ سے جاری کیا جو بہت جلد مقبول ہونے لگا۔ لیکن دو سال کے بعد اس کو بند کردینا پڑا جب شرر سفر حیدرآباد میں اودھ اخبار کے نامہ نگار خصوصی کی حیثیت سے آئے۔ ۱۸۸۷ء میں مشہور رسالہ "دلگداز" جاری کیا گیا جس پر فنا و زیست کے بہت دور گزرے ہیں۔ ۱۸۹۰ء میں شرر نے ایک ہفتہ وار اخبار "مہذب" جاری کیا جس میں بالالتزام عہد سلف کی کسی مشہور شخصیت کی سوانح حیات دی جاتی تھی۔ ۱۹۰۰ء میں شرر نے ایک اور رسالہ "پردۂ عصمت" جاری کیا جس میں پردے کی شدت سے مخالفت کی جاتی تھی۔ ایک پانچواں رسالہ "اتحاد" جاری کیا جو ہندو مسلم اتحاد کا حامی تھا۔ ایک دوسرا اخبار "العرفان" جاری کیا گیا جس کا مقصد تصوف اور عرفان کی ترویج تھا۔

ایک صحیفہ نگار کی حیثیت سے شرر کا اپنے ہمعصروں میں کوئی ثانی نہیں تھا اور نہ آزاد خیالی میں کوئی مقابل بہ حیثیت نقاد شرر بعض وقت حد سے زیادہ بڑھ جاتے تھے۔

موجودہ اردو صحافت

جنگِ عظیم کے بعد سے ہندوستان میں بیسیوں اخبار جاری ہوگئے اور در اصل یہی زمانہ اردو صحافت کا ایک شاندار دور کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہیں (جہاں اردو جاننے والوں کی کافی تعداد ہو) جہاں سے ایک نہ ایک اخبار نہ نکلتا ہو۔ بعض بعض شہروں سے دو دو چار چار اخبار نکلتے ہیں۔ اس سلسلہ میں لاہور اردو صحافت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ بیسیوں اخبارات اور رسائل یہاں سے شائع ہوتے ہیں جن کی مجموعی تعداد کا مقابلہ ہندوستان کا کوئی شہر نہیں کرسکتا۔ ایک نو وارد اردو اخباروں کی تعداد پر نظر کر کے اردو صحافت کے متعلق بہت اچھی رائے قائم کرے گا لیکن جب وہ اُن کے متعلق معلومات بہم پہنچائیگا تو اُسے تاسف ہوگا کیونکہ کوئی اردو اخبار صحافت کے اصول کو پیش نظر رکھکر شائع نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں غالباً ہمدرد ہی ایک ایسا اخبار تھا جو اپنے ہمعصروں میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ پالیسی کے لحاظ سے یہ ہندو مسلم اتحاد کا زبردست حامی، قومی تحریک کا زبردست علمبردار اور کانگریس کا انتہائی طرفدار تھا۔ اس کے لیڈر اردو صحافت میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ حالات حاضرہ پر اس کے مقالات بعض وقت انگریزی اخبارات پر سبقت لے جاتے تھے۔ فنی نقطۂ نظر سے کسی سیاسی موضوع پر کسی اردو اخبار میں سنجیدگی سے بحث کی جاتی تو وہ ہمدرد میں کی جاتی تھی۔ اخبار کی پالیسی بھی حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ 'ہمدرد' اپنی زندگی کے اختتام کے زمانہ اور اپنی حیات کے دوسرے دور میں

ہندوستان کی سیاسی فضا کو پیش نظر رکھکر کچھ مسلم دوست ضرور ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے یہ صادق نہیں آتا کہ وہ ہندوؤں کے حقوق کو پامال کرنا چاہتا تھا۔ تحریک ترک موالات کا منتہائے کمال یعنی ہندو مسلم اتحاد کے بعد ہندوستان کی قومی سیاسیات کو جو زبردست دھکا لگا وہ ہندو مسلم نفاق ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی فضا مکرر ہو گی یہاں تک کہ قومی لیڈر بھی فرقہ وارانہ لیڈر بننے شروع ہوئے اور ان دونوں قوموں میں نفاق کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو گی اور پھر نہرو رپورٹ نے ملک کے سیاسی گروہوں میں اور تفریق پیدا کر دی۔ آج کل اخباروں کی پالیسی اس نہروانی اور غیر نہروانی اسپرٹ کی ترجمانی کرنا ہے۔ اس کے سوا اخباروں کی کچھ پالیسی نظر نہیں آتی۔ مسلمان اخبار آپس میں اسی متنازعہ فیہ مسئلہ پر برسرپیکار ہیں۔

ہمدرد کے بعد دوسرا قابلِ ذکر اخبار 'الہلال' ہے جو جنگِ عظیم کے زمانہ میں اور اس کے بعد ہندوستان میں بہت ہی مقبول رہا۔ 'الہلال' مصری صحافت کا آئینہ بردار تھا۔ اسکے مقالات بہت ہی بلند پایہ ہوتے تھے جن کا سمجھنا معمولی فہم وادراک والوں کا کام نہیں تھا اس کی زبان بہت ادق تھی جو اخبارات کے لیے زیبا نہیں تھی الہلال نے اردو میں ایک نئے اسلوب بیان کی ابتدا کی ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کا خاص اسٹائل ہے۔ اردو صحافت میں الہلال کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے اور اس کا نہ ہونا اردو صحافت کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ الہلال اور ہمدرد کی یاد اردو صحافت کا ایک دردناک باب ہے۔

ہمدرد کو چھوڑ کر ہندوستان میں اخباروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہے ہر ایک کے متعلق وضاحت سے بحث کرنا ایک دقت طلب امر ہے۔ ہندوستانی روزناموں

نٹ یہ مضمون دو سال قبل لکھا گیا تھا اس لئے اس زمانہ کا ماحول پیش نظر ہے

میں قابلِ ذکر خلافت، زمیندار، انقلاب، چوٹی کے اخباروں میں شمار کئے جاتے ہیں
خلافت ہندوستان میں خلافت کمیٹی کا آرگن ہے۔ جس وقت خلافت کی تحریک عروج
پر تھی" خلافت اردو اخباروں میں بہت مقبول پرچہ مانا جاتا تھا۔ لیکن جوں ہی اس
تحریک کو زوال ہونے لگا خلافت' میں بھی زوال کے آثار نمایاں ہو گئے۔ خلافت
میں خبریں جمع کرنے کے ذرائع انگریزی اخبارات کی طرح تھے بلکہ اکثر اسلامی ممالک
میں اس کے اپنے نمائندے مقرر تھے۔ پالیسی کے لحاظ سے یہ خلافت اور کانگریس
کا حامی اور ہندو مسلم اتحاد کا طرفدار تھا۔ اس اخبار کے روح رواں مولانا شوکت علی
ہیں جو خلافت کمیٹی کے صدر بھی ہیں' خلافت' پر ان کی شخصیت چھائی ہوئی ہے اور
" خلافت' بھی ان کی ذات کا مظہر ہے۔ جس طرح ان کے خیالات میں تغیر ہوتا رہتا ہے
اسی طرح " خلافت" کی پالیسی بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

خلافت کی طرح " زمیندار" بھی مولانا ظفر علی خان کا مظہر ہے۔ مولانا ظفر علیخاں
ہندوستان کے کامیاب صحیفہ نگاروں میں ہیں۔ ان کی سیاسی تحریریں خاص رنگ میں
ڈوبی ہوتی ہیں۔ جن کا لکھنا ان ہی کا حصہ ہے۔ صحیفہ نگار ہونے کے علاوہ مولانا ایک
اچھے لیڈر بھی ہیں۔ تحریک ترک موالات کے زمانہ میں زمیندار کو ہندوستان میں خاص
وقار حاصل تھا۔ جوں ہی ہندو مسلم اتحاد کو دھکا لگا " زمیندار" ہندوؤں کا سخت مخالف
بن گیا۔ کانگریس اور مہاسبھا پر اس کے حملے بہت سخت ہوتے تھے۔ نہرو رپورٹ کے
شائع ہوتے ہی زمیندار کی پالیسی نے پھر پلٹا کھایا اور وہ نہرو رپورٹ کا حامی اور کانگریس
کا طرفدار بن گیا۔ نہرو رپورٹ کے حسن و قبح سے ہمیں بحث نہیں البتہ عام مسلم رائے
کے خلاف زمیندار کی پالیسی ایک عجیب جسارت تصور کی جاتی ہے۔ سیاسیات
میں اخبارات کا کچھ بھی مذہب ہو لیکن ان کو اس کی وجہ سے آپس میں سر بگریباں نہ ہونا

چاہیئے۔ زمیندار باوجود اپنی کمزوریوں کے ایک اچھا اخبار ہے لیکن اس کا مذاق تہذیب کے دائرے سے گزرتا جاتا ہے۔ بعض لیڈروں کے خلاف اس کے حملے بہت سخت اور سست ہوتے ہیں۔ جس سے خوف ہے کہ زمیندار کا یہ طرز عمل کہیں اس کے لئے تباہ کن نہ ثابت ہو۔

دوسرا قابلِ ذکر روزنامہ " انقلاب " ہے جس کی روح رواں غلام رسول اور عبدالمجید سالک ہیں جن کا پہلے تعلق زمیندار سے تھا۔ " انقلاب " بھی اپنی پالیسی کے لحاظ سے ' زمیندار ' کا مشابہ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ زمیندار نہرو رپورٹ کا موافق اور یہ مخالف وہ ہندوؤں کا دوست ' یہ " دشمن " ہے۔ انقلاب کو جو چیز دوسرے اخباروں سے ممیز کرتی ہے وہ اس کے ' افکار و حوادث ' ہیں جو پہلے زمیندار کی ایک اضافی خصوصیت تھی اس قسم کا عنوان آجکل ہر اخبار کی جان ہے جس کے تحت ایک خاص انداز میں حالات حاضرہ پر تنقید کی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے ذریعہ کس حد تک اخبارات اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان کی وجہ سے اردو ادب میں ' مضحکیات ' کا ایک نیا باب کھلا ہے۔

ان تین اخباروں کے بعد ہم ' ہمدم ' کا مختصراً ذکر کرتے ہیں جو قریب تیرہ چودہ سال سے ملک کی خدمت کر رہا ہے۔ ' ہمدم ' ایک ایسے زمانہ میں جاری ہوا جب شمالی ہند میں کوئی قابلِ ذکر اخبار نہیں تھا اور مولانا جالب نے جس سلامت روی سے اسے چلایا ہے وہ دوسرے اردو اخباروں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیسکتا ہے۔

اردو اخباروں میں ' وکیل ' امرتسر ' جمہور ' کلکتہ ' ملت ' دہلی ' الکلام ' بنگلور ' اچھے نکلتے ہیں اور اگر ذرا انکی بہتری کیطرف توجہ کی جائے تو یہ ملک کی اچھی خدمت انجام دیسکتے ہیں۔ جو اخبارات ہفتہ میں دو تین بار شائع ہوتے ہیں ان میں ' مدینہ ' کی ممتاز

حیثیت ہے۔ ہفتہ وار اخبارات میں اردو کا کوئی اخبار 'ریاست' کا مقابلہ نہیں کرسکتا چار پانچ سال کے عرصہ میں جو قبولیت حاصل کی وہ کسی اخبار کو نصیب نہیں۔ ظاہری خوبیوں اور تصاویر کے علاوہ یہ ایک خاص پالیسی کے تحت شائع ہوتا ہے جو اس کے نام سے ظاہر ہے یعنی والیان ریاست کی خدمت بسا اوقات اپنی خدمت کی انجام دہی میں 'ریاست' حد سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی 'ریاست' کی کوششیں بہت ہی قابل تعریف ہیں اور یہ اردو اخبارات کا رواداری اور آزادی تحریر میں سب سے بڑا پیشرو ہے۔ ان اخبارات کے علاوہ ملک میں بہت سے ایسے اخبار ہیں جو مختلف مذاہب یا فرقوں کے ترجمان ہیں۔ بہت سے اردو اخبارات ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں جو اتنے مشہور نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔

رسائل اس سلسلہ میں اردو رسائل کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ اردو زبان رسائل کی تعداد کی حد تک کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں۔ ان رسائل کی کثیر تعداد ادبی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے زبان اور ادب کی بہت خدمت ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اگر رسائل اس بات کا التزام کریں اور اپنے پڑھنے والوں کے لئے ایسے معلومات بہم پہنچائیں جس سے حالاتِ حاضرہ کی صحیح ترجمانی ہو سکے تو یہ بھی ایک بڑی خدمت ہوگی۔ رسائل (خصوصاً وہ جو خاص مقاصد کے تحت شائع نہیں ہوتے ہیں) زمانہ کے حالات کے مطابق چلنے چاہئیں۔ جیسے جیسے دنیا میں نئی نئی ترقیاں ہوتی جاتی ہیں۔ جیسے جیسے دنیا کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات میں تغیر و تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان سب پر روشنی ڈالنا رسائل کا کام ہے۔

دوسرے ممالک میں جو رسائل شائع ہوتے ہیں وہ خاص مقاصد کے تحت ہوتے ہیں۔ ادبی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، تاریخی، مذہبی وغیرہ۔ اردو کے بہت کم رسائل

ہیں جو خاص مقاصد کو اپنے ساتھ لیئے ہوتے ہیں۔ ایک ہی چیز ہے جو سب میں نظر آتی ہے۔ ایک دو مضامین، افسانے، ترجمے، نظمیں اور غزلیں وغیرہ اگر رسائل اس طریقہ کو چھوڑ کر خاص نصب العین کے تحت شائع ہونے لگیں تو وہ اور قابل قدر خدمت انجام دیں گے۔ لیکن تھوڑے دن سے اردو رسائل میں یہ بات پیدا ہو رہی ہے اور ملک میں بعض ایسے رسائل نظر آتے ہیں جو خاص موضوعات کے لیئے وقف ہیں۔

اردو رسائل میں قابل قدر (اردو، معارف، نگار، ہمایون) زمانہ، مخزن چوٹی کے پرچوں میں ہیں۔ ساتھ ہی بہت سے ایسے رسائل ہیں جن کی وجہ سے اردو ادب کی کچھ کم خدمت نہیں ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں رسالۂ نیرنگ خیال کا ذکر کیا جاسکتا ہے جس کی وجہ رسالوں کی قیمت اور تصاویر وغیرہ کے التزام میں انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔

اردو صحافت کے موجودہ رجحانات

اب ہم مختصر طور پر اردو صحافت کے موجودہ رجحانات پر سرسری نظر ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ اس کا مستقبل کہاں تک خوش آئند ہو سکتا ہے۔ اردو صحافت آج کل جس دور سے گزر رہی ہے وہ اس کا انقلابی دور کہا جا سکتا ہے۔ ہندی اور اردو کے جھگڑے، ملک کی عام سیاسی حالات میں تغیرات ایک طرف اردو صحافت پر برے اثرات ڈال رہے ہیں تو دوسری طرف اردو کی عام مقبولیت اور اس کی ہندوستانی زبانوں میں اہمیت پر اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اردو صحافت بھی جلد ان حالات کا ساتھ دے اور جب تک اردو اخبارات صحافت کے ان اساسی اصول پر کاربند نہ ہوں جن سے حقیقی طور پر رائے عامہ کی تشکیل ہوتی ہے اردو صحافت کا مستقبل علی ہذا ہو سکتا واقعات کی صحیح ترجمانی اور ان پر سنجیدگی سے رائزنی

نہ صرف اخبارات کی اہمیت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ بلکہ ملک میں بیداری اور احساس پیدا کرنے میں بھی ایک زبردست ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ آبادی کی افزونی، تعلیم کی وسعت اور علمی ذوق کے ساتھ کسی ملک میں اخبار کا ہونا ایک قسم کی جمہوری فضا پیدا کرنا ہے اور آج کل جمہوریت کے استحکام میں اخبارات کا جو حصہ ہے وہ مخفی نہیں۔

اخباری پروپیگنڈہ سے بھی ملک کے لوگوں میں بد دلی اور بغض و حسد کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ پروپیگنڈا ایک فن ہے جو خاص حالات میں موثر ہوتا ہے گزشتہ جنگ عظیم میں اس سے جو کام لیا گیا وہ صرف جنگ کی حد تک ہی ٹھیک تھا لیکن اگر اب اس سے وہی کام لیا جائے تو دنیا کے امن و امان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی خدشہ نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات اس بات کے مقتضی ہیں کہ ملک میں امن اور شانتی کی فضا پیدا ہو اور اخبارات جس خوبی سے اس انجام دیسکتے ہیں وہ کانفرسوں اور لیڈروں سے ممکن نہیں۔ اخبار ملک کے رہبر ہوتے ہیں یہی ملک کو تباہی سے نکال کر ترقی کے اعلی مدارج پر پہنچاتے ہیں اور ان ہی سے حکومت کی پالیسی قرار پاتی ہے اور جب تک یہ اس اہم ذمہ داری کو محسوس نہ کریں جو ملک اور قوم نے ان کے تفویض کی ہے تو اس سے یہی بہتر ہے کہ وہ صفحۂ ہستی سے محو ہو جائیں۔ ان کا نہ ہونا ہی ملک کے لئے اچھا ہے۔

اردو صحافت کی موجودہ رفتار ترقی میں دو چیزیں بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک اُردو ٹائپ کی ایجاد اور دوسری صحافتی کانفرنسوں کا انعقاد۔ حقیقت میں یہی دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اردو صحافت اوج کمال کو پہنچ سکتی ہے گزشتہ چند سالوں سے ممالک محروسہ سرکار عالی میں اردو ٹائپ کی ایجاد کے لئے زر کثیر صرف کیا جا رہا ہے۔ اب تک جو کچھ تجربات ہوئے اور ان سے جو نتائج برآمد

ہوئے ہیں وہ حوصلہ افزا ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ اس ایجاد سے دنیائے اردو میں ایک انقلاب برپا ہو جائے گا اور اردو ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش کھڑی ہو سکے گی۔ حال ہی میں ممالک محروسہ سرکار عالی میں اردو صحیفہ نگاروں اور اہل قلم حضرات کی ایک کانفرنس اسی ایجاد پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی اور جو کامیابی اس نے حاصل کی وہ اس انقلاب کا پیش خیمہ ہے جو عنقریب اردو صحافت میں ہونے والا ہے۔

دوسری اہم ضرورت صحافتی کانفرنسوں کی ہے۔ ہر ملک میں اس قسم کی مجلسیں صحافت کی جان ہوتی ہیں۔ صحیفہ نگاروں کا اجتماع اور ان کا باہمی تبادلہ خیال اور ان کا کسی خاص نتائج پر پہنچنا اکثر آپس کی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور اہم اور متنازعہ فیہ مسائل کی گتھی سلجھانے اور اپنی ایک خاص پالیسی قرار دینے میں بہت کارآمد ہوتا ہے۔ ورنہ بعض وقت اخباروں کی رقابت اور ان کی رایوں میں اختلاف ملک کے لئے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ دراصل کسی ملک کی صحافت کا جو رجحان ہوتا ہے وہی ملک کی جملہ ترقیوں کا رجحان ہے۔ اردو صحافت کی اس قسم کی کوئی باقاعدہ جماعت نہیں اور جب تک کہ اس قسم کی کوئی انجمن قائم نہ ہو اردو صحافت میں نہ تو باقاعدگی پیدا ہوگی اور نہ وہ ایک مربوط شکل اختیار کر سکے گی۔ لیکن کبھی کبھی اوقات بعض اخباروں کا قدم اس قسم کی تحریکوں کی طرف اٹھتا نظر آتا ہے لیکن کوئی بارآور نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔

اردو صحافت ایک ترقی پذیر صورت اسی وقت اختیار کر سکتی ہے جب کہ اشتہارات اس کا ایک لاینفک جزو بن جائیں۔ اخبار کے منجملہ اور فرائض کے ایک فرض اس کا اپنے تجارتی اغراض کو بھی پیش نظر رکھنا ہے کیونکہ اشتہار اخبار کے لئے بمنزلۂ خون کے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اسی پر اخبار کی فنا اور زیست کا دارو مدار ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی طرف اگر توجہ کی جائے تو اردو صحافت میں بہت ترقی ہو سکتی ہے۔ اشتہاروں کے بعد اردو اخبار اپنی ظاہری حالت کو سدھاریں اور اپنی قیمت میں مناسبت پیدا کریں۔ ساتھ ہی جس چیز کی طرف ان کو سب سے پہلے اپنی توجہ منعطف کرنی ہے وہ خبروں کا انتظام ہے۔ کتنے اردو اخبار ہیں جن کا تعلق خارجی اور ملکی خبر رساں ایجنسیوں سے ہے؟ کیا اردو اخبار انگریزی اخباروں کے ترجموں کا آئینہ نہیں ہوتے ہیں؟ پھر کتنے اخبار ہیں جن کے اپنے نمائندے ملک اور بیرون ملک میں پھیلے ہوئے ہیں؟ اس سے بڑھکر کونسا افسوس ناک منظر ہو سکتا ہے کہ اردو اخبارات میں دنیا کے دور دراز ملکوں کے حالات وضاحت سے ہوتے ہیں لیکن خود اپنے ملک شہر اور مضافات کے واقعات پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں اگر اردو اخباروں کے لئے ایک خبر رساں ایجنسی کا قیام ہو جائے تو یہ ایک بڑا اسود مند کام ہوگا۔ نہ صرف بیرونی اور خود اندرون ملک جو پروپیگنڈا ہوتا ہے اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ بلکہ اردو صحافت کی انفرادیت ایک مستقل اور مستحکم شکل اختیار کرلے گی۔

اس کے علاوہ اردو صحافت ناتجربہ کار صحیفہ نگاروں کے ہاتھ میں ہے اور یہ ایک بدنما داغ ہے۔ صحافت کو ہندوستان میں بچوں کا کھیل سمجھا گیا ہے معمولی نوشت وخواند اور کچھ تھوڑا سرمایہ کسی شخص کے لئے مدیر بن بیٹھنے کے لئے کافی ہے۔ صحافت ایک قسم کی اہم ذمہ داری ہے اور صحیفہ نگار آزادی، انصاف، صلح و آشتی اور یکجہتی کا علمبردار ہوتا ہے۔ ملک میں جب تک اس ذمہ داری کے بوجھ کو محسوس نہیں کیا جائے گا اور جب تک یہاں صحافتی فضا نہیں پیدا کی جائے گی۔ اردو صحافت ایک فنی اور سائنٹفک حیثیت اختیار نہیں کر سکتی۔ جو لوگ تاریخ اور سیاسیات سے

بے بہرہ، معاشیات اور اقتصادیات سے ناآشنا اور ان باریک مسائل سے واقف جو ان علوم کے مطالعہ کے وقت پیش آتے رہتے ہیں، کیا صحافت کی ذمہ داری کو محسوس کر سکتے ہیں، لہذا اگر ملک میں صحافت کی تعلیم کا بھی انتظام ہو جائے تو ایک حد تک یہ کمی ہو سکتی ہے۔

ساتھ ہی انگریزی داں طبقہ کی اردو صحافت سے بے اعتنائی اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہی ہے۔ یہ طبقہ اردو اخبارات کو پڑھنا کسر شان سمجھتا ہے اور ان میں مضامین لکھنا اور ان مختلف واقعات اور حالات پر جو آئے دن دنیا میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں روشنی ڈالنا اپنے مرتبہ کے خلاف سمجھتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس سے اردو صحافت کی ترقی وابستہ ہے اور اسی سے اس میں حسن و خوبی اور جان پیدا ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ حالات کی نامساعدت، حکومت کی بے پروائی اور ملک کی فضا کا مکدر ہونا بھی صحافت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔

اردو صحافت ابھی عالم طفولیت سے شباب کے پر فضا میدان میں قدم بڑھا رہی ہے جو ترقی اب تک اس نے کی ہے وہ کسی طرح حوصلہ فرسا نہیں۔ ہندوستان آج کل ایک ہیجان انگیز زمانہ سے گزر رہا ہے جس کا لازمی اثر ملک کے تمام حالات اور ترقیوں پر پڑ رہا ہے جوں جوں حالات سدھرتے جائیں گے اس کی ترقیوں میں بھی خوشگوار کیفیت پیدا ہوتی جائیگی۔*

* اس مضمون میں قدیم اردو صحافت کا مواد بیشتر رام بابو سکسینہ کی کتاب (HISTORY OF URDU LITERATURE) سے ماخوذ ہے۔

فریبِ خیال

دل کے سمجھانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

از جناب سید خیرات علی صاحب زیدی. متعلم بی، اے عثمانیہ کالج

(۱)

مکان مختصر، نہایت پُرتکلف اور ایک دلکشا مقام پر واقع تھا۔ آبادی گنجان نہ تھی چوطرف سایہ دار درخت اور سبز خوشنما میدان تھے۔ جہاں مویشی چرا کرتے تھے۔ قریب ہی ایک تالاب تھا جو دلفریبی کو اور بھی دوبالا کر رہا تھا۔

ایسے خوشنما مکان کو اس جگہ دیکھکر کسی قدر حیرت ضرور ہوتی تھی کیونکہ قرب وجوار

میں جتنے مکان تھے وہ سب یا تو کسانوں کے دیہاتی گھر تھے یا پھر مزدوروں کے جھونپڑے۔ مگر یہ ایک چھوٹا سا محل تھا جس کی سفید دیواریں۔ شاندار کھڑکیاں اور ہوا دار برآمدے اطراف کے خوشنما باغ۔ گلاب کے پودوں اور نظر فریب روشوں کے ساتھ مل کر دل کو ایک عجیب تسکین بخشتے تھے۔ مکان کیا تھا نمونۂ جنت تھا۔

میرے ایجنٹ نے مجھے جو پتہ دیا تھا اس کی تصدیق گھر کی تختی دیکھکر ہوگئی مکان کرایہ پر دیا جارہا تھا اور میں اُس کے معائنہ کے لئے آیا تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی سو گز کے فاصلہ پر ایک غیر کا مکان تھا گھنٹی کی آواز سُن کر اُس مکان سے دو آدمی ایک مزدور ایک عورت ــــ برآمد ہوے۔ کچھ دیر میری طرف دیکھا۔ اور آگے بڑھے۔ وضع سے دونوں دیہاتی معلوم ہوتے تھے۔

"کیا آپ ہی مالکِ مکان ہیں؟" میں نے دریافت کیا "میں مکان کے معائنہ کی غرض سے آیا ہوں۔ غالباً ایجنٹ صاحب نے آپ کو اس کی اطلاع دیدی ہوگی"۔

مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ وہ اس معاملہ کی گفتگو سے کسی قدر پریشان ہوگئے پریشان کیا بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ میری گفتگو سے انہیں تکلیف ہورہی تھی۔

میاں بیوی نے ایک دوسرے پر متفکر نظریں ڈالیں۔ عورت ایک عجیب دماغی ہیجان کے عالم میں ہاتھ ملنے لگی۔ مرد نے میری طرف دیکھا اور رُک رُک کر کہنے لگا "آپ مکان کے معائنہ کے لئے آئے ہیں؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "ایجنٹ صاحب نے تو آپ کو کہدیا ہوگا نا؟ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج اس وقت آپ میرے منتظر رہیں گے"۔

"ہاں ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے" معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب اس معاملہ پر کچھ گفتگو کرنی نہیں چاہتا۔ اُس نے اپنی بیوی پر ایک اور متفکرانہ نظر ڈالی۔ عورت نے مایوسی

سے اپنا سر جھکا لیا۔

"جناب" مرد نے گویا واقعات کو سمجھاتے ہوئے کہنا چاہا "ہم ـــ" مگر پریشان ہوکر اس طرح خاموش ہوگیا جیسے اُسے اظہار خیال کے لئے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔

"شاید مکان کرایہ پر دیا جاچکا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ مکان کرایہ پر نہیں دیا گیا" اس نے جواب دیا۔

"تم جاکر کنجی لے آتے تو اچھا تھا" عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں اسی طرح مایوس نظروں سے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ اُسی دہقانی مکان کی طرف جانے لگا۔ اُس کے جانے کے بعد ایک خاموشی چھاگئی۔ عورت اُسی طرح ہاتھ ملتی رہی۔ میں نے کوشش کی کہ کچھ گفتگو کروں اور منظر کی دلفریبی کا ذکر چھیڑا۔ اُس نے اخلاق کے ساتھ مگر آہستہ سے کچھ جواب دیا جس سے ایک عجیب مکان کا اظہار ہو رہا تھا میں نے پھر کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کی۔

تھوڑی دیر میں اُس کا شوہر بھی آگیا۔ اور دونوں نے خاموشی سے مجھے مکان بتانا شروع کیا۔

سب سے نیچے دو خوشنما ملاقات کے کمرے تھے اور ایک نہایت نفیس طعام کا کمرہ۔ دونو کمرے نہایت ہی پُرتکلف طریقہ پر آراستہ تھے۔ کھڑکیاں باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ میں نے مکان کی بے انتہا تعریف کی جس سے دونو میاں بیوی کی حالت میں کچھ تغیر ہوا۔ کسی قدر خوشی اور اطمینان اب یاس اور تردد کی جگہ لے لی۔ میرے سوالات کا اب انھوں نے قدرے تبسم اور دلچسپی سے جواب دینا شروع کیا۔ مگر پھر بھی ان کی حالت متفکر تھی۔ اُس

آدمی کی سی حالت کہ جسے کوئی ناقابل برداشت صدمہ پہنچا ہو۔ کمروں کے دروازے کھولتے وقت اُن کے ہاتھ کانپتے تھے۔ ان کی آواز میں ایک کپکپی تھی۔ ان کی مسکراہٹ میں بھی غم کی ایک ہلکی سی جھلک تھی گویا کہ یہ دریائے رنج و الم کی سطح پر تبسم کے چند ناپائدار بلبلے ہیں۔

"آہ" میں نے دل میں کہا "غریب بے انتہا محتاج ہیں۔ شاید بے چاروں نے اپنی ساری پونجی اس مکان میں لگا دی ہے اور اب مکان کرایہ پر دینا انہیں شاق گزر رہا ہے۔"

"چلیے اوپر چلکر سونے کے کمرے بھی دیکھ لیجیے" مرد کہنے لگا۔

یہ کمرے نہایت ہوادار اور بے انتہا دلفریب تھے دریچوں پر خوشنما پردے پڑے تھے اور تمام ضروری سامان مہیا تھا۔ ان میں سے ایک کمرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی اس میں رہتا ہے۔ چند اشیاء اور ایک عورت کا لباس قرینہ سے رکھا تھا۔۔۔۔ یہ آخری کمرہ تھا جس میں ہم گئے اور اس کا رخ تالاب کی طرف تھا۔ سنگھار کی میز پر آئینہ کے سامنے کنگھیاں۔ برش اور دیگر لوازمات حسن تھے۔ لکھنے کی میز پر قلم دوات و کاغذ وغیرہ رکھے تھے۔ کتابیں سلیقہ سے جمائی گئی تھیں اور دیواریں تصاویر سے مزین۔ لباس کے اسٹینڈ کے نیچے جوتے اور سلیپر رکھے تھے۔ خوبصورت مسہری پر خوشنما جالی کے پردے پڑے تھے اور سرہانے کی طرف ایک اونچے تختہ پر ایک نہایت نظر فریب جلد شاید کسی مذہبی کتاب کی رکھی تھی۔

"کیا اس کمرے میں کرایہ دار ہیں" میں نے دونوں سے دریافت کیا۔

عورت خاموش ہوگئی جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ اُس کی نظریں ایک مقام پر جم گئی تھیں اور منہ کسی قدر کھلا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے حد تھکی ہوئی ہے اور اس کی

منتظر ہے کہ جلد مکان کا معائنہ ختم ہو ـــــ مرد نے اوپر سر اٹھا کر عجیب طرح سے جواب دیا۔ "جی نہیں فی الوقت کوئی کرایہ دار نہیں"

اب ہم نیچے اتر آسے۔ کرایہ نامہ لکھا گیا۔ اور موسم گرما کے لئے میں نے مکان کرایہ پر لے لیا۔ قرار پایا کہ مالکِ مکان اپنی گاڑی میں میرے گھر آکر مجھے مع سامان کے یہاں پہونچا دے۔

(۲)

چہارشنبہ کے روز تقریباً آدھ گھنٹہ تک ہم دونوں گاڑی میں خاموش سفر کرتے رہے۔ بالآخر وہ کہنے لگا۔

"وہ کمرہ ـــــ وہ کمرہ جس میں آپ نے سمجھا تھا کرایہ دار ہے" اس پر اس نے چپ سادھ لی۔

"ہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میری ایک درخواست ہے" وہ کچھ رک کر لجاجت سے گھوڑے کے کانوں پر نظر جمائے ہوئے کہنے لگا۔

"فرمائیے فرمائیے" میں نے کہا۔

"اگر آپ اُس کمرہ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں تو ہم کرایہ میں کمی کر دیں گے۔ کیا آپ ہم سے اتنی رعایت کر سکتے ہیں؟" اُس نے عجیب مایوسی سے یہ سوال کیا آپ تنہا ہیں۔ اگر آپ اس کمرے کو چھوڑ بھی دیں تو گھر کا باقی حصہ آپ کے لئے بالکل کافی ہو سکتا ہے۔

میں فوراً راضی ہو گیا۔ اگر وہ چاہتے تھے کہ اس کمرے کو اُس کی حالت پر رہنے دیں

تو وہ خوشی سے ایسا کر سکتے تھے ۔

"شکریہ ـــــ شکریہ ـــــ میری بیوی آپ کی بے حد ممنون ہوگی"۔

تھوڑی دیر اور ہم خاموش رہے ۔ بالآخر اس نے کہا "آپ ہمارے پہلے کرایہ دار ہیں ۔ اس سے قبل یہ مکان ہم نے کسی کو کرایہ پر نہیں دیا"۔

"اچھا ؟ کیا آپ کو اسے بنائے ہوئے بہت عرصہ ہوا ؟"

"میں نے یہ ـــــ میں نے یہ مکان چھ سال ہوئے بنوایا تھا" پھر کچھ دیر ٹھہر کر کہنے لگا ۔ میں نے ایسے اپنی لڑکی کے لئے تعمیر کروایا تھا"۔

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی ۔ معلوم ہو رہا تھا کہ گویا اُسے اور بہت کچھ کہنا ہے جس کی یہ صرف ابتدا تھی ۔

میں نے دلچسپی کے ساتھ اپنا قصہ جاری رکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا "اچھا" ؟

"آپ جانتے ہیں میں اور میری بیوی کس قسم کے آدمی ہیں"۔ وہ یکایک گویا ہوا "ہم سیدھے سادھے دہقان ہیں ۔ لیکن میری لڑکی ایسی اچھی تھی جیسے ہیرا ۔ ایسی خوبصورت تھی جیسے گلاب"۔

اس نے پھر گھوڑے کی طرف توجہ منعطف کی اور ایک دو منٹ تک خاموشی سے گاڑی ہانکتا رہا ۔ پھر اُسی طرح گھوڑے کے کانوں پر نظر جمائے ہوئے : "اس قصبہ میں کوئی لڑکی بھی اُس جیسی حسین نہ تھی"۔ اس نے تیزی سے بلند آواز میں کہنا شروع کیا گویا کہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے ۔ پھر اسی طرح گھوڑے کے کانوں پر نظر جمائے ہوئے : "وہ خوبصورت تھی ـــــ خلیق اور ملنسار تھی ـــــ تعلیم یافتہ تھی چھ سال ـــــ بارہ سال کی عمر سے اٹھارہ سال تک ـــــ وہ تعلیم پاتی رہی مدرسہ

ہیں اُس کو بہت سے انعام ملے ۔ بتائیے" وہ یکایک پلٹ کر عجیب وحشت سے کہنے لگا
"آپ ہی بتائیے ۔۔ کیا ایک معمولی کسان کی جھونپڑی اُس کے لائق ہوسکتی تھی ؟"
پھر اپنے سوال کا آپ ہی جواب دیتے ہوئے : "نہیں نہیں ۔۔ ہرگز نہیں ۔۔
کبھی نہیں ۔۔ کیا آپ ہیرے کو کوڑے میں پھینکدیں گے ۔ میری لڑکی ہیرے سے
بھی زیادہ قیمتی تھی ۔۔ ہائے" وہ پکار اٹھا" اسکے ہاتھ ریشم جیسے ملائم ہاتھ ۔۔
ان میں کتنی میٹھی خوشبو تھی ۔۔ میں انھیں چومتا تھا ۔۔ میں ۔۔ میں انھیں سونگھا
کرتا تھا جیسے کوئی گلاب کو سونگھتا ہے ۔"

اس کی آواز رک گئی اور ایک خاموشی چھاگئی ۔ پھر کچھ دیر بعد کہنے لگا : "میرے
پاس بہت سا روپیہ تھا ۔ میں سارے قصبہ میں سب سے زیادہ مالدار تھا ۔ میں نے
معماروں کو بلا کر اپنی لڑکی کے لئے یہ مکان بنوایا ۔ میں نے اس کو سجایا تاکہ وہ ایک
ملکہ کا محل معلوم ہو ۔ اور جب وہ تعلیم ختم کر کے آئے تو اس کی شان کے لائق مکان
اس کو ملے ۔ دیکھئے یہ دیکھئے" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دیا
یہ اس نے کھچوائی تھی ۔ کیا وہ محلوں کے قابل نہ تھی ۔؟"

یہ ایک تقریباً سترہ ۱۷ سالہ لڑکی کی تصویر تھی ۔ چہرے سے تبسم اور بھولا پن ٹپکتا تھا
بڈھا دم بخود بیٹھا رہا ۔ میں نے جس طرح ممکن تھا اس کی دلجوئی کی ۔ اس نے کانپتے
ہاتھوں سے تصویر لے لی اور جیب میں رکھ لی ۔ پھر عجب یاس انگیز لہجہ میں کہنے لگا
"خدا کی مرضی میں کسی کو کیا دخل ۔ میں نے اپنی لڑکی کے لئے مکان تعمیر کروایا
اور جب وہ بن گیا تو اُس نے اُس کو اپنے پاس بلالیا ۔ میں اور میری بیوی اس صدمہ
سے دیوانے ہو گئے ۔ مگر سب بے سود تھا ۔ شاید اب بھی ہم دیوانے ہیں" وہ عجب
سادگی سے کہنے لگا ۔ "دن رات ہمیں اسی کا خیال رہتا ہے ۔ ہم کو ہر چیز سے وحشت ہوتی ہے

ہم اس مکان میں ـــــ اس کے مکان میں بغیر اس کے کیسے رہ سکتے تھے؟ میں نے اس کے لیے مکان بنوایا اس کے لیے اسے آراستہ کیا اور جب سب ہو گیا تو وہی نہ رہی۔ آپ خود بتائیے یہ کتنا بڑا صدمہ ہے؟ میں دوسروں کو مکان کرایہ پر کیسے دیتا؟ لیکن اب میں قرض میں ڈوب گیا ہوں اور اُس کے ادا کرنے کے لیے میں گھر کرایہ پر دینے کے لیے مجبور ہوں ورنہ میں کسی اور کو کروڑہا روپیوں میں بھی نہ دیتا۔ مگر آپ صاحب درد ہیں۔ میں آپ سے بالکل مطمئن ہوں۔ اب ہمیں اس کی اجازت دیں گے کہ ہم کمرے کو اس کے کمرہ کو اسی حالت میں رہنے دیں۔ وہی کمرہ ـــــ جس میں آپ نے خیال کیا تھا کہ کرایہ دار رہیں ـــــ وُہی اُس کا کمرہ تھا۔

پائین باغ میں اُس کی بیوی ہماری منتظر تھی۔ اس نے متجسس نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ بڈھے نے سر ہلا کر جواب دیا "سب ٹھیک ہو گیا کرایہ دار صاحب راضی ہیں"۔

غریب عورت نے میرے ہاتھ پکڑ لئے اور گڑگڑا کر کہنے لگی "آپ بڑے رحم دل ہیں ـــــ بڑے مہربان ہیں"۔ اُس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کی آنکھوں کو دیکھ سکوں۔ اُن میں ایک رنج۔ ایک معصومیت ایک تقدس تھا۔ میرے لئے ان پر نظر ڈالنا ایسا تھا جیسا کسی ناپاک کا ایک مقدس درگاہ میں داخل ہونا۔

(۳)

تین ماہ تک میں وہاں رہا اور اس عرصہ میں دونو میاں بیوی سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ عورت بیچاری میرا تمام کام کاج کرتی میرے اس کو اس قدر

دلچسپی تھی گویا کہ وہ میری ماں ہے۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد یہ تھا کہ اپنی لڑکی کی خوبیاں بیان کریں۔ ان کا رنج والم۔ لڑکی سے ان کی وابستگی اور اس کا دائمی خیال یہہ تمام باتیں اپنے اندر کچھ عجیب درد اخلاص اور حزن کا پہلو رکھتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ نامراد لڑکی کی روح گھر میں موجود ہے۔ وہ گھر جسے **محبت** نے اس کے لئے بنایا تھا اور اس کی خبر نہ تھی کہ عین اس وقت جبکہ وہ مکمل ہوچکیگا **موت** اسے" اس سے جدا کردیگی۔ ہم آپ کا کس طرح شکریہ ادا کریں کہ آپ نے کمرہ ہماری خاطر چھوڑ دیا۔" وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے۔

ایک روز عورت مجھے اوپر لے گئی اور لڑکی کا لباس اُس کی خوبصورت کتابیں جو اُسے انعام میں ملی تھیں۔ غرض اُس کی ہر چیز مجھے بتائی اور پھر رو رو کر کہنے لگی: "ہائے تو مرگئی۔ ہم کیسے دل کو سمجھائیں۔ یقین بھی تو نہیں آتا۔" پھر گڑگڑا کر دعا مانگتے ہوئے: میرے مالک تو ہمیں بھی اُٹھالیتا تو خوب ہوتا ـــ مگر جو تیری مرضی۔ بندہ کا کیا دخل۔"

میرے وہاں سے چلنے کے تقریباً ایک ماہ پیشتر لڑکی کی برسی ہوئی۔ میں بھی اُس میں شریک ہوا حاضرین میں ایک بڈھا بھی تھا۔ جس نے لڑکی کے ناشاد والدین کی بہت دلجوئی کی اور دیر تک انھیں صبر کی تلقین کرتا رہا۔

(۴)

اس کے ایک ماہ بعد میں اُن سے جدا ہوکر اپنے مکان آگیا۔ ایک دن دوپہر کے وقت راستہ میں اُسی بڈھے سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ سلام علیک۔ اور مزاج پرسی کے بعد ہم باتیں کرنے لگے۔ اثنائے گفتگو میں لڑکی کے والدین کا ذکر آیا ہے۔ اور بڈھے نے ان غمزدوں کی حالت پر اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا: "ان کی محبت عام

محبت سے بہت بالا تھی۔ وہ لڑکی کو ایک دیوی سمجھتے تھے ــــ اس کی پرستش کرتے تھے۔ میں نے ایسی محبت کبھی نہیں دیکھی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو مجھے تو ڈر تھا کہ یہ دونوں دیوانے ہو جائیں گے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ چند روز تک ان کی عجیب حالت رہی جدائی کا صدمہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ لیکن خدا مہربان ہے وہی چارہ ساز ہے وہ بڑی سی بڑی اور کڑی سے کڑی مصیبت میں بھی انسان کو صبر دیتا ہے۔"

"وہ جس طریقہ پر اس کی یاد تازہ رکھتے ہیں مجھے بیحد پسند ہے" میں نے کہا "آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ انھوں نے اس کمرے کو بالکل اُسی حالت میں رہنے دیا ہے جس حالت میں کہ مرحومہ چھوڑ گئی تھی"۔

"اس کا کمرہ!" بڈھے نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کونسا کمرہ؟"

"اچھا آپ کو نہیں معلوم" میں نے متعجب ہو کر سوال کیا "اس کے سونے کا کمرہ۔ وہ بالکل اسی حالت میں ہے جس حالت میں کہ اس کے انتقال کے وقت۔ اس کا لباس۔ کتابیں اور دوسرا تمام سامان اُسی طرح رکھا ہوا ہے"۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" بڈھے نے کہا "اس کا کوئی کمرہ ہی نہ تھا"۔

"جی نہیں" میں نے اسے سمجھایا "بالائی منزل کا سامنے والا کمرہ۔ یہی اس کی خوابگاہ تھی"

لیکن اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کبھی اس مکان میں نہیں رہی پرانے مکان ہی میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ نیا مکان پوری طور پر مکمل بھی نہ ہوا تھا۔ مزدور تک تو باہر نکلے نہ تھے"۔

"نہیں آپ غلطی کر رہے ہیں" میں نے کہا "شاید آپ کو خیال نہ ہو۔ مجھے اچھی طرح یقین ہے۔ اس کے والدین نے متعدد بار مجھ سے اس کا ذکر کیا ہے"۔

"لیکن جناب میں جو آپ سے کہتا ہوں" بڈھے نے متانت سے جواب دیا "مجھے

صرف یقین ہی نہیں بلکہ میں واقف ہوں۔ میں خود انتقال کے وقت موجود تھا۔ اُس دیہاتی مکان میں اسکی موت واقع ہوئی وہ نئے مکان میں منتقل ہی نہ ہوئے تھے مکان ابھی آراستہ ہو رہا تھا جس روز اس کا انتقال ہوا اس کے بس ایک ہی روز پیشتر تمام آرائش کا سامان نئے مکان میں جا چکا تھا۔ اس مکان میں اب تک کوئی ٹھہرا ہی نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں رہنے والے آپ پہلے شخص ہیں"۔

میں نے کہا "تعجب ہے" اور ایک منٹ تک مبہوت سا رہ گیا لیکن صرف ایک منٹ۔ یکایک میرے منہ سے نکلا "میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا"۔

ہاں ــــ میں سمجھ گیا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کس حسن سے ان غریب بیکسوں نے اپنے آپ کو دہوکا دیا تھا۔ انہوں نے اپنی لڑکی کے لئے مکان بنوایا جو بنا ہی تھا کہ وہ چل بسی ــــ یہ خیال کہ وہ ایک دن یا ایک گھنٹہ تک بھی اس میں نہ رہی اس کا لطف نہ اُٹھا یا ان کے لئے ناقابل برداشت ــــ تھا۔ اس لئے ــ معصومیت کے ساتھ ــــ آنکھیں بند کئے تاکہ انہیں معلوم تک نہ ہو کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ مرحوم لڑکی کا سارا سامان وہاں لیگئے اور اُس کمرے میں جا دیا جس میں اُن کی آرزو تھی کہ لڑکی رہتی اور کہا یہ اس کا کمرہ تھا۔ یہ اس کا کمرہ تھا"۔ ان کا دل اس کو باور ہی نہ کر سکتا تھا انہیں اس کا یقین ہی نہ آتا تھا کہ غریب لڑکی ــــ نامراد لڑکی ایک رات بھی اس کمرہ میں نہ سوئی تھی انہوں نے اپنے آپ سے ایک جھوٹ کہا ــــ ایک نہایت مقدس اور دلفریب جھوٹ۔ یہ ایک آنکھ مچولی تھی جو غریب ماں باپ بچوں کی طرح کھیل رہے تھے۔ بڈھے جس نے ساری حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ سچ کہا تھا کہ "خدا مہربان ہے"۔

ــــ ہاں خدا مہربان تھا۔ آخر میں وہ وقت آیا کہ وہ اس مقدس جھوٹ کو صداقت سمجھنے لگے۔ اور انہیں تسکین ہونے لگی وہ بھول گئے کہ جو آنکھ مچولی وہ کھیل رہے تھے حقیقتاً وہ ایک فریب خیال تھا ایک تسکین کا کذب تھا جواب ان کیلئے دلفریب صداقت بن چکا تھا۔ انہوں نے حقیقت کی طرف سے آنکھ بند کر لی تھی اور جھوٹ سے انہیں تسکین ہو رہی تھی۔ لیکن کیسا جھوٹ؟ ــــ ایک نہایت مقدس اور دلفریب جھوٹ

جھوٹ ــ سچ؟ نہیں میں سمجھتا ہوں کہ کئی غلط فہمیاں ہیں جو جھوٹ نہیں ہو سکتیں ــــ یہ خود صداقت کے ترحم آمیز تبسم ہیں۔

تبصرے

انتخاب ہندی کلام مؤلفہ ڈاکٹر جعفر حسین صاحب استاذ معاشیات و عمرانیات کلیۂ جامعہ عثمانیہ اس کتاب میں سلیس اور معنی خیز ہندی دوہے جمع کئے گئے ہیں دوہے ہندی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں لیکن نیچے اردو رسم الخط میں بھی لکھدیئے گئے ہیں۔ مشکل ہندی الفاظ کے معنے علحدہ دیئے گئے ہیں۔ اردو میں دوہوں کی کہیں تشریح اور کہیں ترجمہ درج ہے۔

بعض جگہ ہندی شاعری کے نقطۂ خیال کا تقابل انگریزی اور اردو شعراء کے کلام اور یورپ کے اہل نظر اصحاب کے اقوال سے کیا گیا ہے جس سے مضمون کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا ہے۔

دوہوں کو بڑی خوبی سے مختلف عنوانوں کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ مثلاً (۱) ہندی جذبات عالیہ (۲) فلسفیانہ مسائل وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب عام اردو دان اصحاب کو ہندی ادب لطیف سے

روشناس کرانے کے لئے لکھی ہے۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ ہندی دوہوں کا ترجمہ صفائی اور سادگی سے کیا جاتا۔ لیکن اکثر جگہ ترجمہ صاف اور واضح نہیں ہے۔ تشریح و مطلب میں بھی بعض جگہ بیان پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ تلمیحات کی بعض مقامات پر تو تشریح کر دی گئی ہے لیکن بعض جگہ اس کا لحاظ نہیں کیا گیا اس لئے مطلب غیر واضح رہ گیا ہے۔

مثلاً صفحہ ۲۷ پر

اُجل برن ادھیم گت ایک چرن دوئے دھیان میں جانوں کوئی بھگت ہی پرنپٹ پاپ کی کھان

اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے "صاف لباس اور سیدھی ادا مگر ایک کردار میں دو "دھیان" میں سمجھتی تھی کہ کوئی بھلا مانس ہے مگر وہ تو برائیوں کا خزانہ ہے" اتنی تشریح سے معنی صاف نہیں ہوئے اس دوہے میں "ایک بگلہ کو دیکھکر" شاعر نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک پاؤں پر پانی میں کھڑا ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور اس انداز سے کھڑا ہے کہ گویا کوئی جوگی دریا کے کنارے تپسیا کر رہا ہے اور گیان دھیان میں مصروف ہے۔ اتنے میں پانی میں سے ایک مچھلی اچھلتی ہے اور وہ بگلہ جھپٹ کر لے اڑتا ہے۔ شاعر کو خیال ہوتا ہے کہ آپ کے طور سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑے زاہد ہیں لیکن معلوم ہوا کہ بڑے پاپی ہیں۔ آپ جوگیوں کی طرح کھڑے تو ایک پاؤں پر تھے لیکن خیال میں یکسوئی نہ تھی اور دھیان دوسری طرف بھی تھا کھان کے معنی خزانہ کے لکھے ہیں لیکن صحیح معدن ہے۔ یا مثلاً صفحہ ۱۹۷ پر ایک دوہا ہے۔

چاکی چاکی سب کہیں مانی کہے نہ کوئی مانی سے جو لگ رہا بال نہ بیکا ہوے

مطلب صاف ہے۔ چکی میں جو اناج پاٹوں کے بیچ آ جاتا ہے پس جاتا ہے لیکن جو دو چار دانے مانی کے آس پاس جا لگتے ہیں وہ پسنے سے بچ جاتے ہیں۔ اسیطرح جو شخص مرکز اور مبدء عالم یعنی خالقِ کائنات سے وابستہ ہو جاتا ہے اُسے کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جو شخص اسباب و علائق دنیوی میں پھنسا رہا ہے اور صرف اس طرح اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈتا ہے وہ ہمیشہ

سرگردان رہیگا۔ اُسے بقا حاصل نہ ہوگی! لیکن ڈاکٹر صاحب نے جو تشریح کی ہے اس سے مانی وغیرہ کے استعارہ کی وضاحت نہیں ہوتی۔ بعض جگہ اردو رسم الخط میں ہندی الفاظ کا تلفظ صحیح نہیں کیا گیا مثلاً صفحہ ۸۷ پر بیڑہی کو ٹھڑی اور صفحہ ۳۷ پر دھیان کو دیہان لکھا گیا ہے۔ کتاب کا نام انتخاب ہندی کلام ہے جو از روئے قواعد نحو صحیح نہیں۔ ہندی کلام فارسی کی ترکیب نہیں۔ اس لئے انتخاب کی کلام کی طرف اضافت غلط ہے۔ اسی طرح جا بجا زبان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور جگہ جگہ زبان محاورہ سے گری ہوئی ہے۔ مثلاً صفحہ ۶ پر جس وقت انسان خوشباش MOOD میں ہوتا ہے یا اسی صفحہ پر "عالم بھی بعض وقت سطحی چیزوں کے لذت گیر ہوا کرتے ہیں"۔ دونوں جگہ زبان محاورہ کے خلاف ہے صفحہ ۱۸ پر "ہندی شعراء زیادہ تر الفاظ میں موسیقی کا لحاظ کرتے ہیں اس جملہ میں تعقید ہے۔

اسی صفحہ پر دوسری جگہ سلسلہ نعمانی کی ترکیب کچھ عجیب ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۹ پر غیر اغلب۔

صفحہ ۲۱ پر "ہندی شعرا کی انداز تحریر"۔ انداز شعراء کے طرف مضاف ہے اس لئے کی غلط ہے۔

صفحہ ۲۳۔ اس ہم شیر شیریں زبان کی طرف متوجہ ہوں ہم شیر کا لفظ اردو میں یہ مفہوم نہیں ادا کرتا۔

صفحہ ۲۴۔ تشہیر و مقبول عام بنانے کیلئے باضابطہ جد وجہد کریں۔ لفظ تشہیر بے محل ہے۔

صفحہ ۳۰۔ "بہت کچھ اضافہ کی ضرورت مطلوب ہے"۔ ضرورت مطلوب ہے محاورہ کے خلاف ہے۔

صفحہ ۲۸ پر "اورنگ زیب کے پوتے" کی جگہ "اورنگ زیب کا پوتا" ہونا چاہیئے۔ انگریزی عبارتوں کے ترجمہ میں بھی کہیں کہیں کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔

مثلاً صفحہ ۲۴ پر

کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے "اس کی مستحق ہے کہ موجودہ زمانہ کی توجہ سے بہت زیادہ اس کا مطالعہ کیا جائے" ترجمہ میں سر مطلب واضح نہیں ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ اس کے مطالعہ پر اب تک جتنی توجہ کی گئی ہے۔ ناکافی ہے)اس سے زیادہ توجہ کی جانی چاہیئے۔

اسی طرح صفحہ ۳۱ پر

ترجمہ کیا گیا ہے۔

انسانی جذبات کے مختلف النوع احساسات کو ظاہر کرتی ہے۔

جذبات، کہ احساسات کی ترکیب عجیب و غریب ہے۔

کہیں انداز تحریر ایسا ہے کہ عبارت بالکل کسی انگریزی جملہ کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتی ہے جس کتاب کا موضوع بحث ادب کا ایک اہم شعبہ یعنے شاعری ہو اس میں زبان کی اتنی غلطیاں نظرانداز نہیں کی جاسکتیں۔ بہتر ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب اشاعت سے قبل مطالب کی تشریح اور زبان کی صحت کے لئے کسی تجربہ کار اردو ہندی دان استاد سے مدد لیتے۔ بحیثیت مجموعی کتاب کا مطالعہ اردو داں اصحاب کے لئے فائدے سے خالی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہندی شعرا کے خیالات و جذبات اور اُن کے بیان کردہ اصول اخلاق و معاشرت پر نہایت خوبی سے بحث کی ہے کتاب میں یہ عنصر خاص توجہ کا مستحق ہے۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب اور پاکیزہ ہے۔ ملنے کا پتہ حیدرآباد بک ڈپو۔

مسلم ہوسٹل میگزین یہ رسالہ الہ آباد یونیورسٹی کے مسلم طلبا کے اقامت خانہ سے شائع ہوا ہے یہ ہر سال کے تعلیمی دور میں تین بار شائع ہوگا۔ سالانہ قیمت ڈھائی روپے کلدار ہے۔ لکھائی چھپائی صاف ہے۔ یہ رسالہ بھی "مجلہ عثمانیہ" کی طرح گنگا جمنی ہے۔ انگریزی اور اردو مضامین پر مشتمل ہے۔ مضامین علمی ادبی دلچسپ اور مفید ہیں۔ مسلم طلبا و اساتذہ نے خامہ فرسائی کی ہے۔ رسالہ کی ترتیب سے عملۂ ادارت کا ذوق اور خوش اسلوبی ظاہر ہے۔ ایک اقامت خانہ کے طلبا کی یہ علمی ہمت قابل داد ہے۔ ہم اس معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں اور کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔

کُلیہ کی خبریں

جاڑے کی چھٹیوں میں جناب صدر صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ کا مزاج علیل ہوگیا تھا۔ بحمداللہ آپ اچھے ہوگئے۔ باوجود نقاہت و کمزوری کے تعلیمی اور انتظامی فرائض میں مصروف ہیں۔ "میقات ثانی میں امتحان پیش نظر ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیمی مصروفیت غالب ہے۔ برادران کلیہ مختلف کھیلوں کے مقابلوں میں برابر شریک ہو رہے ہیں۔ اس میقات میں تیراکی کی مشق کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس غرض سے طلبہ کا انتخاب ہو رہا ہے۔

یورپ سے واپسی اور تقرارات

جناب مولوی محمد الیسین خاں صاحب بی۔ اے۔ عثمانیہ۔ بی۔ ایس سی (انجینئرنگ فسٹ کلاس آنرس لندن یونیورسٹی)

جناب مولوی محمد علی خاں صاحب بی اے عثمانیہ۔ بی۔ ایس۔ سی۔ آنرس (طبیعیات لندن یونیورسٹی)

جناب سید غلام محی الدین صاحب زور ایم۔ اے عثمانیہ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ فل اور جناب مولوی فاضل سیاد تعلیم صاحب ام۔ اے، ال۔ ال۔ بی عثمانیہ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (اسلامی قانون) بی۔ سی۔ یل (اکسفورڈ)

تکمیل تعلیم کے بعد بخیریت حیدرآباد واپس آئے۔ مولوی یٰسین علیخاں صاحب نے امتحان میں نہایت غیر معمولی امتیاز حاصل کیا ہے۔ جس کی بنا پر آپ کو اعزازی انعام اور چاندی کا تمغہ عطا کیا گیا۔ ان میں سے جناب محمد علی خاں صاحب و جناب زور صاحب اور مولوی سیادت صاحب کا علی الترتیب کلیہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ طبیعیات، شعبۂ اردو اور شعبہ قانون میں تقرر ہوا ہے۔

تحصیلداری کے انتخابات

اس سال محکمہ معتمدی مالگزاری نے کارآموز تحصیلداری کے لئے جن اصحاب کا انتخاب کیا! ان میں ہمارے کالج کے حسب ذیل طلبا بھی ہیں۔

(۱) جناب نبی الحسن صاحب شمیم بی۔ اے عثمانیہ حصہ اردو "مجلۂ عثمانیہ"

(۲) جناب محمد مظہر حسین صاحب بی۔ اے عثمانیہ۔ نائب صدر انجمن اتحاد کلیۂ عثمانیہ۔

(۳) جناب سمیع اللہ بیگ صاحب بی۔ اے عثمانیہ۔

ہم ان بھائیوں کو ان کی اس خوش نصیبی پر مبارکباد دیتے ہیں! کیونکہ اس زمانہ میں بی۔ اے ہونے کے بعد نوکر ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

مضمون نگاری کا بین الکلیاتی مقابلہ

اس سال نظام کالج کی طرف سے سالانہ جلسہ کی تقریب میں اردو مضمون نگاری کا ایک بین الکلیاتی مقابلہ ہوا جس میں مولوی فضل اللہ صاحب متعلم سال چہارم (کلیہ جامعہ عثمانیہ) نے انعام اول (طلائی تمغہ) حاصل کیا۔

بزم سائنس کے انتخابات

بزم سائنس کے سالانہ انتخابات، میقات اول کے آخری دنوں میں عمل میں آئے۔ اور حسب ذیل عہدہ دار اراکین کابینہ کا انتخاب ہوا۔

محمد صدیق صاحب متعلم ایم۔اے (ابتدائی) نائب صدر۔
محمد باقر حسن صاحب متعلم بی۔اے معتمد۔
خواجہ عبدالواسع صاحب متعلم بی۔اے خازن۔
سید منظور حسین صاحب متعلم بی۔اے رکن کابینہ
مرزا شرافت اللہ بیگ صاحب متعلم بی۔اے رکن کابینہ۔
محمد عبدالغنی صاحب متعلم بی۔اے رکن کابینہ۔
اقبال احمد صاحب متعلم سال اول رکن کابینہ۔ محمد صالح صاحب ہاشمی رکن کابینہ۔

جناب وحید الرحمن صاحب پروفیسر طبیعیات نے صدارت بزم کی خدمت سے سبکدوشی حاصل کی اور جناب ڈاکٹر سید حسین صاحب پروفیسر کیمیا اس عہدہ پر متقرر ہوئے۔

جدید کابینہ کے زیر اہتمام، طلبا رسائنس کی ایک جماعت نے دواخانہ عثمانیہ افضل گنج کے شعبہ برقی کا معائنہ کیا۔

ہم جناب ڈاکٹر عبدالجبار صاحب کے ممنوں ہیں کہ آپ نے نہایت دلچسپی کے ساتھ تمام آلات بتلائے اوران کے اصول عمل کی توضیح کی۔

تحریری مقابلہ کے لیے حسب ذیل مضامین کا اعلان کیا گیا۔
برائے سال اول و دوم :- فوٹوگرافی۔
برائے سال سوم و چہارم :- لاسلکی
برائے سال پنجم و ششم :- ریاست حیدرآباد کی ترقی کے ذرائع مضامین وصول ہوچکے ہیں اور زیر غور ہیں۔

بزم کے قوانین کی ترتیب و ترمیم ہورہی ہے اور عنقریب جدید قوانین کے نفاذ کی توقع کی جاتی ہے۔

"انعامات محلس میلاد" عثمانیہ کالج میں ہر سال مذہبی مضمون نگاری کا ایک مقابلہ ہوتا ہے گذشتہ سال کے مقابلہ میں حسب ذیل حضرات نے انعام اول حاصل کیا۔

مضمون عام ۔ غلام دستگیر رشید متعلم بی۔ اے۔

سال دوم :۔ عبدالرحمن صاحب سعید صدیقی ۔

سال اوّل :۔ سید احمد اللہ صاحب حسینی۔

تعلیمی وظائف :۔ اس سال مغربی تعلیمی وظائف حاصل کرنے والوں میں ہماری جامعہ کے طلبا حسب ذیل ہیں۔

(۱) سیتا نارائین صاحب بی اے (عثمانیہ) برائے طبعیات

(۲) ابو طاہر محمد عبدالقادر صاحب بی اے (عثمانیہ) (متعلم عثمانیہ میڈیکل کالج) برائے طب

sane thoughts on any readable subject in correct and good English. We do not demand much but we shall not be content with less.

College news in detail will be found in the Urdu section of the Magazine. They are not much, but we are at present in the most uninteresting part of a College year—before the Annual Examinations.

EDITOR.

PRINTED AT THE DIOCESAN PRESS, MADRAS—1931. C1384

instead of a jolly game of this or that, he has the cheek to expect that we will bother our heads about his Magazine'. And let alone business, we are even denied the indulgence of a recreation. The fact is that an average student is too thoughtless to bother about anything. But still he cannot expect these pages to be filled of their own accord, can he? Or if it is not his business to fill them, whose is it?

During the short period that we had to attend to our duties we were at first beset by a vague misgiving which has lately ripened into a definite conviction, that generally our students entertain an aversion to writing in English. But if it is due to a sense of their own weakness in the language, as we have probed enough to know it is, we must assure them that they are entirely at fault, for we believe that a large part of them has never put pen to paper except for their class work. Class work, in our opinion, since it entirely eliminates the element of volition, leads one to express unoriginal and unassimilated ideas with corresponding inaccuracies in language. In writing an article on the other hand one can choose one's own subject, can take one's own view of it, express and arrange ideas about it according to one's whim and fancy and can write one's own English. It seems to us that since all the restrictions of form and matter placed on one's class exercises that stilt one's expression, are cut down to a single one of accuracy of language in writing an article, it is through the latter practice that one can acquire a true command of the language.

It will not be out of place here to say something about the choice of subject. There seems to be a general consensus of opinion that the standard of acceptance for an article submitted for the Magazine should be such as to exclude, in fact, all except those written by Professors, learned Old Boys and others generally proficient in the art of journalism. We completely disclaim any such attitude, and we think that we shall be deceiving the general public and ourselves much more than the general public in insisting that our student contributors should produce articles that are nothing but reiteration of what this authority or that says on the subject. We want nothing more or less than your own manly and

EDITOR'S NOTES

WITH this issue of our Magazine—which is a double issue—we hope to come abreast with the work expected of us. If Nos. 2 and 3 of the present volume come out before the summer vacation begins, and we are doing our best to ensure that they do, we shall have only No. 4 left on our hands; and we hope to wind up our work by publishing it just as the College reopens. This is our programme, and we mean to stick to it. But, we may have left out of our consideration certain factors that may prove too much inspite of our best efforts; and these, the reader may rest assured, shall be the only obstacles in our way.

We take this opportunity of thanking Mr. Abdy Collins, I.C.S., and Mr. Weber for the trouble they took in writing for this magazine. We earnestly hope that their illuminating and interesting articles will, so to speak, break the ice between them and our readers and these pages will from time to time be honoured by their pens.

It will be noticed, no doubt, that two of the articles in this magazine are by the same author. It is needless to emphasize that they are chosen on merit alone. But this defect, if it is a defect (though I on my part don't think it is one) can be very easily traced to scarcity of material sent to us for publication. And this, we unhesitatingly say, is not our fault. There is not much choice left us between two very good articles by one person and a mediocre one by another. We can not help thinking that it is perhaps the lot of editors of college Magazines to make it their business to complain of the indifference of students towards their paper.

We admit that various objections can be raised by the students to making it their business to write for the Magazine. 'Surely our leisure is ours', they say 'and not this fellow's. Surely after our studies we have a right to choose our recreation. And

common now, serves the same purposes in a far cheaper way, so that it is quite easy for the inferiors to imitate the superiors. (2) '*Wealth of society is great enough to permit the waste of fashion.*' The rich do not mind changing their style every now and then to distinguish themselves from the poor, for they are wealthy enough to stand the waste of money involved in changing fashions. (3) As already pointed out, the '*technique of imitation*' *has improved*, and *imitation articles can be had at a very cheap price.* (4) *The Newspapers, fashion journals, travelling agents of great firms* spread new fashions from time to time. We see everyday a page devoted to fashions in the newspapers. Fashion journals of course deal exclusively with fashion, and promote it. The travelling agents rouse the spirit of the people, and induce them to adopt the new fashion.

Now a few concluding remarks cannot but be made. Fashion as long as it obeys the principle of utility and betterness ought to be progressive. But the modern craze seems to be rather too much. People of independent judgment, free will, and good taste, and who have appreciation of health and comfort, perhaps I should say sensible people, on the whole, are rebelling against the craze of fashion. If social differentiation and distinction is sought, it ought to be won in other ways than by merely becoming servants of fashion. *It is the real metal or worth in one that counts, and not the superficial decoration.*

SAEEDUDDIN, M.A., B.Sc., F.R.M.S.,

In-charge of the Department of Biology.

different from the others. This tendency is found even amongst the savages who are so fond of ornamental decoration. Inspite of the blind imitation, and the tendency to like change and so forth, we find that, after all, the changes made in the fashions from earlier times to this day, involve a good deal of commonsense. The rough and rude, and mutilating ornaments of the savages have given place to those of a far more delicate kind. The dresses also show the facility and agreeableness involved in them. Women seem to be greater adherents of fashions than men. They still persist in wearing jewellery. In the words of Starr 'Ornament dwindles with progress toward a true civilization ; that there is no place for ornament in a true democracy, and that ornament indicates a retardation of democratic ideas.'

The *hatred for equality*, and the tendency to make one's self different from others lies deeply buried in human nature. As Brook says: 'The lack of sympathy with heroic and unselfish attempts to realize equality is in itself an evidence of the common dislike of equality.' The real differentiation does not lie in mere apparel and decoration but it ought to relate chiefly to *intellect*, *character*, and *achievement*. Even people, who realize this, do not hesitate from blind imitation. The tendency is there, and it is very difficult to root it out. Fashion consists in *imitation* and *differentiation*. The inferiors try to imitate their superiors in external equippage. The more the inferiors copy their superiors, the more often the superiors change their style to distinguish themselves from the inferiors. This imitation accounts for the quickness with which fashion changes from time to time. In olden days it was laid down by regulations that a particular class of people should wear a particular dress, and imitation was strictly forbidden. We hear of the same regulations in old Japan. Even in Europe certain restrictions on the consumption of the lower classes prevailed during the Middle Ages.

It is becoming easier day by day for any class of people to imitate any other superior class of people, and the fashions as a result are becoming less stable. The chief reasons for the unstability of fashions are as follows : (1) '*Cheapness and abundance of textile materials.*' Real silk is well imitated, and the artificial silk, so

ON FASHION

FASHION is 'a series of recurring changes in the choices of a group of people which, though they may be accompanied by utility, are not defined by it. It may or may not be useful to the individual or individuals who adopt it. It is indeed only a *rhythmic* imitation. It undergoes alternate uniformity and change. It *does not obey the principle of utility*, and hence is differentiated from progress which is always made towards usefulness and advantage and better adaptation. Fashion concerns social psychology in so far as it is considered to be very suitable and becoming. But it has no psychic principle behind it, when a particular fashion is thought to be 'stylish' or to avoid being conspicuous. The new fashion or style appeals to the people because it is something new—*a novelty*, and also because of its *good reputation*. The life of such a fashion, as we generally find, lasts as long as these two facts hold. Then it dies out giving place to a newer fashion. Fashion *never remains steady*, and it *does not stand the test of time*. Experience teaches us that fashion has been changing from year to year. Women's fashion changes oftener than men's. The tendency to like the present things better than the past ones without sufficient reason is prevalent. Personally I am quite against this. Why not give the thing its due credit whether it is old or new? While in Edinburgh I went out during the Summer of 1929 to spend my holidays in Pitlochry (North of Scotland), and there we used to dance the old Scotch dances—Eightsome Reel, Foursome Reel, Lancers, The Grand Old Duke of York and so forth. To me those dances appealed more than any of the new Fox Trots and Waltzes. There is more fun in them, and many people can take part in the same dance. But they are not very much liked simply because they are old and antique. People like to have a novelty whether it is for the better or for the worse.

If we go into the ultimate cause of fashion, we find that it is *nothing but the passion* for self-individualization. It is to distinguish one's self from the rest, to make one's self prominent and

chain by refusing to be duped into compliance with the directions of the letter were overtaken by retribution within nine days of it; gentlemen and ladies alike lost sons and money and much more else. On the other hand, those who contributed towards continuation of the chain were awarded by birth of sons and, in case of old ladies (Oh! the gallant Colonel) by winning sweepstakes. Between these two alternatives lies my choice, between the threat and the temptation.

I should like to discuss, by your leave, the efficacy of such threats (for the psychological value of sweepstake dopes in such cases is nil) on a man possessing average commonsense. My first point is, that the Colonel has not pointed out sufficient reasons or, for the matter of that, any reasons at all why the enormous losses of sons and sweepstakes must be the inevitable result of a simple difference of opinion on such an unimportant and silly issue as making nine copies of a long letter. The whole business to me is too preposterous to be just and too ridiculous to be true. Secondly, Divine will is not a monopoly for or against foolish causes. It is not a monopoly in the cause of even Truth, Justice or Faith as far as this world is concerned. We cannot conceive a propagandist Divine will. Good and Evil, here, must fight their own battle.

But again I am carried away by my thoughts. I have not as yet probed the possibilities of the Colonel's appeal finding a sufficient response. And coming to face the question I cannot honestly deny that it may. Society in all the world is not as yet clean of that infirmity called superstition which, independent of reason, knowledge and education, lurks inexplicably in individuals who (though they are decidedly in a minority) are members of every social rank. Here is an element which will go on championing this one and many more foolish causes. It will always offer the most stubborn opposition to every effort at social reform. And for a careful census of it let some one start a similar letter chain with this proviso that everyone concerned should put down his name to the list attached and forward it to—an unintelligent friend.

EDITOR.

'Copy this nine-times', it said, and I found myself not a bit ready to comply with the writer's wishes. It made a considerable demand on one's time and still more on a student's limited exchequer. Moreover 'send it to nine of your intelligent friends' it directed, and this was the hardest nut to crack. I do not mean by this that I am unfortunate in my choice of friends. On the contrary I pride myself on some extraordinarily intelligent friends. I can be sure of these intelligent friends talking hours on end at my request. I can even be sure of their giving tea parties to perfect strangers at my request. But I can never be sure of my friends nor of their intelligence in their making nine copies of a very foolish letter at my request. So my dear Colonel of the American Artillery—and company—your chain letters, if you want them to be taken seriously, ought to be addressed to persons who even by utmost stretch do not come under the classification of intelligent beings.

'This chain was started in Flanders . . . and should go three times round the world.' I solemnly declare that I entirely fail to grasp any moral, philosophical or psychological significance of thus putting the world in chains. The more the world struggles, it seems, to be set free of chains of several other description the more it is bound down in letter chains passing no less than three times round between persons mentally distressed. A little thinking will convince anyone that this sort of thing should never be tolerated. It amounts to allowing, in our very midst and before our very eyes, fools of all nations, countries and creeds to form into a league for annoying peaceful citizens of the whole world. And talking of leagues conducted for the sole purpose of annoying others, there comes to my mind another started by that other American dignitary (who was himself too wise to think much of it) which exists for the sole purpose of offering peaceful remedies to those nations that having a surfeit of power and money had better fight it out, and refusing them altogether where, force being out of question, peaceful settlement is the only alternative. Western Europe, it seems to me, is a hot-bed of such conspiracies against commonsense.

Proceeding with the contents of the letter I find that several persons who committed the inexcusable crime of breaking the

THE LETTER CHAIN

LET me state at the outset that in the following lines I do not claim to express any views except my own. Still for a whole-hearted appreciation of this article it is desirable for the reader to have had a similar experience. I admit that mine is one of those temperaments, good or bad, classify it as you will, that react violently to the first stimulus applied. But in my experience ninety per cent of men, after a day's hard work, reach a similar stage of sensitiveness.

No one likes to receive unsigned letters, in unfamiliar handwriting and this dislike is seen to have changed to anger when the contents are more foolish than harmful. Hostility when compared to foolishness is refreshingly real, because a definite line of action is open for defence. With hostility you know, as it were, where *you* are. With foolishness *you* are nowhere and *there it is*.

The other day I had worked till very late before I could go home. As I gained my room the first thing that caught my eye was a letter in an unfamiliar hand neatly propped against a book on the table. Whose can it be? I mused; and sitting in a chair I tore the cover open. I read the first sentence attentively and then skimmed over the rest. The next thing I was aware of was that the letter too had gone the way of the cover. It was one of the good luck letter-chain started in Flanders by some esteemed Colonel of the American Artillery. A hundred thoughts surged up in my brain, a hundred fancies and as many curses dancing, cajoling and chasing round the images of the blessed Colonel of American Artillery and the local representatives of that correspondence pest.

'Good wishes and good luck', said the letter, a harmless beginning. And if the notion that a good deed is rewarded by magnificent Pearl-Palace in paradise is accepted, a very substantial step towards the erection of that building had been taken. Still in spite of these problematic advantages a good eight pies had been wasted and no doubt about it.

He flings his frontiers ever further out
In time and space ; the uttermost whorl of stars
Calls to the deepest centres of his brain ;
The dust of earth shows him the rocks of Mars.

He knows as pioneers know, alert,
That things are not ancestral, though they rise
From deep ancestral roots ; they are the selves
None else can ever be in whatso guise.

He moves in mind among the whirling stars
Before our sun was shattered, and his eye
Sees undeterred the dying out of life
On the last embers of our destiny.

Some roads but lead him to eternal night,
Some into nothingness, yet even then
He has no fear ; he wanders through the wilds
Of ancient chaos, like the first of men.

He shuns the imposition of his mind
On Nature's wealth and freedom, knowing well
That every system has its frontiers,
But things are linked with the Unknowable.

He looks on men and mountains with an eye
Far greater than his own, a vision blent
With many others searching, like his own,
For trend in chaos, mind in element.

And so he comes to recognize himself
The greatest mystery of all, a part
Of every mystery he meets ; and bears,
With all his restlessness, deep rest at heart.

And thus they speak of the dueffable,
Belittling man's endeavour as he rose
From days he haunted the forest, homeless, blind
To all but the blind need the body knows.

Until at last he finds himself midway
Between immensities of thought, between
Two processes the miracle of mind
Has wrought adventuring the dark Unseen.

Outward his vision reaches, till he feels
The endlessness of worlds ever more vast
Until on times he tries, to conceive
A bound to every boundlessness at last.

Inward he turns his wondrous eye, until
Within minute beings he discerns
Minuter universe; so he sails
Oceans of toil for every drop he learns.

But think not, whatsoever his dismay,
His consternation at the gulf he finds
Between his hugeness and the molecule,
His nullity and the stream of stars that winds

The hollow zenith,—think not his heart droops
Before the figments of the mind; he knows
Illusion everywhere; he loves to loosen
The knots encountered as he onward goes.

Fearless without presumption he pursues
The far-off light; self-trusting, he will mould,
Challenging no Divinity, new forms
Of living thought from simple forms of old.

His part in the great whole is to reveal
The richness of life's gifts, the wealth that lies,
Awaiting transformation to high use,
In common things before our very eyes.

To ease the pressure of dead custom's weight,
To give a lead to those who would advance
Towards a freedom only to be found
By sanction of devoted vigilance.

A PROLOGUE

By E. E. SPEIGHT

(THE following verses form the beginning and a small part of a poem, recently written, on man's relation to the universe as reflected in the conclusions of modern science and philosophy. The reference in the opening verses is to the ancient thought newly expressed in the epilogue of quatrains which form the close of Sir Edwin Arnold's *Light of Asia*).

We suffer from ourselves. No truth more true ;
And in ourselves deliverance must be sought ;
But say not that the Silence cannot speak,
Nor think the darknesses uncrossed by thought.

Long have the sages bidden us beware
Of the unfathomable ; systems fail,
These daunters of the human will affirm,
To show us aught but veil on deepening veil.

No words suggest the ceaseless Tide of Being ;
Your logic measures no eternity ;
Heaven and Earth and all the countless worlds
Phantasmal are : not that way fare we free.

Pray not, they say, to any God at all,
For gods are only phantoms of our fear ;
No offering, no hymn, no sacrifice
Upon their altars brings relief more near.

Pity they have for human suffering,
The fruit of useless striving, useless strife ;
They bid us rest, deep-centred in a Power
That moves this show of lifelessness and life.

And so they find another God behind
All dreams of the Divine, whose laws endure
When all things pass, however beautiful,
The faith of man had found divinely sure.

LIFE

Drinking deep from nature's fountain, I yet began
To contemplate life ; and with ardent amity asked
My soul, which oft doth seem to throb
With the heart-throbs of the world, the cause eternal
That from deep Nothingness into the world of Reality
Led me on, where I find myself a demi-god
In all the marvels of my actions fair, nay—
The very soul of God. Illumined with my spark of love,
The mystic dark of secret elementals it brought to light
And surmisingly whispered : ' All life is the wave of a point
Lying far in the depths of solitude, but through
Instinct divine expanded into a circumambient circle
Covering all Creation. Veiled behind a heterogeneous screen
Of what you call the universe, the innate soul fills Life
With its own blood ; the brandishing phenomena of all Nature ;
Are a thrill of the heart of God in the heart of Man
Realized. Being His regent on earth, he is pervaded
With Passion, and Delight, Labour and Action, to unveil
Him, and dive into the soul of things : that is life.
Seek that then, in every leaflet to vibration eternal,
And in every blooming flower, the smile of Heaven,
For all life in body has the soul of God at Heart.'

By MD. ABDUL QAYYÚM KHAN BÁQI, M.A.

of Mr. Winston Churchill, the man of the chequered career: to the belligerent speeches of that picturesque autocrat Signor Mussolini. 'The world perishes', prophesies Mr. Wells,' 'unless sovereignty is merged and nationality subordinated. What the world needs is no such League of Nations as this, nor even a mere league of peoples, but a world league of men'. Rev. Don Luigi Sturrzo, the former leader of the Italian Popular Party after an acute analysis of the concepts of internationalism and nationalism in the course of a brief article in the *Review of Reviews* justly points out! 'On the one side stands nationalism, leading to war; and on the other side internationalism leading to peace. In the outcome of the struggle between these two tendencies lies the secret of the Future'. Happily for us our oriental mind, essentially mystical refusing to distinguish between an Aryan and a Semite, an European and an Asiatic, sees the same Divine spark, the same elan vital, manifesting itself in different ways. Here it is where the distinction of 'I' and 'Thou', the sinner and the sinned against, is eliminated; unless and until man, the individual, merges his individuality in man, the universal, whom Plato held to be subsisting beyond the limits of Space-Time, in a realm of ideas, there is no hope of any world peace. Aye, the destiny of the world depends on 'the Parliament of Man and the Federation of the World'. When that comes about and only then can the world become a heaven where to quote the words of Mr. Bernard Shaw: 'All life is human and all humanity Divine'. But if the ancient forms of party strife persist, if the artificial barriers of Time and Space continue to divide us, our life will be like a spark burning for a moment and then vanishing in the dark and deep abyss of Eternity. Humanity is at the crossways. Which way will it go? Has the President of the Immortals ended His Sport with this tiny world of ours? Perhaps so.

groaning under foreign domination and exploitation, and are focussing their energies to liberate themselves, are not nationalistic but internationalistic in their tendencies inasmuch as their tendencies are not aggressive and imperialistic, but only desire their inherent rights, which, if fulfilled, will contribute in no less a degree to the development of mankind as a whole. The non-violent nationalism as inculcated by Mahatmaji through the length and breadth of India has nothing in common with its western counterpart save in name, as can be seen from the address of the Congress President who even entertains the idea of sacrificing India's freedom for the sake of a greater Federation. Internationalism is no phenomenon which has emerged all of a sudden but was and is the haunting idea of all the great thinkers of the world who are distinguished by the catholicity of their thoughts and sobriety of their views. Among the ancient philosophers cosmopolitanism was the philosophical creed of the Cynics. Goethe who unlike that imperialist Kipling, saw no essential difference between the East and West observes: 'Altogether, nationat hatred is something peculiar. You will always find it stronges-where there is the lowest degree of culture. But there is a degree where it vanishes altogether, and where one stands to a certain extent above nations, and feels the weal or woe of a neighbouring people as if it were happening to one's own'. Marx criticizing justly the out-worn capitalistic system and bringing to light the common grievances of the proletariat of all races and of all creeds has contributed most to the growth of internationalism in Europe. Sacrificing one's life for the sake of others and identifying oneself with others is the gift of that 'Inconstant genius' Tolstoy's, teachings. 'Worse than theological superstition', says Mr. Bertrand Russell, 'is the superstition of nationalism, of duty to one's own state and to no other'. The violent and dictatorial tendencies of the great leaders of the Russian Revolution, despicable as they are, have at least this to their credit that they are second to none in their condemning it with one voice 'Nationalism drowns itself' is the verdict of the exiled Leader Trotsky. Their statements stand in sharp contrast to the statements of the late imperialist Clemenceau; of Lord Beaverbrook, the champion of Empire Free Trade; to the recent outbursts

internationalism which can alone counteract its evil influences. Thus we find Dr. McDougall setting aside the idea of a super-state as impracticable and Henri Bergson insisting like a parochial nationalist on the righteousness of France and vileness of Germany in a book written during the War.

But, a sceptic may ask, what is the psychological basis of internationalism? Is there any special instinct which impels us to be altruistic in our behaviour? If there is any, our education will do no better than to invoke and sublimate it. Unfortunately. psychologists seriously differ on such a vital issue. Surely, it is not the place to examine in detail the arguments and counter-arguments of the various schools of thought. Hence we can do no better than to describe in bare outline some of their opinions. According to Dr. Frend and his disciples there is only one instinct, i.e., sexual, and all behaviour, egoistic or altruistic, nationalistic or internationalistic, is prompted by sexual instinct or by its sublimation. Dr. C. G. Young, a former disciple of Frend but now the founder of another school, contends that the satisfaction of the young in suckling, though to all outward appearances sexual, belongs to an instinct which is quite independendent of it. Prof. McDougall strongly maintains that there is a special instinct, ' Wature ', ' brightest invention ': parental instinct having as its corresponding emotion, that tender protective instinct on which all our altruistic behaviour is based. He cites Koehler's famous experiments on chimpanzees where this great protagonist of the gestalt movement in psychology has seen clear indications of this instinct. It will do us good, no doubt, to adopt McDougall's contention, for it has the merit of offering a very simple explanation instead of involving us in far-fetched interpretations. It is on account of its psychological basis, perhaps, that all great religions that have brought any light to mankind are in no way opposed to internationalism when they are untrammelled by bigotry and prejudices, by fanaticism and formalities. The Galilean preaching, the Kingdom of Heaven under one Father, the Prophet of Islam calling mankind to rally for one common purpose and Hinduism laying great stress on the unity of all life, have dealt *coup de grace* once for all to nationalism, i.e., the perversion of human nature. Indeed, the subject nations that are

morbid state of group-mind. Such was indeed the imperialistic nationalism swaying the politicians of Europe before July 1914 which precipitated the catastrophe, sacrificed millions of promising youths in the prime of their life on the altar of commercial greed and imperial interests. Alas! for how unworthy a cause they gave up their life with their youthful dreams never to be realized and isolated from their own kith and kin, from their friends and sweethearts! This outburst of national feelings was but a manifestation and revival of those dormant tendencies in man that stood him in good stead in the dark recesses of the past when he had to fight for the preservation of his own life with his own fellowbeings or with the rival forces of Nature. Darwin's Theory of Evolution with its survival of the fittest, Nietzsche's, dream of the Ubermann (superman) with his overemphasis on the instinct of self-assertion, the prevalence of Machiavellian ethics in politics, gave a great impetus to the nationalism which culminated in the Great War and thus checked the onward march of Man in space-time. 'European Life,' says Mr. H. G. Wells, 'remained nominally Christian but to worship one God in spirit and in truth is to belong to one community with all one's fellow worshippers. In practical reality Europe, does not do this; she has given herself up to this strange state mythology. To these sovereign deities—to the unity of "Italy," to the hegemony of "Prussia," to the glory of "France," and the destinies of "Russia" she has sacrificed many generations of possible unity, peace and prosperity and the lives of millions of men.' When such was going to be the condition of Europe well might the prophetic voice of poet lament, "What man has made of man!" Were it possible for us to know through some kind of mystical illumination, the thoughts going on in the animal mind, in the vegetable kingdom, we would have heard in the murmur of the waves, in the unpremeditated art of the nightingale, in the howlings of the winds the re-echo of the same. Though acknowledging to the full the idea of nationalism a happy development on the primitive ideas of self, family or tribe, we cannot but think that it is 'a mean exclusiveness at bottom.' No disease is so contagious as this which has caught even the learned and otherwise sober men and has ranged them against

NATIONALISM *Vs.* INTERNATIONALISM

BY A STUDENT

Gottes ist der Orient
Gottes ist der Occident
Nord und Südliches gelande
Ruht im Frieden seiner Hande.

GOETHE

EVEN in the hurly-burly of this mechanical age of ours every reflective mind asks at one time or other about the destiny of man, whither is he bound and whether the conceptions that are the directing forces of his life, lead him towards the desired goal or towards chaos? But how can we consider them calmly when we are bred and brought up in an atmosphere where the ideal man is he whose life is dedicated to the cause of his country, whose life is a grim struggle against the forces that work to undermine her prestige, against the nations who want to thrive on her ruin. But has nationalism conceived as such any value? It is, indeed, the question of questions. What does history, the sum-total of man's experience teach us? If nationalism is inimical to civilization what are the concepts that have psychological justification for replacing it? These are the questions that loom large today and these are the questions we propose to examine during the course of a brief inquiry.

Nationalism and patriotism are the catchwords of modern politicians and most effective weapons to use in favour of oneself and in defiance of others. These are the forces, full of vitality, that are at work behind insurrections and outbreaks serving as stimulants and blinding to the higher and nobler aims of life. Nationalism when manifested in a fallen subject nation is a natural protest against the unnatural dominance of aliens and when displayed by an already overwhelming and powerful nation betrays an aggressive and imperialistic attitude on her part. Racial discrimination, ever-increasing tariff walls, competition in armaments are the natural and obvious consequences of such a

unbeliever. 'I could no more ram religious conviction into an atheist than I could ram a joke into a Scotchman.' The only hope is that he who lacks the sense of religion should be converted. He must 'get' religion like a sinner at a revivalist meeting. He will suddenly realize that he is missing something in life which is worth attaining. This conversion may be described as a 'surrender'. Just as it is rarely disputed that surrender to the mystical influence of a scene of natural beauty is right, so too there may come conviction in the spiritual sphere which our nature feels inevitable. But it is not to be enforced by argument.

This conclusion may seem disappointing to some who are seeking truth and cannot find it. But it is really an ending on a high plane. It is an appeal to man's highest nature. He must use the talent that has been given him and not allow it to rust in the ground. He must cultivate belief, as he cultivates his sense of beauty. The effort must come from within, not from without. He must give up his search for arguments and proofs. The onus rests on him and not on others. He cannot shift it to this or that sect or to this or that minister of religion. Prof. Eddington's conclusion too is consistent with evolution. As man's mind developed, he became ready for the seed of higher life as æons before the world became ready, first for the lowest forms of life and then for conscious reasoning. At each stage the seed was implanted but it was left to living creatures to develop it. The process of evolution has not ended. With false starts here and there, with failure in some directions, with degeneracy in others, man is groping his way towards unity with God. If he cultivates his lower nature, he remains one with the animals from which he sprung. If he lives in a world with higher values, he brings himself one step nearer to the Infinite. Prof. Eddington's philosophy has the advantage of allowing a personal God, without whom many feel they cannot live. Forms of religion have little importance. One appeals to one man and one to another. But certain things we may trust have absolute values and are at least 'some pale reflection of those of the absolute Valuer' to whom 'one day is as a thousand years and a thousand years as one day.' Such, indeed, would be the God of the Relativist.

unnecessary and unknown. Some say the He has even become probable, and as we have seen probability though varying in its degrees is now replacing certainty. But Professor Eddington goes further. Leaving the realms of Physics, he proceeds to deal with what comes after—the Metaphysics of Aristotle. He does not claim for Physics that it deals with the real world. This, like Descartes, he bases on man's consciousness. *Cogito, ergo sum.* I think, therefore I am. Time also is real. I not only 'am' but I 'become.' Helped, too, by his attitude as a Physicist towards causalty, he believes in volition and the freedom of the will. He finds conscious existence linked indissolubly with the world of sense. To him beauty, colour, melody, honour and right, the intangibles and unrealities of science, seem to be part of the real scheme of things. It is the world of physics with its abstractions which is unreal or at least merely speculative. This is not put forward so much as a theory but as an explanation of man's failure to attain to 'that thought of unity of the whole world which is essential to a complete theory.'

But the real interest of Prof. Eddington's book to the average man lies in his attitude towards religion. How many 'lay' readers have studied the works of the leaders of scientific thought to find some *proof* of the existence of a God or at least a strong assertion of the belief in such a being. One by one all end in disappointment. The best that can be found is the absence of negation—the assertion that such a thing *might* be. There is nothing to prevent it. What cold comfort for that sense that yearns for proof but cannot attain belief without it! It is here that Prof. Eddington's book is, to use a hackneyed phrase, soul-satisfying. As a physicist it is true he goes no further than many. But as a man he asserts his belief in what he calls 'mystic religion.' He attaches real value to the innate conviction, which some possess of the existence of God. This inward feeling of necessity he compares to a sense of humour. You either have it or you haven't it. A man without a sense of humour cannot acquire it through mathematical demonstration. Humour is incapable of proof. But he can be *converted.* By associating with others who have this sense he may suddenly find himself alive to it. It is the same with religion. Science cannot furnish any argument or proof to convince the

matter his reply was to kick a huge stone which lay beneath his feet. This reply, so telling in the 18th century, is of no avail to us. The rock itself is proved to be not solid after all.

This discovery so disconcerting to the man in the street (if he took any notice of it at all) was rather flattering to the scientific world. It was the sequel to it that threatened to complete the upheaval which Einstein began. Further examination of the electron seemed to show that this little creature, if it may so be called, the darling of science, was a viper in her bosom. Alone of all her brood this latest child was utterly independable in the mass the scientist could foretell, with that extreme probability that amounts to certainty, what the electron would do, but when it came to the individual, its movements could not be predicted at all. The strict law of cause and effect had vanished. Then, it became impossible to locate its position in both time and space at once with exactitude. The more exactly you located it in time, the less exact became your knowledge of it in space, and *vice versa.* It remained indefinite and indeterminate. As in the great world of experience, so in the world beneath and beyond the microscope chance (or the divine will?) reasserted itself. Indeed, in dealing with the individual, there seemed no probability at all. Free will and volition could no longer be denied. A God might, indeed some said probably did, exist. The greatest intellects no longer pretended to 'explain' the world. Einstein in his message at Newton's centenary said 'May the spirit of Newton's method give us the power to restore unison between physical reality and the profoundest characteristic of Newton's teaching—strict causalty.'

This seems a fair summary of the changed attitude of Physics to the world as set forth in Professor Eddington's Gifford lectures, revised and published under the title of *The Nature of the Physical World.* This remarkable book gives forth hope to the layman who, while yearning for the things of the spirit, was still caught in the deterministic morasses of the Victorian age. One by one the sciences are extracting themselves from that Slough of Despond and struggling towards firmer ground. Biology and Psychology led the way. Now Physics and even Mathematics come stumbling after. God is no longer impossible, or at least

SCIENCE AND THE INFINITE

BY

MR. B. ABDY COLLINS, I.C.S.

THE men of science who entered the twentieth century in the supreme confidence of god-like wisdom have humbled themselves before the Infinite. Einstein gave the first shock. Relativity undermined the foundations on which the world of Newton seemed founded in primaeval rock. Certainty began to vanish to be replaced by probability—probability so extreme as to be practical certainly, but still only probability. There were compensations. Space was no longer infinite, though still boundless. Time's onward march was not interrupted but Time was no longer a series, only a fourth dimension. Deprived of his scythe the old man could no longer cut off the seconds but was left with his hour-glass to measure their onflow. Kant's great hypothesis that space and time were merely the manner in which the infinite presented itself to man's finite intelligence seemed on the verge of proof.

Still, the scientific world tottered on its base and before the oscillations caused by this blow from without had ceased, an explosion from within threatened to complete its ruin or at least to render necessary a reconstruction from the bottom. Explosion, perhaps, is hardly the right word: electric shock would be better. For it was the electron, the discovery of which seemed the ultimate proof of the omniscience of the human brain that dealt this shattering blow to its pretensions when first isolated it seemed harmless enough. The atom was no longer the ultimate fraction of the world but the world seemed no less solid and substantial. Then came the incredible. The atom itself was almost wholly blank space in which the tiny electrons moved round a fixed central speck. The table, the chair, the walls of the house, the very earth itself with all its rocks were mere nothingness. All substance and solidity was illusion. Nothing was left except electric charges. When Dr. Tohuson was faced with the subtleties of Bishop Berkely who asserted the unreality of

things as well as in boxing namely, Gene Tunney and Georges Carpentier, besides being keen mentally, both are as well students. Tunney is a prodigious reader of scientific treatises as well as the very best of literature. He lectures on Shakespeare and his works. It was said of Carpentier, that he knows as much about the conditions of France as does any French statesman. Then it is no accident that the best 'minds' in the boxing profession are found to be at the top of the ladder—Tunney, the World's Champion (retired) and Carpentier, the Champion of Europe. There is a definite correlationship between the two. It is said of them both that they would be successful in any kind of business or undertaking they decided to enter. Both are effective public speakers and are known for their unusually fine manners wherever they come under the observation of people.

As boxing is now done at its best along scientific principles, it demands, as well as a sound organism and physique, an alert and studious mind. The limit of one's attainment in the art of boxing is commensurate with the limit of one's intellect, in so far as one applies his intellect. The more intellect the individual may possess, the higher in the scale, other things being equal, he will succeed as a boxer. Gene Tunney writes: 'Mental fitness has as much to do with a boxer's success as has his physical. The modern boxer realizes that unless he is mentally equipped his chances for success are very slim'. Further, he comments on the essentials of a boxer's equipment, and here note again his emphasis upon the mental equipment: 'A complete knowledge of the science of the game; a quick, active brain, with perfect co-ordination; and sound physical condition are necessary qualifications for a successful boxer of to-day.'

Boxing was not always so fortunate as it is to-day for having so many specimens of human character of so noble a sort attached to it. It was once in very great disrepute and there were periods when the best people would have nothing to do with it whatsoever. This was especially so in the case of America. England, where modern boxing originated, was always more fortunate in this respect. She had had fine traditions which came out of a long past in boxing. Amateur boxing there has had a richer past than in

laudable phase and is accepted as such the world over and admired by the best sportsmen. The writer can think of no better examples of this phase than those of Gene Tunney, Freddy Welch, the British boxer, and Bob Fitzsimmons, the Australian. Fitzsimmons, frequently referred to as, 'Bob the Great of Fistiana', has repeatedly won his battles, snatching them from the very jaws of defeat only because of his phenomenal will-power and confidence in himself to come through. He well knew the value of these mental attributes and exercised them to bring home victory after victory when the average man would have stopped far short on the other side. He was mentally aggressive, the more so when defeat would have been imminent to the ordinary boxer; and out of this kind of mental aggressiveness character is born, sustained, and developed.

Fitzsimmons was by temperament, cool-headed, self-controlled, patient and withal, aggressive both mentally and physically, when the exigencies of the situation required aggressive action. These qualities both develop character and are the outcome of character. Whether in the boxing ring or out of it, man's success will depend upon his moral characteristics and, the principal support of the moral characteristics is that quality of mental aggressiveness; and mental aggressiveness and those other mental qualities, backed by timeliness, make for success in boxing.

V

ITS RELATION TO MENTAL LIFE

'Boxing has passed through that stage of being a "bruiser's" business; it has passed from being that into a science which demands the quickest of mental action and brain power.' Thus spoke James J. Corbett, known as 'Gentleman Jim' and World's Boxing Champion from the year 1892 to 1897.

Boxing has truly become a science, as well as an art, of the highest order. Back of all science is mental activity. The man who develops his boxing furthest, other things being equal, is the man who will go furthest in the boxing limelight. Witness as examples two outstanding men for their mental acumen in other

5

to broaden our subject by speaking in more general terms; and as well, not always direct but rather by implication. This will be found to be especially so when showing forth such examples which embody those mental attributes and qualities that take us farthest on in life, viz., self-confidence, will-power, morale, etc., as well as that they take the boxer farthest along the route of boxing success.

Naturally enough, psychology, as applied to boxing, is best known and utilised by the class of boxers who come in the category of the 'brainiest' boxers. It is said of a light-weight boxer who had gained considerable renown, that he defeated many an opponent who was far superior to himself in all the branches of fistic science and experience except in the knowledge of the 'laws of the mind' (how the mind works under the different stimuli of one's environment) and how to put such knowledge to work to effect victories for him.

Gene Tunney, Georges Carpentier, Tommy Burns, Freddy Welch, to name but a few of the world's champion boxers, past and present, were masters to more or less degree of the laws of psychology as applied to boxing. Gene Tunney, in fact, shows a remarkable knowledge of those laws and ability to apply them against his opponents. Georges Carpentier says: 'There is a natural sub-conscious influence one person has over another and this influence plays a tremendous part in the ring, for if you can, either by your personal magnetism or actions, before and during a contest, make an opponent believe that you can beat him, he is already on the downward grade, as it were. This phase of the laws of psychology as applied to boxing is, of course, the negative phase, i.e., we mean to say that the laws of psychology are here operating to break down the opponent's morale or spirits, the object being to utilise this advantage to beat down the opponent. Jack Dempsey, former World's Champion Boxer, was an exponent of this negative phase, too.

But there is another phase of the psychology of boxing, the *positive*, i.e. no efforts are here made to break down the opponent's morale. Here the focus of attention is given to building up one's own morale, self-confidence, and will-power. This is the more

equals. All which the word morale connotes and as well, the finer elements in human nature such as the spirit of meting out fair play, sportsmanship and the desire to see others get on in life, come out of boxing. It has its individual and social significance —in developing morale and meting out just and fair dealing. A college principal once brought harmony out of disharmony among his staff of teachers by introducing boxing and hiring the services of a boxing instructor for them.

Two Boy Scout Masters in a large city in India were of totally diverse temperaments and at times somewhat irritated at each other. One day a third Scout Master suggested they 'put on the gloves'. After the bout, in shaking hands, one said to the other, 'Now we understand each other better'. Boxing brings understanding among men. When the late President of America, Theodore Roosevelt, was asked what he thought to be the first essential for the education and character development of his sons, he answered by pointing to a set of boxing gloves. Georges Carpentier says: 'A boxer's life must be the very cleanest morally if he is to succeed'.

Boxing develops character. As a fitting summary to this as to the character values accruing from boxing, I can do no better than to ask my readers to kindly re-read the quoted statement from Gene Tunney's personal letter to the writer in the opening sentences under Boxing—its relation to character-building.

IV

ITS PSYCHOLOGICAL IMPLICATIONS

Psychology may be defined, as the study of the mind and its operations, powers, and functions. Psychology and its relation to boxing was but little understood until comparatively recently. Yet the influence of psychology in the realm of boxing has played its important rôle, to a greater or lesser extent, throughout all boxing history. Since psychology as such is not our subject, but psychology as applied to boxing, i.e., the powers, functions, and operations of the mind as definitely related to boxing, or, more particularly, as related to the *boxer*, we shall endeavour

Georges Carpentier, Boxing Champion of Europe, writes: 'Here is a sport (boxing) that not only develops the man, but disciplines his lower nature. As a sport for amateurs, there is nothing more exhilarating, health-giving, and confidence-giving than boxing. Its joys are manifold, and its ennobling qualities beyond question.'

Tommy Burns, for a time the World's Champion Boxer, received a letter from the late Father Bernard Vaughan, who wrote: 'Boxing is an education—you learn self-control, to give and to take, to punish and to be punished, smiling all the time'.

The writer was, during the World War, closely associated with 'Battling' Livinzky, then Light-Heavyweight World's Champion Boxer. One day he asked Livinzky how was he able to know when he was in the best of physical condition for his bouts, to which Livinzky replied: 'It is when I can take the hardest blows from my opponent and still avoid becoming mentally ruffled'. It is a self-evident truth that such a characteristic as this, whether in boxing or whether in the daily round of living, strengthens and ennobles character. Moreover, Livinzky's was a temperament which was most impetuous and easily gotten out of control on the least provocation before he took up boxing. This information comes on his own admission.

Taking an example from Boy-land. A rather nagging and overly fresh boy had the habit of taking advantage of all the smaller boys who passed by his house. Among the victims of his tactics was a boy of timid disposition and younger by one year. Having been unfairly imposed upon daily for some weeks, one day he 'stood his ground' and, though the nagging boy was heavier by ten pounds, he licked him so decisively that thereafter he was treated with respect by the nagger. He also won a place of undying glory among all the smaller boys of the neighbourhood. When asked how he was able to turn himself from being so timid a boy as he had been to so brave a boy to fight and lick so big a bully, he replied, 'My big brother is now teaching me how to box'. Boxing in that town among boys thenceforth became popular and along with this popularity, a rise in the town's stock of boy courage, self-confidence, justice and fair treatment among

feints, at some part of the opponent's body or head. Secondary attacks are either ' counters ' or returns after a guard or ' block '. A counter is a lead carried out just as one is attacked, the object being to block or slip the blow and land on the opponent at the same time. The timely use of foot-work, in the forms of the side-step, in-step, and back-step, is a great asset in the art of countering. The slip is also very effectively used in countering. The slip is simply tossing or rolling the head to one side, allowing the blow to pass over one's shoulder. One may also counter after quickly taking the crouch position momentarily.

In hitting a boxer seeks to exert the greatest force at the instant of impact. This phase of boxing is an art in itself and requires persistent practice over quite a period to become master of it. Suffice it to state the cardinal principle here, which is, 'the fist should be in no more than a state of semi-contraction while on its way to its mark and at its fullest contraction *only* at the instant of impact'. Blows: Straights (straight from the shoulder); Jabs (delivered at close range); Hooks (bent arm); Upper-cuts (short blows from beneath at the adversary's chin); Chops (short blows from above).

Guarding is done with the arm or open hand. If a blow is stopped short it is called blocking, but a blow may also be shoved aside, or avoided altogether by slipping, or by ducking and allowing the adversary's blow to pass harmlessly over the head. Yet another method of avoiding a blow is to bend back the head or body causing the blow to fall short.

III

ITS RELATION TO CHARACTER-BUILDING

Gene Tunney, World's Champion Boxer (Retired), in a personal letter to the writer, writes: ' For instilling manhood, I can think of no faster method than by introducing amateur boxing. Boxing unquestionably develops self-reliance, self-confidence, physical and mental courage, consideration for others, an understanding of sport, and greatest of all, sportsmanship which is a quality of spirit " devoutly to be wished ".'

II

ITS TECHNIQUE OR SCIENCE

Boxing is the art of attack and defence. It is also the art of hitting without getting hit. The two boxers face each other just out of reach and balanced about equally on both feet, the left in advance from 12 to 18 inches of the right. The left foot is planted flat on the floor with the toes pointing directly towards the adversary's face, while the right foot with heel slightly raised points at nearly a full right angle to the left. The left side of the body is turned towards the opponent and the left shoulder slightly higher than the right. When the hands are clenched inside the gloves the thumb is doubled over the first and second fingers to avoid hand sprain when hitting.

The general position of the guard, right hand, is pretty much a matter of individual taste or aptitude, but it is conceded in the highest boxing circles that there is no better place for it than across the chest, the forearm covering the solar plexus and in the proximity of the heart while the hand, palm turned towards the opponent, held near the left jaw, serves to block or knock blows aside aimed at the face. The general position of the lead, left hand, is well stretched out in front to keep the opponent at a respectable distance. There are two prevalent body styles. One is that of the 'crouch', in which the body is bent well over to the right side; the other is that of the upright pose. The former is generally the style of the 'slugger', the Jack Dempsey style, the latter the style for speed of which Gene Tunney, retired World's Champion, is the leading living exponent. For the effective use of the straight left lead, the upright pose, the basis of the classic modern boxer, is decidedly to be favoured.

A boxer should stand lightly on his feet, ready to advance or retreat on the instant, using short steps and keeping quite close to the floor, rather on the order of a glide than a step. In advancing the left foot leads with the right foot instantly following up; in retreating the right foot leads with the left foot instantly following.

Attacks are either simple or secondary. Simple attacks consist in straight leads, i.e., blows aimed with or without preliminary

school physical education programme in which boxing holds a prominent place. It stands to the credit of that nation, though having taken to boxing only since the war, that she possesses today the World's Champion, in Max Schmelling. But not only have the education departments of the world's most progressive and aggressive nations placed their stamp of approval on boxing as a form of exercise but so have such agencies as civic, social, fraternal and other bodies.

It has become patent the world over that the 'best people evince an interest in the wholesome sport of boxing'. Besides the numerous other titled persons in England and the Continent who associate themselves as its patrons, boxing has always had a distinct attraction for the Prince of Wales. When Theodore Roosevelt was President of the United States he retained his own boxing instructor, and members of his Cabinet and the Senate were among his sparring partners. The sobriquet, 'The Fighting President', assigned to him had the ring of realism in it, as well for his boxing activity as for his battles for reform. Writes Marshall Stillman, the author, 'Indeed, none but a few knew how much "Teddy", while in the White House, depended upon boxing to keep him in his condition of physical fitness. One of the first moves he made when he arrived in Washington was to send to New York for his boxing instructor. Teddy, once of frail body, became a boxing enthusiast and of singularly robust build'.

A few general remarks of the physiological effects of boxing need be added. The common conception of the looking-on, non-participating individual that boxing, as form of exercise, is confined, more or less, to the arms is a mistaken one. There is no individual on the face of the earth who so nearly approximates the acme of physical perfection as the trained boxer and this because every muscle of the body gets its fair share of exercise in the practice of boxing. There is an acceleration of blood circulation over the entire body, making for that nice balance and refreshment of feeling as well as a general toning up through the nervous system. The exercise from boxing brings a man to his physical zenith.

BOXING

BY F. WEBER, M.A., B.P.E.,

Director of Physical Education for Colleges, Hyderabad

AS A FORM OF EXERCISE

'THE soundness of an army lies in the soundness of its men', said the great Napoleon. It is the same with nations, states, cities, individuals. Providing the classic illustration and at the same time, perhaps the most authentic testimony in all history of the value of boxing as a form of physical exercise is the recent World War. When efficient physical man-power was the crying need of the hour and the quickest method of converting millions of men from physical 'incapables' into physical 'efficients' was sought, 'boxing was prescribed as a means of quickly fitting untrained men for action at the front'.

But not only have the war departments of the nations recognized the inherent value of boxing as an effective conditioner of men's bodies but also other departments and agencies of nations as well. It was reported many years ago that compulsory boxing in schools in France was in vogue. Among the best schools in a section of America a canvass was made among the boys for their preference as to which form of exercise might give them the most exercise in the shortest time and at the same time be most useful to them. Boxing was the choice. England has shown the value she places in boxing as an exercise for her boyhood by the encouragement she has given this form of activity among her school boys. But true to her much heralded peculiar characteristic of systematization it remains for Germany to show the nations and the peoples of the earth another example of her genius in the way of organization, along up-to-the-minute lines, of her entire

unusual rugs. They took me into parts of the world I have never visited, and caused me to hear languages I have never heard spoken. The scenery of my first dream was not any I have seen in Italy, Switzerland or France, nor was that of the second the scenery of Egypt. It would be easy, of course, to imagine that these carpets emanated some influence that caused me to be in fancy where they had been, in Tiflis or Batum, in Khiva or Samarkand. But how could such a thing be proved? Still I wonder whether the fact of these intriguing rugs reaching South India from outlying regions of Soviet influence may not be due to the break-up of civilization in Russia and the consequent scattering of property.

Anyhow this is not the first time outside the Arabian Nights that strange things have happened in connexion with carpets the camels have borne along the sweltering desert routes.

On his head was a white mitre. The camel was holding its head up on a level with the old man, and its tongue was darting in and out, up and down, as if it were talking to him. Behind the camel were a few people in procession. They seemed to think a good deal of this old man and to honour him greatly. They kept asking one another why he was going to a certain temple. Then they seemed to decide among themselves that as he was so very, very old, he wanted to be taken there so that he might die there.

Then suddenly we were at the temple. It was right in the centre of four roads, and along both sides of each of these roads were rows of flat roofed houses, and the temple in the centre rose above them in three stories besides the ground one.

As soon as the camel got to the entrance of this temple and knelt down, the people following and on the road all fell down in obeisance before this old man and made him offerings. But he was so old that he did not seem to be able to move at all; he never took the least notice of them.

Then three men suddenly appeared by the camel and unhitched the shrine and carried it into the temple.

A few minutes later we saw up in an alcove on the second floor the old gentleman sitting in his little shrine, and the people down below were burning incense to him, and we all thought he was going to stay there till he died (I was in one of the flat-roofed houses).

We seemed to have been there watching him a long, long time, when suddenly the old gentleman stood up. He took off his mitre and put it down on the seat of that gorgeous throne of his; then he slowly turned and we saw him climbing steps into the topmost part of the temple.

The last vision I had of him was his long blue cloak, and a little round brown patch of bald head amid his white hair.

Then Michael cried and I woke.

* * * * *

These were my two carpet-dreams. I call them such because they immediately followed the excitement of pre-occupation with

The whole view might be said to resemble the plan of an ancient palace set in formal grounds, with paths and perhaps streams crossing each other everywhere.

The sombreness is caused chiefly by the dark blue, which is almost black in its depth. There are two shades of the plum, and two of the brown or sienna. The white is that of new ivory, and there are rare touches of deep orange. The salient appearances are the white central outline, the vertical borders in blue, white, and light brown, and the orange-tree figures at the bottom.

The proportions, which are brought up to exactly five feet by six, if we include the purplish brown web at the lower end, and the braided selvage at the upper end, give the impression of solidity and sturdy substantial shieldingness against storm and sand and wandering eyes.

It may not be possible to form any clear idea of the appearance of the rug from these words, but perhaps the account of my dream may be easier to follow.

The Second Dream

I didn't know where I was at all. I was just there, and could see a camel coming down a street. It seemed to be a very long street, and quite wide, bordered on either side with flat-roofed sand-coloured houses. This camel was heaving along, its hump and body covered with a purplish rug. Not mounted, but running on the far side of it, was a big black man, whom I could only see now and then.

Two wooden arms clasped the body of the camel under the rug, and a third curving piece of wood, beautifully carved, came from between the camel's forelegs down below its neck, and rising in a bend like the bow of a ship in front of the camel, quite close to its face. On the top of it was fixed a shrine covered with beautiful tapestry. The inside had embroidery and strappings and braid, and the whole structure gave one the impression of being extraordinarily rich with silk and gold and jewels.

Inside the shrine was seated an old, old man with a long white beard, wearing a beautiful dark blue embroidered gown.

Then I was in a most terrible agony again, because I saw that the case was empty. And I was trying to explain to her that I hadn't taken the things that were inside, and I was imploring her to believe that we had only taken it to give it to her and not to steal anything from it.

She put her hand on me and said: 'Don't trouble. It was always empty.' Then she looked at me for a moment and something seemed to pass over her and she turned to the case and seemed to rip the whole thing in two, and there between two layers of shabby leather and canvas were spread the most wonderful jewels,—sparkling emeralds, diamonds, and strings of pearls; the whole case was crusted with jewels.

Then I woke.

* * * * *

What I may call my second carpet-dream cccurred here in Begumpet, the night after we had unrolled a very different kind of rug, dark and thick and warm as a bearskin, and one of those one is careful not to spread where people are likely to walk, as it is very probably a form of prayer rug, a *ja-e-namaz*, though it is classed as a *Teke Turkoman pardah*. It is of the kind which is illustrated in Bogolubow's book as a typical *Pinde* pattern and the illustration has been copied in various works on oriental carpets, but such rugs are not often seen, at any rate in South India. It is by no means easy to describe, because of the wealth of design, in brown and white, on a dark plum ground. My husband's account of the details of the geometrical patterns took hours to write down and I can only quote a few lines here. There is a wealth of conventional figures running back into prehistoric times, such as parts of the svastika, figures like rams' horns jutting out of anvils, and other fantastic forms which once must have had relation to reality. The general appearance of this thick soft rug is quite unlike that of anything else we know in Asiatic art. There is a rich sombreness relieved by a multitude of small white figures and large ones in orange-cinnamon. It is especially fine in the light of sunrise. One is bewildered by this plenitude of geometrical design, behind which are larger ones in dark blue, interlacing on the purple-plum background.

Then the crowd seemed to disappear, and the man who had spoken—a short stout bearded man in a long coat and peaked cap—seemed to be left there alone.

I was walking along with that woman in a terrible state, and I kept saying to her: 'Where can my husband be? If I could only find him! If I could only find him!'

She said: 'Ssh!' and looked round to see if we were being followed. We walked on and on the wet black road past miserable houses with people sitting out on the pavement at little tables, and then we passed what seemed to be a café. There were people at little tables under canvas, and the café room was higher than the pavement. Only men were there. As we walked past I looked in wondering if I should find my husband there, and I saw him in a room at a square table talking to a man, who looked such a bad man, such a cunning man. I have also a sub-conscious feeling that I saw the Kafkaz carpet hanging at the back of the café. I left the woman and I walked through all those little tables, right up to the steps of that room and I wanted to call my husband; but the woman, who had followed me, did not seem to want anyone to know that my husband and I were in any way related. And I remember laughing quite happily and saying to her: 'It's all right! This is my husband!'

The memory of my intense relief is very vivid. Then I called my husband and he stood up and saw me and came down the steps, and all the time that man was watching us. I was very worried, and just said: 'Have you got that little case?' My husband said: 'Yes'; then he disappeared for a moment or two, and then came back with it. I snatched it from him and gave it to the woman, and I said to her:

'There's your case'! Is that the one about which he said he would put out the eyes of the person who had it?'

She took it from me and held it, and I said to her: 'Open it!' She seemed to hesitate for a moment or two, and that man kept looking at us with a sort of angry surprise. She put the case down in front of him on the table and opened it.

crying near him. My husband got out and came to my carriage and said: 'We're just in time to get into that train'. I said: 'I have nothing with me but my sewing machine'. While we were talking those other people got out of the carriage but left all their things behind. I could see them talking to two men with long dark coats on in the train we had to get into. I said: 'Well, if there's only a minute for us to get from one train to another, and that woman seems to have left her case behind, let's take it to the train with the machine'. We took the two things and got into the train, and it started. I picked up Michael and my husband took the case, and we walked along the corridor of the train looking for the woman, but we could not find her.

* * * * *

[*Here comes a break*]

I have lost my husband and Michael and Peter (who had all the time been there, but I had not seen him) and the case, and I am standing in a street with the woman the case belonged to. It is a cold wet day, and the streets are black and shiny and crowded with people,—they seem to be Russians. We are listening to a man who is talking to the crowd and saying that a black attaché case has been stolen, and that it is no use the thief trying to get away with it because wherever he went. . . . He mentioned two names (I had never heard of them, and I cannot remember them because I did not know them in my dream. I took his language to be Russian). He said that whether they went to that place or that place they would be caught and brought back.

Then he seemed to be very angry, and as he was speaking I saw that woman put up her hand and cover her eyes and say something in protest. And I said to her: 'What did he say?' She said: 'It is not right! It is too cruel!' So I again said: 'What did he say?'

I was very frightened, because I suddenly remembered that the case we had taken out of the train was exactly like the case this man had described.

She replied: 'He said that when the man is caught with this case he will have his eyes put out.'

It is the main border which bears marked Caucasian designs, chiefly the geometrical Kufic patterns called latch-hooks in English books. They are on an ivory ground, in red, blue, orange, yellow, light lemon and light blue green. The details of the secondary borders are quite ordinary. It is the quiet autumnal dignity, and the strange contrast between the geometric border and the multitude of living curves in the unbroken central design that attract one more and more.

This was my dream, throughout which I felt great terror.

The First Dream

I was travelling in a train, going to a station where my husband was to meet me. It was a continental train, with two long seats upholstered with brownish green velvet with knitted antimacassar-like things. I was alone in the carriage, but when we got to the appointed station my husband did not get in. Just as the train was steaming out of the station a wild mad-looking man ran down the platform and tried to get into my carriage. He had on a cap with a stiff shiny band all round and a black shiny peak,—like those which French soldiers wear, I think. He tried to open the door and get in, but I locked it inside, and so he could not. He seemed to be trying to say something to me, and he was waving his arms about.

Then we came to the next station, but my husband was not there either. I can only remember the long brick buildings in the station. Just before the train started a man and a woman and two children got in. The man was thin, short and sallow, clean-shaven, and wore a long brown coat. The woman had a very sweet, kind face and was also small. One child was rather big, the other a boy about two. The man and the big child carried what looked like raincoats rolled into tight rolls. The woman had a very shabby black case. They did not speak to each other, but the little boy came to me and I was playing with him as I would with Peter, my own little boy of his age.

After some time we came to a third station, and drew up alongside another train. To my great surprise I saw my husband in the carriage opposite mine, and I could hear my baby Michael

endless fascination for us, the rugs from so many regions of Asia: from places so far West as Ghiordes, Ladik (Laodicea) or Konieh in Asia Minor, from highland villages of the Caucasus, from Armenia and Iraq, from many parts of Persia and Turkestan famous in history and art and ancient commerce, such as Sehna, Shiraz, Mashed, Bokhara, and even far-off Kashgar with its wonderful setting of mountains.

The carpet in question is one of those called Kafkaz or Caucasian; it is not easy to place, and we do not know whether it was made north or south of the great range running from the Black Sea to the Caspian. And what a journey it must have had, and how many lands it must have passed through, with Armenia, Persia, Turkestan and Afghanistan, not to speak of the length of India, to cross before it found a haven in Hyderabad!

The dimensions of the carpet are eight feet by nearly five; it is of fine weave, firm texture and short nap, with selvage at the sides and at each end a web and a loose short fringe. The weft and the warp are of wool. There are twelve knots vertically and sixteen horizontally to the square inch, and two or three crossings between the knots. According to these data it would seem to have been made in Kabistan. It has a central rectangle with a background of deep blue, on which are thirty parallel rows each containing fifteen of the figures variously called pears, cones or mangoes. These all face the same way, but the tails are turned in alternate rows. They are of red and ivory with touches of dark blue. Looked at closely they are like embryos, miniature dolphins I might say; from a distance like marshalled ranks of autumn leaves fallen on a dark pool.

Besides these conventional objects there are others. At the left edge of the central rectangle are two tiny human figures, one without a head. Also along this edge are many little figures like snowflakes, also swimming birds. The right edge has these minor things too and along the top are Janus-like figures, the tiny heads facing right and left from a pedestal. These Janus figures are really the lower parts of a row of incomplete cones cut off by the first border.

TWO CARPET-DREAMS

BY D. M. SPEIGHT

I AM going to narrate two strange dreams which I have had during the past year.

The author of that remarkable book, *An Experiment with Time*, which appeared three years ago, says:

> ' Many people are genuinely convinced that they never dream ; but, from experiments I have made, I am satisfied that dreamless sleep is an illusion of memory. What happens is that one forgets the dreams at the very instant of waking.'

In spite of this dictum I must tell you that I rarely dream, but when I do, I see things almost as vividly as when I am awake. Dreams with me are memorable things, often so startling that I feel sure they must mean something. Sometimes they seem to be symbolic, with visions of objects of such a kind, and arranged in such a way, that they would appeal to a student of the occult. At other times they are events of a life I cannot remember to have seen with my own eyes in reality or in any picture. Two dreams of this latter kind I should like to put on record.

The first is one I had at Kotagiri in the Nilgiris, in a house on the top of a hill nearly seven thousand feet high, a spot lonely enough by night, when the sambhar came to the garden to eat the lilies, and panthers steal out of the wooded gorges below and sharpen their claws on our peach trees. As the days get hotter on the plains far beneath us other animals come up for coolness : a rogue elephant will stop the traffic, and sometimes we are startled in the misty night by the roar of a tiger echoing through the hollows of the hills.

One day my husband and I had spent a good deal of time examining an unusually interesting carpet we had bought, and which we liked the better, the more we studied it. They have an

to the queer stock of that most optimistic of men, the dealer in second-hand vehicles. There they stand and rot in the public view, mourned by none. The Marwári merchant bumps and dashes by in his ancient Ford, holding on for dear life with dismay written in every line of his features. Does he think of the leisurely days of the now mildewed *push-push*. No! His glance is ever forward. The force of competition rushes him along. The rattling 'Flivver' is quicker and cheaper: that is enough.

Let us end with the picturesque. This can be found, as so often, in the Indian State where 'progress' is less marked. My examples are from Hyderabad—the *Sāhan*, the *jutka* and the *bundi*. These like the riding bullock are remnants of the peaceful and beautiful past. Two of them have been 'registered' and their pictures best express their charm. The old Magistrate with his bravely dressed attendants is well suited by his conveyance. He lives in a corner of the State, where the motor has not penetrated. The *jutka* and the *bundi* are conspicuous for their lacquered bodies. The blending of the colours is artistic beyond belief. The subjects and execution are quaint but charming, but be content with looking and do not ride inside. There is little air and no comfort for the occupant.

And so farewell to old India! Charm without comfort beauty too often allied with beast—the world of the past. It is going and cannot return.

to perfection. Surely a more taking sight never met the human eye! Progress is slow, but then there is always one companion on foot and speed is not appreciated in old-world India. The ride rests the feeble feet of age or the youthful limbs unused to travel, and each can take a turn on foot as the little party meanders from village to village. What a picture! But the riding bullock too, as roads increase and the bustle of life penetrates into the country side, must and does give way to the pony, the cycle and the motor bus.

> 'Farewell Romance! But all unseen
> Romance brings up the 9·15.'

Vehicles are either picturesque or weird. The weirdest of all is the '*push-push.*' Its habitat is the Chhota Nagpur plateau. It is the ugliest and least restful of carriages ever invented. It carries one back to the queer whims of Lewis Carroll's Snark.

> 'The next was its fondness for bathing machines,
> Which it frequently carries about.'

It looks like nothing so much as a bathing machine on two wheels, but is much less commodious. It is meant—I had almost said 'designed' but one cannot dignify such an ill-planned article with so fine a word—for long journeys by day and night and so one should be able to lie down or sit up in it, but can do neither. It is a wheeled copy of the old torture chamber—the Maiden, in which no position restful to the human frame was possible. It is too short to lie down. You can squat, but not sit, on its wooden floor and it is just so big that you cannot wedge yourself fast, and every bump of the road hits some part of your anatomy against its various projecting ribs. The long night is misery; the day complete boredom. Progress is either snail-like or disconcertingly fast. The source of locomotion is the cooly. Some push, others pull, and every 8 or 10 miles there is a change of man-power. Up-hill they crawl: down-hill they charge full speed, jumping and singing to the terror and discomfort of the traveller. Sometimes he wakes from an uneasy sleep to find perfect peace and stillness. He has been abandoned in the jungle by his 'humans of burden' who have gone to earn tempting wages in the harvest field. Thank Heaven for the train and motor service that has relegated this abomination

MEANS OF TRAVEL IN OLD INDIA

BY

B. ABDY COLLINS, C.I.E., I.C.S.

OLD India is passing away and, before they vanish into the limbo of the past, let us take a glance at one of its most characteristic features, the quaint and curious conveyances, some ancient, some more modern, which necessity 'the mother of invention' hammered out for each locality.

Just as each God and Goddess of the Hindu pantheon had his or her *bâhan* or means of progress, Shiva his bull, Vishnu his vulture, and so on, so each province and state had its own peculiar creature or vehicle. Some are found in the highways of the tourist and are familiar to every traveller. The elephant will never disappear, because he alone can traverse the pathless swamps and jungles of northern India and Burma; but the motor has killed him as a fashionable means of locomotion. In 1904, more than 900 elephants attended the Chhatar Mela, the great Bihar elephant fair at Sonpur: now hardly a third as many are exposed for sale. Every Raja has his Rolls or Daimler and every petty landlord his Ford. The camel still persists in the drier regions where the roads are few and bumpy, and water scarce. The *ekka* and the *tonga* are far from sharing the fate of the hansom cab, but their sun is setting and everywhere the motor bus and taxi make it less easy for their picturesque and unwashed drivers to pick up a living. But these are still among the common sights of India. Let us rather direct our gaze to the rarer types, which frequent the remotest corners of the land.

Of animals I select the riding bullock of the Deccan. Small but perfectly shaped and rounded, he looks an aristocrat from his horns to his hoofs. His shining coat and mild eye proclaim his well-being. Perched on his back is a soberly clad greybeard or else a pretty child-wife clad in divers hues, gorgeous but blended

In Bergson, however, we do not encounter[1] this difficulty, for he regards intellect and instinct as 'opposite tendencies', which though 'at their origin interpenetrating each other', in the course of evolution turned towards different directions—instinct towards life and reality and intellect towards matter and appearance.[2] Thus 'they imply two radically different kinds of knowledge'. Intellect, thus, remains for Bergson from the very beginning to the end 'relative to the needs of action', the needs of action being the needs of 'a practically useful end'.

[1] But even in Bergson we find a passage which seems, in a way, to be inconsistent with this statement (which, however, rests on a view that it is constantly and explicitly emphasized by him), and to suggest that he assigns to intellect a function in intuition itself. This passage runs as follows: 'Intelligence remains the luminous nucleus, around which instinct even enlarged and purified into intuition, forms only a vague nebulosity . . . on the one hand, it (intuition) will utilize the mechanism of intelligence itself to show how intellectual moulds cease to be strictly applicable; and on the other hand, by its own work, it will suggest to us the vague feeling, if nothing more, of what must take the place of intellectual moulds . . . But . . . it is from intelligence that has come the push that has made it rise to the point it has reached' . . . (*Creative Evolution*, p. 187 ff). If the 'mechanism of intelligence' is used to 'transcend' the point of view of intelligence and arrive at that of intuition, and, again, if the 'push' of intelligence is required to develop instinct into intuition, may it not be argued that intelligence is in some sense involved in intuition and is *not* altogether opposed to it, as Bergson has been constantly telling us? Nevertheless Bergson makes it explicit in various places that it is after all intuition that does the work—i.e. grasp the reality. His position, however, is not totally free from this inconsistency. Here we are reminded of the paradoxical nature of Schopenhauer's position in this particular respect. Both depreciate the ontological value of the intellect and yet sometimes seem to give it a function in intuition itself.

[2] *Creative Evolution*, p. 267.

position of their nerve-centres one by one like the entomologist. Even if we suppose that they come to learn it by tentative experiment it is difficult to believe that 'elements so special of a knowledge so precise have been regularly transmitted one by one by heredity.'[1] But there is no need for such a view, says Bergson, if we suppose 'a sympathy' (in the etymological sense of the word) "between them and their victims which teaches them 'from within', so to say, the vulnerability of their victims? 'Certainly, a scientific theory cannot appeal to considerations of this kind. It must not put action before organization, sympathy before perception and knowledge. But once more either philosophy has nothing to see here, or its role begins where that of science ends.'[2] Here, then, Bergson finds a basis of the distinction between the 'absolute' and 'relative' knowledge. In man also, he points out, around the 'luminous nucleus' which we call the intellect there is 'a vague nebulosity'[3] wherein 'reside certain powers of which we have only an indistinct feeling.' This 'vague nebulosity' when 'enlarged and purified' is what Bergson calls 'intuition', which in default of knowledge properly so called reserved to pure intelligence . . . enables us to grasp what it is that intelligence fails to give us, and indicates the means of supplementing it." [4] Thus intuition—'the vague fringe that surrounds our distinct, i.e. our intellectual representation'—is the faculty that is fitted to solve the ultimate problems of philosophy.

It will be clear by the way in which Bergson arrives at the notion of intuition that the Bergsonian view of the 'artistic perception' has not the same paradox as that of Schopenhauer. For we know that according to Schopenhauer knowledge in the artistic perception frees itself from the principle of sufficient reason which is the general principle for all the logical forms, and gets rid of the service of the will to live and to determine the relations of things to the practical purposes of life only that it had originally arisen. In all the writings of Schopenhauer no solution of this antithesis is to be found (as there is none as to how the intellect itself arose from a dark irrational background).

[1] *Creative Evolution*, p. 182.
[2] *Ibid.*, p. 183.
[3] *Ibid.*, Introduction, p. xiii.
[4] *Ibid.*, p. 187.

To sum up: Schopenhauer and Bergson seem to agree in their theory of art in so far as they lay equal stress on the artist's power to do away with the pragmatic considerations of the intellect to remove the practically useful symbols, to take away the 'mist' ('Nebel') or the dense 'veil' and to bring us face to face with reality itself. This is accomplished according to both not by the analysis and abstraction of science, not by conceptual, discursive or relative knowledge, but by the simple, undivided, spontaneous act of intuition which stands in a diametrical opposition to all logical acts. The philosopher and the artist obtain a pure vision of the reality by means of this intuitive knowledge which alone can feel the palpitating heart of things.

In conclusion we must not forget that in spite of such a far-reaching agreement between Schopenhauer and Bergson as regards the method of artistic knowledge and the notion of intuition, it seems evident that they come to it in different ways. Schopenhauer, as we know, studied with the greatest enthusiasm the translations of Upanishads in Latin, used to call them 'die Ausgeburt der hochston menslichen weisheit' and thus was greatly impressed by the mystical *Atma-Brahman* doctrine of the Upanishads.[1] Bergson on the other hand seems to have been determined in his idea of intuition by his deep interest in the biological sciences. In the existence of *instinct* in the animal kingdom Bergson finds a knowledge that does not oppose subject to object, that is to say, a knowledge that is entirely different from what man possesses. As an example of this kind of non-intellectual knowledge Bergson refers us to the study of the 'paralysing instinct'[2] of certain wasps. The different species of Hymenoptera that have this paralysing instinct lay their eggs in spiders, beetles or caterpillars. For this purpose they sting the centres of their victims and make them motionless without causing their death and thus provide the larvæ with fresh meat. Now, argues Bergson, the Hymenoptera seem to possess as thorough a knowledge of the nervous system of their victims as an entomologist can possibly have. But they do not learn the

[1] Cf. *The Calcutta Review*, 3rd series, vol. x, 1924, pp. 3-5: Article by Prof. M. Winternitz, Ph.D., Prague, Czecho-Slovakia.

[2] *Creative Evolution*, p. 181.

The task that Bergson thus allots to Art is evidently much the same as that which was given to Metaphysics by him. For metaphysics also, according to Bergson, revolves round the possibility of a direct and pure vision of reality. As opposed to all intellectual methods intuitive knowledge is made use of here in order to grasp the reality in its essence by a 'simple art'. And this act, as we know, involves a 'break with the symbols' 'rupture avec les symbols'. It stands in opposition to all conceptual representations which multiply their points of view without end and still give us no reality. Thus the metaphysician and the artist both seem to adopt the same method to obtain a direct vision of reality; and the one condition of this kind of pure perception is, as has been fully emphasized, the brushing aside of all utilitarian symbols by means of intuition, metaphysical or æsthetic. Just like the metaphysician the artist aims to get into direct contact with the 'deep-seated reality that is veiled from us . . . by the necessities of life'. And this grip of reality is the goal of the method of intuition which is the true method of philosophy. 'At intervals a soul arises which seems to triumph . . . by dint of simplicity—the soul of an artist or a poet, which, remaining near its source, reconciles, in a harmony appreciable by the heart, terms irreconcilable by the intelligence.'[1] Thus there seems to remain no difference between the philosopher and the artist in the end.

This intimate connection between the artistic and the philosophical intuition which Bergson points out finds its parallel, as we know, in the system of Schopenhauer. We noticed above that Schopenhauer not only asserted a very close connection between art and philosophy, but in some of his earlier writings he indentified the method of the one with that of the other. As opposed to the sciences their method is intuition. The artistic perception and the philosophical knowledge of the reality is, thus, according to him, of the same nature. And the marked opposition between science and art that characterizes the philosophy of Schopenhauer is, as we have seen, an essential feature of the philosophy of Bergson also.[2]

[1] *Introduction to Metaphysics*, p. 18. [2] Cf. Höffding's *Modern Philosophers*, p. 290.

Returning to Bergson we find that a very similar attitude is adopted by him. According to him, 'Art . . . has no other object than to brush aside the utilitarian symbols, the conventional and socially accepted generalities, in short every thing that veils reality from us, in order to bring us face to face with reality itself.'[1] We come into direct contact with reality, 'enter into immediate communion with things' with the help of art. But this purity of perception to which the reality is revealed 'implies a break with utilitarian convention'[1] (une rupture avec la convention utile), a complete 'disinterestedness of sense or consciousness'. The veil that is interposed between reality and ourselves, says Bergson, becomes 'thin and transparent' to the artist; it is too 'dense and opaque' for the common herd. The intellect serving as a light to our conduct gives a 'practical simplification of reality'.. Therefore whatever alone has relation to our practical life (or in the words of Schopenhauer, whatever has a direct or indirect relation to our will to live) is apprehended; and things have been arranged and classified with a view to the use we derive from them. Thus in the ordinary man the intellect serves the utilitarian and practical purposes of life, deals with the conventional generalities, 'takes note of the most ordinary function and common place aspect of the thing'. We are such pragmatists, such hardened utilitarians, that instead of seeing the reality of things we 'usually confine ourselves to reading the labels affixed to them'. In this way the dense and opaque veil, referred to above, separates us from the true reality.[2] But art is 'a more direct vision of reality.' It is 'the inner life of the things that the artist sees through the forms and colours'.[3] He thus perceives 'all things in their native purity'.[4] He transcends all the utilitarian conventions, turns his attention from that aspect of the world that has a practical interest and is free from the narrowing habits of the pragmatic life.

[1] *Laughter* (English Translation), p. 157.

[2] Cf. Schopenhauer's *Die Welt as Wille and Vorstellung*, vol. ii, pp. 476-77, where a similar idea is expressed in a similar language: 'Jedes Kunstwerk ist dem Gemass eigentlich bemuht, uns das Leben und die Dinge so zu zeigen, wie sie in Warheit sind, aber, durch der *Nebel* und Subjektiver zufalligkeiten hindurch, nicht vom jeden unmittelbar erfasst konnen. Diesen Nebel nimmt die kunst hinweg.'

[3] *Laughter*, p. 157.

[4] *Ibid.*, p. 155.

trace the sphere of pragmatic utility and narrowness and to put us face to face with the reality itself. Art is thus a more direct vision of reality and therefore stands in a diametrical opposition to the analysis and abstraction of science which are merely practical and utilitarian devices and tend to veil the true reality from our view. In this way we find that according to Bergson there is a close relationship between the methods of philosophy, as we noticed in Schopenhauer.

Schopenhauer maintains that the artist's perception of the reality is possible only when there are no pragmatic consideration. We can apprehend the purely objective nature of things, he observes, 'when we have ourselves no interest in them'. The absolute condition of artistic knowledge is 'the complete silence of the will'. When knowledge is thoroughly 'purified from all will and its relation', that is to say, from all the utilitarian and pragmatic relations then only it comes into direct touch with the true reality. Again and again he emphasizes that this knowledge 'does not proceed from intention or choice', is 'entirely independent of the will'; it is 'pure will-less knowledge'. The needs of action constrain us to narrow our field of vision; and scientific knowledge, whose function is to know the relations of things to one another in order to guide us in our actions, is purely pragmatic in its nature and procedure and thus affords only relative knowledge. But action in the pragmatist sense is the enemy of vision. The artist's faculty which perceives the reality is independent of that action may be detached from it. The intellect loosened from will grasps the very essence of things. Thus the artist, leaving behind all utilitarian and practical considerations for 'bunglers' or the common herd, whose intellect is always 'too firmly bound to the will, only becomes active when spurred on by it and therefore remains entirely in its service'[1] approaches a direct vision of the reality. The more disinterested he is, the more able he is to see reality in its purity; and in such moments of disinterestedness, he remarks, 'the souls of immortal works are begotten'.

[1] Haldane and Kemp, vol iii, p. 148.

enables us to penetrate nature's outward shell and enter into the true inwardness of its life by first grasping the reality in its purity in our own inner self.

III

This sharing of the inner life of the reality which we aspire to grasp is also explained by Bergson (as by Schopenhauer) by reference to the 'artistic perception'. Schopenhauer indentifies the artistic way of knowledge with the metaphysical way of knowledge. Bergson makes the identical comparison between metaphysical and æsthetic intuition. Referring to 'intuition' he says: 'That an effort of this kind is not impossible, is proved by the existence in man of an æsthetic faculty along with normal perception. Our eye perceives the features of the living being, merely as assembled, not as naturally organized. The intention of life, the simple movement that runs through the lines, that binds them together and gives them significance, escapes it. This intention is just what the artist tries to regain, in placing himself back within the object by a kind of sympathy, in breaking down, by an effort of intuition, the barrier that space puts up between him and his model.' [1] And like Schopenhauer Bergson compares the philosopher, in more than one place, especially in his introduction to Metaphysics, with the artist or the poet. Neither of them employs scientific analysis or abstraction; their common method is intuition. This leads us to inquire more closely into the affinities of Bergson's conceptions with those of Schopenhauer as far as the theory of art is concerned.

We have so far seen that Bergson agrees with Schopenhauer in the intuitive method of apprehending reality. The philosophy of both these thinkers seems then, to belong to the same type of thought which we may call 'intuitive'. In the realm of the theory of Art we once more find a great and far-reaching resemblance between their fundamental views. Here I venture to draw attention to one or two points which are very essential to the present enquiry. The object of Art according to both is to

[1] *Creative Evolution*, pp. 186-87.

mit jenem, die er, je nachdem der Grad seines Nachdenkens ist, weiter durchführt.' [1]

With Bergson also the procedure seems to be very similar. 'The consciousness we have of our own self,' he writes, 'introduces us to the interior of a reality on the model of which we must represent other realities.'[2] Intuiting of our own selves (or in the words of Bergson, sympathizing with our own selves) we come to possess the key to the knowledge of inner reality of phenomena in general. The coincidence with the reality external to ourselves by means of intuition, then, is attained through ascribing to it the same reality that we experience within us in the most direct immediate intuitive way. It is only in this way that we can 'transport' ourselves into the 'interior of the things'; for the reality that expresses itself in the whole of nature, seems according to both Schopenhauer and Bergson to be precisely the same that we find in our own selves, as for them both it is grasped in precisely the same manner.[3] Thus Bergson's statement that intuitive knowledge implies a 'coincidence of the mind with the generative act of reality' must be understood in the light of Schopenhauer's 'intuitive knowledge' and this as we have seen

[1] Gresbuch Edit. Vol. ii, 319, 377, 350; i, 157.

[2] *Introduction to Metaphysics*, p. 55 (*underlining* mine).

[3] The way of grasping the reality being thus according to Schopenhauer and Bergson precisely the same, one is led to postulate that the reality itself which is thus revealed has, according to both, a like nature—that is to say, Schopenhauer's *Will* and Bergson's *Elan vital* are one and the same. And indeed Prof. Th. Reuyssen has be n able to draw a parallel between the will of Schopenhauer and the Bergsonian elan vital successfully. [Cf. Schopenhauer by Th. Reuyssen (Paris, Felix Alcan, 1911), p. 376 ff]. Mr. Douglas Fawcett also seems to maintain the kindred nature of the will and the elan when he says that 'waht is labelled by Schopenhauer as the will is just the same giant psychical life that Prof. Carr describes (in connection with Bergson) as "the magnificent *elan vital* into which the whole existence is gathered together and whose immense poussee has evolved innumerable lives".' (*Mind*, *N. S.*, vol. xxi.) But in one important respect there seems to be an antithetical opposition between the ideas of Schopenhauer and Bergson as regards the nature of reality. Schopenhauer considers the reality disclosed to us by the metaphysical glance as *timeless* and for Bergson it is duree reelle, true duration, real time. And all the mystics of the past ages agreed with Schopenhauer in regarding the Absolute Reality as *timeless*. Towards the solution of this difficulty it may be suggested that when Schopenhauer conceived the reality as timeless he naturally understood by time what is commonly understood by it—i.e. *spatialized time*, time as it is conceived by the scientist, and to this Schopenhauer denied all reality and asserted that the Absolute is timeless, meaning thereby that it is free from all spatial conceptions, free from past and future, which notions, as Bergson has shown us, can only be introduced when we *spatialize* time, Schopenhauer, therefore, in regarding the reality as timeless, was only freeing it from *spatialized* time (as does Bergson) and he had no idea of the true nature of time which Bergson has given us. (Cf. G. Rostrevor's *Bergson and Future Philosophy*, pp. 131-37, where he supports Bergson's conception of reality as in time in opposition to the mystic's account of Reality as timeless).

in which we know nothing else. If, then, anywhere there is possibility of our having a view of reality in its purity, it will be in the inward view that we may obtain of our own body. This inward glance reveals to us, according to Bergson as well as Schopenhauer, the actual reality of existence itself. Here we get an intuition of reality, that is to say, not a perception or conception of it as an object, but a consciousness that has freed itself from all the logical forms so much so that even the relation of subject and object is removed. 'We are laid asleep in body, and become a living soul' feeling ourselves at one with

> "A motion and a spirit that impels
> All thinking things, all objects of all thoughts,
> And rolls through all things."

Thus the notion of the intuition of our own inner life as the reality is found in the system of Schopenhaner and Bergson alike. Both agree in the view that in the intuition of the self by the self we are in actual absolute contact with reality itself. And as we have seen, Schopenhauer calls this 'intuitive Selbsterfassung' a key to the understanding of the whole of the phenomenal world —it leads to the 'intuitive Welterfassung'. 'Selbstbewusstsein' in the words of Schopenhauer becomes the 'Ausleger der Bewusstsein andrer Dinge.'[1] And he contends that for him who has come to know the reality in his own self-consciousness it becomes the key to the knowledge of the inmost essence of entire nature. For knowing the reality in itself immediately in his own inner life he will then transfer this immediate experience to the rest of the objects of nature which are not given to him in such immediate experience. In this way he will obtain this new knowledge which is really suggested to him from 'the inner knowledge' ('von inner erhaltene Erkenntniss') that the true reality in the whole of nature is just what is revealed to him in his own self or inner life. 'Jeder erkennt nur ein Wesen ganz unmittelbar: seinen eigenen Willen in Selbstbewusstsein. Alles andere erkennt er bloss mittelbar und beurteilt es dann nach der Analogie

[1] G. iv, 115.

metaphysics and the knowledge that it imparts installs itself in the objects and 'adopts the very life of things'.

Is there any experience in which we are aware of the reality in this way 'from within' and not 'from without?' We seem to get some light from Schopenhauer's doctrine of intuition. For, as we know, Schopenhauer pointed out that we possess 'the most direct knowledge'—'knowledge from within'—of our own selves and there we grasp the actual reality of existence itself. To be more explicit, he says that we know our own body in two extremely different ways: it is given as an object among objects and subject to the laws of other objects: but it is also given in quite a different manner, as we know it from within most intuitively and immediately, and what we know thus is our inner self which is undivided, absolute, 'One and All'. This 'intuitive Selbsterfassung' is thus the knowledge of the essence and reality of all phenomena. About this immediate ('ganz unmittelbar') knowledge, Schopenhauer has said that it is a knowledge of a unique kind which as if by treachery places us at once within the fortress which it was impossible to take 'from without'—that is to say, that which we cannot grasp by means of concepts is known to us by the immediate intuitive feeling. Now in the same light may be understood the method of knowing the reality advocated by Bergson. 'There is one reality, at least' he says, 'which we all seize from within, by intuition and not by analysis'[1] and this is the reality which expresses itself in us, i.e. our own self. 'We may sympathize intellectually with nothing else but we certainly sympathize with ourselves.' Prof. Weldon Carr in his exposition of Bergson's doctrine of intuition[2] makes it clear by referring to the two entirely different ways of knowledge that we have of our own body. In the consciousness of the external world that we have, there is, as Schopenhauer maintained above, a particular object that we know in a way in which we know nothing else, and that is our own body. We have a knowledge of it as an external object, like any other object that forms a part of the external world but we know it also in an intimate and immediate manner,

[1] *Introduction to Metaphysics*, p. 8.
[2] *Philosophy of Change*, pp. 26-27.

the light of Schopenhauer's 'intuitive Selbsterfassung' which leads us to the 'intuitive Welterfassung'. In what follows I shall, then, try to show that both Schopenhauer and Bergson adopt precisely the same way of knowing the 'Absolute' and this they call 'intuition' or the way 'from within'.

In spite of the insuperable difficulty of conveying a definite notion of 'intuition' Bergson has tried, time and again, to render it as clear as possible. In what is now considered as a *locus classicus* he says: 'by intuition is meant the kind of intellectual sympathy by which one places oneself within an object to coincide with what is unique in it and consequently inexpressible'[1] (in concepts). In opposition to this 'analysis' is defined as 'the operation which reduces the object to elements already known, that is, to elements common to it and other objects'. In several different passages Bergson describes intuition in different terms but conveying the same idea as a process of 'transporting oneself' ('se transporter') or 'replacing oneself' ('se replacer par un effort d'intuition') or 'inserting oneself into' ('s'inserer dans le . . . par un effort d'intuition a l'interieur de cette realite concrete') 'the interior of the concrete reality'. Intuition understood in this sense is according to Bergson the proper vehicle of real knowledge. To live with the absolute reality ('Miterleben') of the thing, to insert oneself into it, is what metaphysical knowledge teaches us. In this coincidence with what is absolute or unique in the object 'points of view' disappear, as the object is known in its perfection and absoluteness. In intuition then the reality is known in its essence, whilst in analysis or symbolical expression the simplicity of intuitive act is shattered and points of view become important: knowledge no more remains 'absolute' but becomes 'relative'. It was for this reason that scientific knowledge was depreciated above. The task of metaphysics has been shown 'to get as near to the original itself as possible', 'to search into its life' and, as it were 'to feel the throbbings of its soul'.[2] This is true empiricism and true

[1] *Introduction to Metaphysics*, p. 6, of the original wordings : 'on appelle intuition cette espece de sympathie intellectuelle par laquelle on se transporte a l'interieur d'un object pour coincider avec ce quill a d'unique et par consequent d'inexprimable.'

[2] *Introduction to Metaphysics*, p. 31.

II.

Bergson has hinted innumerable times at this 'act of intuition' or 'communication sympathique' or 'espece de sympathie' which rends the veil and reaches the shrine, which 'possesses the reality absolutely', but he has not been able to explain it. It is not a logical way of knowledge and evidently by its very nature it is not explicable, for to explain means to analyse, to define, and analysis and definition are, according to Bergson, 'symbolical' and his metaphysics 'claims to dispense with symbols.'[1] This is, therefore, the main difficulty in the way of Bergson (as we have seen it in the way of Schopenhauer also) which prevents him from giving a clear account of the simple and spontaneous act of intuition that enables the philosopher to penetrate to the very depths of reality and like the artist or the poet, 'quaff the live current'. Accordingly Prof. Höffding points out that 'while Bergson's *psychological intuition* (i.e. immediate perception) is of decisive importance . . . he has not given a perfectly clear definition of *metaphysical intuition*, though he affirms its possibility, and he has not determined its philosophical character.'[2] Professor James suggests in a passage in *A Pluralistic Universe* that Bergson's intuition is nothing but the immediate perception of the concrete reality.—'diving back into the flux' of things, 'turning the face towards sensation, that flesh-bound thing which rationalism has ways loaded with abuse.'[3] Bergson's psychological intuition is the same experience that James calls 'Knowledge of acquaintance', and this is opposed by James to what he terms 'Knowledge about' or conceptual knowledge which is mere 'translation' into 'discontinuous' and 'static' or 'rigid' symbols. There is, no doubt, a great similarity in the views of Bergson and James as regards the nature and function of concepts and their relation to percepts, but what Bergson means by 'metaphysical intuition' must not be identified with what he (Bergson) intends by 'psychological intuition'. The best way to understand Bergson's metaphysical intuition is to interpret it in

[1] *Introduction to Metaphysics*, p. 8.
[2] Hoffding's *Modern Philosophers and Lectures on Bergson*, p. 259.
[3] *A Pluralistic Universe*, p. 252.

THE INFLUENCE OF SCHOPENHAUER'S DOCTRINE OF INTUITION ON THE PHILOSOPHY OF BERGSON

By Dr. WALIUDDIN

Department of Philosophy, Osmania University College

(A paper read before the Indian Philosophical Congress held at Dacca, December 1930).

BERGSON appears to follow Schopenhauer closely when he points out that there are 'two profoundly different ways of knowing a thing. The first implies that we move round the object: the second that we enter into it. The first depends on the point of view at which we are placed and on the symbols by which we express ourselves. The second neither depends on a point of view nor relies on any symbol. The first kind of knowledge may be said to stop at the relative; the second in those cases where it is possible to attain the absolute.'[1] The two ways, as we know, are the *rational way of knowledge* which is made use of by science and the *intuitive way of knowledge* which is the proper method of philosophy. The same opposition was also maintained by Schopenhauer between 'the relative' and 'the absolute' ways of knowledge. And, just as Schopenhauer tries to establish the validity of intuitive knowledge by pointing out the inadequacy of scientific knowledge to grasp the inner nature of the phenomena, Bergson also endeavours to point out that conceptual knowledge which the sciences make use of, is incapable of knowing the reality of the things. In this way, then, for Bergson as for Schopenhauer, philosophy begins in an 'intuition' that turns the mind aside from the ready-framed concepts to place itself in the very heart of reality which is the life and essence of all things. We shall try to understand more closely the exact nature of Bergson's 'intuitive method' and its affinity with that of Schopenhauer.

[1] *Introduction to Metaphysics*, p. 1.